گلِ قُریش

میں بھلا کون ہوں

شازیہ چوہدری

یہ دل بہت اداس ہے

انجم انصار

نہ عزیز داری....

نہ ہم عمر......!

نہ ہی دوبدو ملاقاتیں۔

اور نہ ہی کوئی غیر معمولی دوستی۔

مگر جب بھی اس کا خط آتا تو مجھے اچھا لگتا۔

اور جب فون آتا تو قہقہوں سے بات شروع ہوتی اور قہقہوں پر اختتام ہوتا۔

"انجم باجی، یہ میرے افسانے پر جو پینسلوں سے کاٹم کاٹی لگی ہوئی ہے، یہ سب تیمور نے کیا ہے۔"

"آپ مجھے مشورہ دیں ناں، پبلشرز سے کیسے ڈیلنگ کی جائے، یہ لوگ تو کچھ دیتے ہی نہیں ہیں۔

"عظمیٰ آئی ہوئی ہے، تو بات کروائیں......!"

ایسے بھاری بھرکم موضوعات پر افسانے لکھنے والی لڑکی عام بول چال میں بالکل سمپل سی تھی۔

چہکتی ہوئی آواز، کھنکتا ہوا لہجہ.....مگر عزائم پہاڑوں سے بھی اونچے......!

ہم لکھنے والوں کو دیگر لوگوں کے مقابلے میں رائٹرز سے بات چیت کر کے زیادہ لطف آتا ہے، یہی وجہ تھی کہ اس چھوٹی سی پیاری سی بچی سے میں ڈھیروں باتیں کرتی۔ مگر باتوں کا ایسا سلسلہ، آسودگی کا ایسا احساس مجھے ہر رائٹر کے ساتھ ہی محسوس ہوتا ہے۔

اس کی زندگی میں تو مجھے یہ کبھی خیال ہی نہیں آیا تھا کہ وہ تو میرے دل میں رہتی ہے۔

اس کے حادثے کی خبر نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔

نہ مجھے نیند آ رہی تھی اور نہ ہی کوئی بھوک پیاس۔

میں اس کی صحت اور زندگی کے لیے پل پل دعائیں مانگ رہی تھی اور آنسوؤں کے سوتے کسی صورت خشک نہیں ہو رہے تھے۔

اور جب اس کے انتقال کی خبر ملی تو مجھے یوں لگا کہ جیسے میں زلزلوں کی زد میں ہوں۔

دماغ شائیں شائیں کر رہا تھا۔ یہ قلم کا رشتہ کتنا گہرا ہوتا ہے، یقیناً قلم کی روشنائی خون میں شامل ہو جاتی ہے، جب ہی تو مجھے یوں لگ رہا تھا کہ میرا کوئی بے حد قریبی عزیز مجھ سے جدا ہو گیا ہے۔

اس سے نہ ملنے کے باوجود اس کا معصوم سا چہرہ میری نظروں کے سامنے تھا۔

یہ قلم کے رشتے تو خونی رشتوں کے مساوی ہو گئے ہیں کہ ایسا دکھ جو خون میں شامل ہو کر شریانوں کے ساتھ بہہ رہا ہو۔

شاذ یہ صرف میرے دل میں ہی نہیں، بلکہ ہر اس دل میں تھی (اور ہے) جو اس کی تحریریں باقاعدگی سے پڑھتے ہیں۔

یہ دکھ، یہ احساس صرف میرا ہی نہیں تھا، بلکہ ہر لکھاری اور ہر قاری کا تھا۔

ہر لڑکی، ہر خاتون...... پاکیزہ پڑھنے کے بعد چیخیں مارتے ہوئے مجھے فون کر رہی تھیں۔

انجم باجی...... ہماری شازیہ چلی گئی۔

انجم باجی...... شازیہ ہمیں چھوڑ کر چلی گئی اور سسکیاں کسی صورت میں نہیں رک رہی تھیں۔

عائشہ خالد (مستقل تبصرہ نگار) نے تو یہاں تک کہہ دیا، کاش! شازیہ کے بجائے میں اللہ کے پاس چلی جاتی۔ اور میں از خود بکھری بکھری سی ان کو ناکام سا دلاسا دے رہی تھی۔

وہ بچیاں جو بہنوں کی محفل میں اس بات پر خفا ہو جاتی ہیں کہ ہمارا نام کیوں نہیں شائع کیا یا ہمارے شہر یا گاؤں کا نام غلط کیوں لکھا۔ وہ نہ اپنا نام بتا رہی تھیں اور نہ ہی شہر کا نام...... وہ تو بس میری آواز سن کر رو رہی تھیں کہ سب کے احساسات بالکل ایک جیسے تھے۔ یہ سب کا اپنا غم تھا۔

اس ماہ میرے پاس لاتعداد ٹیلی فونز آئے جو شازیہ کے لیے سسک رہے تھے اور بلا مبالغہ بے شمار خطوط آئے جن کے خطوط کی ہر سطر اشک بار ہے۔

شازیہ چوہدری کے انتقال سے جتنا صدمہ مجھے ہوا ہے، وہ میں تحریری طور پر بیان کرنے کی سکت نہیں رکھتی ہوں۔ مگر میں اتنی بیمار ہو گئی کہ چند دن تو میں فون تک ریسیو نہ کر سکی۔

ابھی تک سلمٰی بشیر ناراض ہیں کہ باجی نے دو جملے بول کر فون رکھ دیا۔

قیصرہ حیات حیران ہونے کے ساتھ ساتھ کچھ ناراض بھی ہیں کہ باجی کو تین دفعہ فون کیا، اور انہوں نے بات نہیں کی۔ زبیدہ خاتون کو بھی یہی گلہ ہے۔

شمسہ الماس کا ناروے سے فون آیا تو اس نے پہلی بات یہی کی، انجم باجی کیا آپ بیمار ہیں۔ آپ سے بولا تک نہیں جا رہا ہے۔

شمسہ، ہماری شازیہ چلی گئی۔ تب میرا لہجہ گلوگیر ہو گیا۔

طلعت جبیں نیاز ہماری ایک نئی رائٹر ہیں۔ انہوں نے جب یہ نیوز پاکیزہ میں پڑھی تو ساری رات نہیں سو سکیں۔ صبح ان کے شوہر نے کہا، طلعت تم انجم باجی کو فون کر لو تم اپنا غم ان سے شیئر کرو گی تو تمہاری طبیعت ہلکی ہو جائے گی۔

دلشاد نسیم کا لاہور سے فون آیا تو وہ بے انتہا پریشان تھی اور اس کا لہجہ اس قدر افسردہ تھا کہ جیسے اس کا بہت بڑا نقصان ہوا ہو۔ ہم دونوں دیر تک شازیہ کی ہی باتیں کرتے رہے۔

سیما مناف کا حراساں سے لہجے میں فون آیا۔ انجم میں تو اپنے سسرال کی شادی میں مصروف تھی۔ بہت تاخیر سے مجھے پتا چلا مگر دل دکھ سے بھر گیا ہے۔ کچھ اچھا نہیں لگ رہا۔ میں بلڈ پریشر کی مریضہ ہوں۔ میرے بچے نے مجھے دوا کھلائی ہے۔

تسنیم اُلم جو ان دنوں اپنی والدہ کے انتقال کی وجہ سے غم زدہ سی ہیں وہ پاکیزہ پڑھتے ہی فون پر دکھے ہوئے لہجے میں کہتی ہیں، یار، بہت افسوس ہوا، اتنی اچھی رائٹر اتنی جلدی چلی گئی۔

میں نے نصرت پروین (مستقل تبصرہ نگار، لانڈھی) کو فون کیا کہ اپنے دارالعلوم میں شازیہ کے لیے قرآن خوانی کروا دو۔ تب نصرت گلوگیر لہجے میں بولی۔ باجی، میں پانچ قرآن پاک تو پڑھوا چکی ہوں۔ حافظ بچے ہر نماز کے بعد شازیہ چوہدری کے لیے خصوصی دعا کرتے ہیں۔

رخ چوہدری نے بتایا کہ ان کی کسی فیملی فرینڈ نے پندرہ قرآن پاک پڑھ کر بخشے ہیں۔

ناہید بنت نور ان دنوں بیمار ہیں، مگر پھر بھی ایک قرآن پاک پڑھ کر بخشا ہے۔ اسی طرح روزانہ میرے پاس درجنوں فون آ رہے ہیں۔

نہ دکھاوا، نہ شوبازی، نہ احسان، نہ توقع۔

بس سچی محبت، دلی لگاؤ، ایک گہری قربت، جس نے سب کو ایک محبت کی ڈور سے باندھا ہوا ہے اور ہر کوئی اس کو اپنا دکھ اور اپنا غم سمجھ رہا ہے۔

شازیہ چوہدری کو ماہنامہ پاکیزہ سے اس قدر لگاؤ تھا کہ انتقال سے ایک شب پہلے پاکیزہ کے لیے ایک افسانہ بعنوان۔ ''ہر ذرہ امید سے خوشبو نکل آئے'' لکھنا شروع کر دیا تھا مگر صرف ایک صفحہ ہی لکھ سکی۔ یہ اس کی زندگی کی آخری سطریں ہیں، جس کا منظر نامہ مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ جیسے وہ جنت کا نقشہ کھینچ رہی ہو۔

اللہ تعالیٰ اسے جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور ہم سب کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین!

آئیے پہلے شازیہ کے والد کے تاثرات پڑھتے ہیں، جو انہوں نے اپنی لاڈلی بیٹی کے لیے بیان کیے ہیں۔

میری پیاری بیٹی

ڈاکٹر آفتاب (والد)

شازیہ چوہدری ہمارے خاندان میں پہلی اولاد تھی۔ میرے والد صاحب اپنے بھائیوں میں سب سے بڑے بھائی تھے اور میں اپنے دونوں بھائیوں اور چچازاد بھائیوں سے بڑا بھائی۔ میری شادی میری خالہ زاد سے اس وقت ہوئی جب میں تھرڈ ایئر بی۔ ایس۔ سی کا اسٹوڈنٹ تھا۔ بی۔ ایس۔ سی کے بعد ایم۔ ایس۔ سی کیا۔ ایم۔ ایس۔ سی کے پہلے سال ہی شازیہ پیدا ہوئی۔ بچی کا نام میں نے خود رکھا اور اپنے نام کی نسبت سے شازیہ چوہدری رکھا۔ یہ اپنی نوعیت کا انوکھا اور پہلا نام تھا گاؤں کی سوسائٹی میں کہ کسی بچی کا نام والد کے فیملی نام سے رکھنا اور لڑکی کا نام چوہدری رکھنا۔ بہرحال میں نے یہی لکھوایا اور یہی نام رہا آخر تک۔ شادی کے بعد بھی اس نے اس کو تبدیل نہیں کیا۔ ہمارے خاندان کے اکثر بزرگ حضرات اس پر اعتراض کرتے تھے کہ لڑکی کے نام کے ساتھ چوہدری کیوں رکھا ہے۔ ایسا تو کبھی نہیں ہوا۔ لوگ کیا کہیں گے مگر میں نے کسی کی نہ سنی اور یہی نام رکھا۔ رفتہ رفتہ لوگ اس نام کے عادی ہوتے گئے۔ شازیہ چونکہ پہلی اولاد تھی اس لیے اس کو ہر وقت کوئی نہ کوئی اٹھائے رکھتا۔

گاؤں کی اس وقت کی زندگی میں یہ بہت بڑی تبدیلی تھی جو میں نے کی کہ اپنی بچی کو گلیوں میں اور رشتے داروں کے ہاں اٹھائے لیے پھرتا۔ اس وقت کے گاؤں میں یہ بہت بڑی معیوب بات تھی کہ باپ اپنے بچوں کو یوں گلی میں اٹھائے پھرے (جو لوگ گاؤں میں نہیں رہے کبھی ان کے لیے یہ سمجھنا خاصا مشکل ہے) میں سب کو یہی جواب دیتا کہ میری بچی ہے، میں تو اٹھاؤں گا۔

شازیہ نے سب خاندان سے بہت پیار لیا۔ ہر ایک کی خواہش ہوتی کہ میں اٹھاؤں اور کئی لوگ اس کو اپنے گھر لے جاتے اور ہمیں پتا بھی نہ ہوتا کہ کس کے پاس ہے پھر ڈھونڈ ڈھانڈ کے گھر لاتے۔ شازیہ تھی ہی بہت پیاری۔ جو بھی دیکھتا اپنا ہو یا پرایا سب اس کو اٹھا لیتے اور خوب پیار کرتے۔ ایم۔ ایس۔ سی کے بعد میں جاب کے سلسلے میں اسلام آباد آ گیا اور پھر بعد میں بچوں کو بھی شفٹ کر لیا۔ شازیہ اس وقت چھوٹی سی تھی پھر اس نے نرسری سے اپنی تعلیم کا آغاز کیا۔ اسلام آباد میں پنسٹک (Pinstech) ماڈل اسکول سے اس نے تعلیم کا آغاز کیا۔

شازیہ چوہدری کلاس 2 میں تھی کہ میں پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے انگلینڈ چلا گیا اور اس کو واپس گاؤں آنا پڑا اور شازیہ نے گاؤں کے پرائمری سکول 44/12-L میں داخلہ لے لیا۔ جب میں پی، ایچ، ڈی کر کے واپس آیا تو شازیہ ساتویں کلاس میں تھی اور پانچویں کے بعد وہ قریبی گاؤں چک نمبر 45/12-L کے ہائی سکول میں پڑھتی رہی۔ ساتویں میں میں بچوں کو پھر اسلام آباد لے آیا اور شازیہ دوبارہ پنسٹک ماڈل اسکول میں ساتویں جماعت میں داخل کروا دی گئی۔ گاؤں کے اسکول میں شازیہ نے کبھی کسی کو ٹاپ نہیں کرنے دیا تھا۔ ہر کلاس میں فرسٹ پوزیشن لیتی۔ یہاں آ کے بھی اس نے وہی ریکارڈ قائم رکھا۔ ہمیشہ فرسٹ آتی رہی۔ یہاں سے میٹرک کرنے کے بعد اس نے فیڈرل گورنمنٹ کالج فار ویمن F-7/2 اسلام آباد میں داخلہ لیا۔

میٹرک میں اس کی بورڈ میں چھٹی پوزیشن تھی۔ اسی کالج سے اس نے ایف۔ ایس۔ سی کیا پھر بی ایس سی کیا اور پھر ایم ایس سی (اپلائیڈ سائیکالوجی) کیا۔

یہاں وہ کالج کے مجلے کی مدیرہ بھی رہی۔ اپنے ادبی فن کا آغاز اس نے اسی کالج سے کیا۔ بی۔ ایس۔ سی میں نویسی میں حصہ لیا اور اوّل انعام حاصل کیا۔ اس مقابلے میں ایک اخبار سے متعلق لوگ بھی تھے۔ جنھوں نے اس کا مقالہ اخبار میں شائع کیا اور انہی کی ترغیب پر شازیہ نے اخبار میں لکھنا شروع کیا پھر اس نے بی۔ ایس۔ سی کے بعد کچھ عرصے کے لیے اخبار میں بطور سب ایڈیٹر بھی کام کیا، وہاں اسے اس کی بہت اچھی دوست ثمینہ عزیز ملی، جس نے قدم قدم پر شازیہ کا ساتھ دیا۔ ان دونوں کی دوستی کی وجہ سے دونوں خاندان بھی دوست بن گئے۔

اسی دوران شازیہ کو میں نے ترغیب دی کہ ہومیو پیتھک کا کورس بھی کر لو ساتھ ساتھ اور اس نے وہ بھی چار سال میں مکمل کر لیا۔ جب ایم۔ ایس۔ سی میں ایڈمشن لیا تو اخبار کو چھوڑنا پڑا۔ اسی دوران اس نے خواتین ڈائجسٹ اور پاکیزہ میں لکھنا شروع کیا اور آہستہ آہستہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر صرف سلسلہ وار ناول لکھنا شروع کیے پھر ایک وقت آیا کہ بیک وقت خواتین، پاکیزہ، کرن اور شعاع میں لکھنا شروع کیا اور ہر طرف سے داد پائی۔ جب اسے کسی ڈائجسٹ کی طرف سے یا کسی اور طرف سے اچھی کارکردگی پر کوئی ایوارڈ ملتا تو سب سے پہلے مجھے دکھاتی۔ کہتی، ابو یہ دیکھیں، مجھے بیسٹ رائٹر کا ایوارڈ ملا ہے۔ تو میں اسے کہتا یہ کون سی بڑی بات ہے، یہ تو وہ سب کو ہی دے دیتے ہیں تاکہ تم ان کے لیے لکھتے رہو، تو وہ کہتی ابو ایسا تھوڑا ہی ہے۔ یہ صرف مجھے ملا ہے۔ تو میں کہتا اچھا چلو ٹھیک ہے۔

اصل میں بات یہ ہے کہ میری فیملی پر خدا تعالیٰ کی خاص نظر کرم تھی...... اور ہے۔ ہر بچہ اپنی کلاس میں ہمیشہ اوّل آتا تھا۔ ہر کلاس میں فرسٹ ڈویژن اور کلاس میں اوّل آنا یہ معمول کی بات تھی۔ اس لیے بچوں کا انعام لینا یا شازیہ کا ایوارڈ لینا ہمارے لیے کوئی خاص بات نہ تھی۔ بلکہ خاص بات اس وقت ہوتی جب کسی کے نمبر توقع سے تھوڑا کم ہوتے۔

ایم۔ ایس۔ سی کے بعد اس نے ایک آدھ انگلش میڈیم اسکولوں میں پڑھایا لیکن لکھنے کے کام کی مصروفیت کی وجہ سے وہ ملازمت بھی چھوڑ دی اور اپنی ساری توجہ صرف لکھنے پر مرکوز کر دی۔ پھر اس کی شادی ہو گئی اور شادی کے بعد بھی اس نے لکھنے کا کام جاری رکھا۔ شادی کے سال بعد اس کے ہاں تیمور پیدا ہوا اور پھر عروشہ اس کے ڈیڑھ سال بعد۔ عروشہ شروع ہی سے ہمارے پاس رہتی تھی۔ کیونکہ شازیہ کے لیے دو چھوٹے بچوں کو سنبھالنا مشکل تھا۔ لہٰذا دن بھر عروشہ ہمارے ہاں رہتی اور رات کو اسے لے جاتی۔ اور جب قسط لکھنی ہوتی اور تیمور اسے لکھنے نہ دیتا تھا تو وہ اسے بھی ہمارے پاس چھوڑ جاتی یا کبھی کبھی تیمور کی دادی کے پاس چھوڑ آتی۔ اکثر قسط لیٹ ہو جاتی تو ہمارے ہاں ہی ٹیلی فون آتا کہ قسط نہیں پہنچی، تو میں اسے ڈانٹتا کہ وقت پر کیوں نہیں لکھتی ہو، پھر وہ لکھتی اور دوسرے دن اپنی ماں کو دے جاتی۔ ابو سے کہنا صبح ارجنٹ میل سے بھجوا دیں۔

شروع شروع میں جب اس نے لکھنا شروع کیا تو مجھے کہتی، ابو ذرا اس کو دیکھیں، ٹھیک ہے ناں۔ ایک دو بار تو میں نے دیکھا پھر اس کے بعد کبھی اس کی کوئی کہانی یا کوئی قسط نہیں پڑھی۔ اس کی اردو بہت اچھی تھی۔ قدرت کے مناظر اور ماحول کشی بہت زبردست ہوتی تھی۔ میں اسے کہتا کہ مجھ سے بھاری بھرکم الفاظ نہیں پڑھے جاتے۔ میں ایک سائنس دان ہوں اور میں آسان الفاظ میں اپنا مدعا بیان کرتا ہوں۔ مجھ سے اس کی کوئی کہانی نہیں پڑھی گئی۔ ابھی اس کے دو ناول چھپے ہوئے میرے سامنے پڑے ہیں۔ "شہر دل کے دروازے" اور "نکھر گئے ہیں گلاب سارے" مگر میں ان کا ایک صفحہ بھی نہیں پڑھ سکا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے سب سے پہلے مزاحیہ کہانیوں سے لکھنا شروع کیا اور پھر کچھ مزاحیہ شاعری بھی کی۔ جو ایک آدھ نظم کے علاوہ کبھی کہیں نہیں چھپی۔ صرف میری ڈائرئی تک ہی محدود ہے پھر بعد میں کچھ سنجیدہ شاعری بھی کی مگر رومانوی ناول کبھی نہیں پڑھ سکا۔ دو چار صفحوں کے بعد بند کر دیتا تھا۔ تاریخی، جاسوسی اور سائنس فکشن میرے پسندیدہ تھے۔

لوگ پوچھتے ہیں کہ شازیہ چوہدری لکھنے لکھانے کی طرف کیسے آئی۔ وہ تو میڈیکل کی اسٹوڈنٹ تھی اور پھر ہومیو پیتھک ڈاکٹری کا کورس بھی اس نے پاس کیا تھا تو یہ رائٹر کیسے بنی۔ ویسے تو جو بھی ذہن کو استعمال کرے، کچھ نہ کچھ بن جاتا ہے لیکن ماحول گھر کا اور کالج، اسکول کا بہت زیادہ اثر انداز ہوتا ہے کسی کی شخصیت کے نکھرنے میں۔ شازیہ پہلی کلاس میں تھی جب وہ پڑھنے کے قابل ہوئی تو میں جمعے کے جمعے اس کو ایک روپے کی چار چھوٹی چھوٹی کہانیاں لا کر دیتا اور اس کو پڑھاتا پھر وہ خود پڑھنے کے قابل ہوئی تو فرمائش بھی کر دیتی کہانیوں کے لیے پھر جب گاؤں چلی گئی میرے باہر جانے کے بعد تو پھر اپنے دادا ابو سے فرمائش کرتی۔ وہ جب بھی شہر جاتے اس کے لیے کہانیاں ضرور لاتے۔ جب ہم اسلام آباد دوبارہ آ گئے تو پھر نونہال، تعلیم و تربیت رسالے لگوا لیے۔ میٹرک میں اس نے اسکول کی لائبریری سے بکس لے کر پڑھنی شروع کر دیں۔ مجھے بھی جب کوئی اچھی کتاب ملتی میں اس کے لیے لے آتا۔ اسی دوران اسکول کی لائبریری سے اس نے ایک کتاب لی جو اسے اتنی پسند آئی کہ اس نے پوری کی پوری اپنی کاپی پر لکھ لی۔ مجھے پتا چلا تو میں نے اسے سمجھایا کہ اس سے بہتر تھا اس کو خرید لیا جاتا، تم نے اتنی مغز ماری کی اور ٹائم ضائع کیا۔ پھر ڈائجسٹ اس نے پڑھنے شروع کیے۔ میں اسے صرف امتحانوں کے قریب ڈائجسٹ پڑھنے سے منع کرتا۔ باقی دنوں میں چشم پوشی اختیار کرتا، پھر یہی پڑھنے کا شوق ایک دن اس کو لکھنے کی طرف مائل کر گیا اور اس نے سب کچھ چھوڑ کر صرف اور صرف لکھنے پر اپنی ساری توانائیاں صرف کر دیں اور اتنی جلدی اس نے لکھنے والوں میں اپنے آپ کو نمایاں کر دیا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ جلدی میں تھی بلکہ بہت جلدی میں تھی۔ ہر چیز جلدی حاصل کرنے کی تگ و دو میں تھی۔ راستے کا ہر سنگ میل جلد از جلد سر کر لینا چاہتی تھی۔ جیسے اس کو پتا ہو یا اندازہ ہو یا اللہ کی طرف سے شاید اس کو بتا دیا گیا ہو کہ تمہاری زندگی بہت مختصر ہے۔ جلدی جلدی ہر چیز کر لو۔ اپنے حصے کی شہرت جلد ہی حاصل کر لو کہ تمہارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ میں اکثر اسے کہتا تھا کہ تم کیوں اپنے آپ کو ہلکان کر رہی ہو۔ آرام آرام سے کام کرو۔ ادھر ادھر بھاگے بھاگے پھر رہی ہو۔ تم وقت سے پہلے بوڑھی ہو جاؤ گی۔ بچوں کو مناسب ٹائم دو مگر اس نے یہی جواب دیا۔ بس تھوڑی ہی دیر ہے پھر میں آرام کروں گی۔ اچھا آرام کیا کہ باقی سب لوگوں کو بے آرام کر دیا۔ میں نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ تم منوں مٹی کے نیچے جا کر لیٹ جاؤ اور آرام کرو۔ میں تو تمہیں کام کے بعد آرام کا کہتا تھا مگر تم کتنی تابعدار بیٹی نکلیں کہ ابو نے تھوڑا آرام کا کہا اور تم نے مکمل آرام کر لیا کہ لو ابو آپ اکثر کہتے تھے نہ کہ تم کچھ ریسٹ کر لو۔ اب ریسٹ ہی ریسٹ، آرام ہی آرام۔ ارے بیٹی میں نے ایسا تو نہیں کہا تھا۔ تمہارے دو پھول سے بچے ڈھائی سال کا تیمور اور دس ماہ کی عروشہ وہ تو تمہیں ڈھونڈتے ہیں اتنے سارے لوگوں میں کہ ہماری ماما تو ہر روز رات کو ہمیں لینے آتی تھی نانو کے گھر سے۔ اب کیوں نہیں آتی۔ ان کو تو کچھ پتا نہیں کہ تمہیں کہاں لٹا دیا ہے اور تم اب ان کے پاس کیوں نہیں آتیں۔ تیمور تو کچھ سمجھ دار ہے، کچھ دن پوچھ کر چپ ہو رہا۔ عروشہ کو تو ابھی کچھ پتا نہیں۔ پہلے عروشہ کسی کے پاس بھی نہیں جاتی تھی۔ یہاں تک کہ اپنی دادی اور پھوپیوں کے پاس بھی نہیں۔ چونکہ وہ ہمارے پاس ہی رہی زیادہ تر لیکن اب ہر ایک کے پاس چلی جاتی ہے کہ شاید یہی میری ماں ہے۔ ہر ایک کے پیار میں اپنی ماں ڈھونڈتی ہے۔ تھوڑی بڑی ہو گی تو پوچھے گی میری ماں کون ہے؟ کہاں ہے؟ ہم کیا جواب دیں گے۔ کہاں سے لائیں گے تمہیں اور ماں کا پیار ان بچوں کو کہاں سے ملے گا؟ شازیہ تم نے حسب معمول بہت جلدی کی جانے کی۔

بچے دن کو ہمارے ہاں ہوتے۔ شازیہ شام کو آتی۔ گاڑی کی آواز سن کے تیمور بھاگ کر دروازے پر آ جاتا اور کہتا میری شازیہ ماما آ گئی۔ میں نے اپنے گھر جانا ہے۔ عروشہ چل نہیں سکتی تھی، رینگتے ہوئے یا گھٹنوں کے بل آتی دروازے کی طرف اور شازیہ اندر آتی تو عروشہ کو کہتی۔ میلا بیٹا...... تو عروشہ کھل جاتی اور فوراً اس کی گود میں آ جاتی اور باہر جانے کو کہتی۔ میں کہتا بچوں کو کہ اوئے بڑے بے وفا ہو، سارا دن تو ہم تمہاری چاکری کریں اور رات کو تم ماما کے بیٹے بن جاتے ہو اور میں دل ہی دل میں سوچتا کہ اللہ نے بچوں کو بھی اپنی ماں کی پہچان اور محبت کی خوشبو عطا کی ہے کہ فوراً پہچان جاتے ہیں کہ یہی میری ماں ہے۔

شازیہ کا جس دن ایکسیڈنٹ ہوا، میں میانوالی کے قریب چشمے کے مقام پر سرکاری کام کے سلسلے میں گیا ہوا تھا۔ مجھے شام کو فون آیا گھر سے کہ طارق کا فون آیا ہے اسپتال سے کہ شازیہ کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے اور وہ بے ہوش ہے ایمرجنسی میں۔ میں نے بیٹے کو کہا کہ اپنی امی کو لے کر اسپتال جاؤ اور وہاں سے مجھے بتاؤ کہ کیا صورت حال ہے۔ انہوں نے بتایا کہ انتہائی نگہداشت کے یونٹ میں داخل ہے اور ابھی تک ہوش نہیں آیا ہے۔ میں رات بارہ بجے تک ٹیلی فون پر گھر والوں سے رابطے میں رہا پھر فیصلہ کیا کہ علی الصباح یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔ 10 بجے کے قریب اسپتال پہنچا۔ ڈیوٹی ڈاکٹر سے تفصیل پوچھی تو اس

نے بہت ہی مایوس کن خبر دی کہ بہت خراب حالت ہے۔ چوٹ کے باعث دماغ کا رابطہ جسم سے کٹ چکا ہے اور مشین سے دے رہے ہیں کیونکہ اپنا سانس نہیں ہے۔ میرے خیال میں تو اتنا بڑا ایکسیڈنٹ نہیں تھا اور عام طور پر بے کچھ دن کے بعد ہوش میں آ جاتے ہیں مگر اس کی ظاہری حالت بہت خراب تھی۔ حادثے کی تفصیل یہ ہے کہ اس کی ا خراب تھی اور وہ ورکشاپ میں تھی۔ پہلے جب اس کی گاڑی خراب ہوتی تھی تو کبھی کبھار میری گاڑی لے جاتی تھی۔ اس نے موٹر سائیکل پر جانے کی ضد کی۔ موٹر سائیکل ہماری ہی تھی جو اُن کے گھر کھڑی تھی۔ اس کے خاوند نے منع بھی کیا بیٹھی نہیں ہو تمہیں بیٹھنا نہیں آئے گا مگر وہ نہ مانی۔ یہاں تک کہ طارق نے کہا کہ بھائی نے کہیں جانا ہوگا تو پھر۔ اس میرا بھائی ہے میں کہہ دوں گی۔ بہرحال تقدیر ایسی ہی تھی۔ سب جگہ سے مل ملا کے واپس گھر کے قریب تھے کہ آگے سے ایک دم آگے آ گئے۔ ان کو چاتے بچاتے خود گر گئے۔ گرنے کے تھوڑی دیر بعد ہی وہ بے ہوش ہو گئی اور پھر کبھی ہوش آئی۔ پانچ دن اور کچھ گھنٹے اسی حالت میں رہ کر خالق حقیقی سے جا ملی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اتنے سارے لو دعائیں اور رونا پیٹنا، طارق کے آٹھ پہرے لگاتار روزے، ڈاکٹروں کی اتنی دیکھ بھال، دوائیاں، کچھ بھی کام نہ آیا اور و سب کو روتا چھوڑ کر۔ بچوں کا بھی خیال نہ کیا، بس چلی گئی۔ آخری دن صبح کو میں اپنے کزن ڈاکٹر افضل (جو کہ لاہور سے خا پر آئے تھے) کے ساتھ اس کو دیکھنے گیا تو اس وقت لگ رہا تھا کہ وہ زندہ نہیں ہے۔ میں نے ڈاکٹر افضل سے کہا کہ مجھے نہیں لگ رہی۔ کیونکہ اس کے چہرے کے نقوش پھیل گئے ہیں، تیکھے تیکھے نہیں ہیں۔ سمجھ تو وہ بھی گئے ہوں گے مگر مجھے تسلی رہے کہ نہیں یہ آپ کو ویسے ہی لگ رہا ہے۔ وہ ڈھائی بجے روانہ ہوئے لاہور کے لیے اور ابھی پہنچے بھی نہ پائے تھے کہ مو موبائل پر اطلاع کر دی کہ شازیہ اب اس دنیا میں نہیں رہی۔

ابھی ایک ماہ ہونے کو ہے اسے ہم سے جدا ہوئے مگر ابھی تک یقین نہیں آ رہا کہ شازیہ مر گئی ہے۔ شازیہ کی پر میں نہیں رویا، بہت ضبط کیا۔ ہر ایک کو بھی رونے سے منع کیا مگر اب جبکہ میں یہ لکھ رہا ہوں تو میری آنکھوں سے آنسو روا مگر اس وقت مجھے کوئی نہیں دیکھ رہا سوائے اللہ کے۔

شازیہ تھی تو بیٹی مگر مجھے بیٹوں سے بڑھ کر اس کا آسرا تھا۔ میں اکثر کام کے سلسلے میں گھر سے باہر رہتا تھا۔ اوقات کئی کئی ہفتے گھر سے دور رہتا تھا مگر کبھی گھر کی فکر نہیں ہوتی تھی۔ میرے رفقائے کار اکثر کہتے تھے کہ ڈاکٹر صاحب آ گھر کی فکر کیوں نہیں ہوتی۔ میں کہتا میری بیٹی ہے گھر پر۔ وہ میرے بعد گھر کی دیکھ بھال کر لے گی۔ چھوٹی بہن کو اس نے ما طرح پالا، اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھا۔ چھوٹے بھائی کا داخلہ، اس کے اسکول جانا۔ ماں کو بازار لے جانا شاپنگ کے۔ غرض ہر ایک کا خیال رکھتی تھی وہ۔ اسے تحفے دینے کا بہت شوق تھا۔ وہ ہر سال سب بہن بھائیوں کی سالگرہ خوب مناتی اور ا پیسوں سے انہیں تحفے خرید کر دیتی اور ہمیں بھی کہتی کہ اس کی سالگرہ ہے اس کے لیے تحفہ لائیں۔ میری سالگرہ پر ہر دفعہ کوئی نہ تحفہ ضرور دیتی اور کارڈ بھی۔ تیمور کی پہلی سالگرہ بڑی دھوم دھام سے منائی۔ سب سہیلیوں اور رشتے داروں کو بلایا۔ میرے کرنے کے باوجود بہت خرچہ کیا۔ کہتی تھی کہ میرے بیٹے کی پہلی سالگرہ ہے دھوم دھام سے مناؤں گی۔ طارق بھی پورا پورا ا ساتھ دیتا تھا۔ تیمور کی دوسری سالگرہ پر صرف فیملی فنکشن ہی کیا۔

عروشہ کی سالگرہ منانے کی تیاریاں کر رہی تھی۔ اس کے بال ذرا بڑے ہو گئے تھے۔ میں نے کہا کہ اس کے کٹوا دو۔ گرمی آ رہی ہے۔ تو کہتی ہے کہ ابھی نہیں، 30 جون کو اس کی سالگرہ ہے۔ سالگرہ کے بعد کٹوائیں گے۔ کیونکہ بالوں تو پونیاں لگانی ہیں سالگرہ کے دن۔ اب جیسے جیسے عروشہ کی سالگرہ کا دن قریب آ رہا ہے، اس کی باتیں یاد کر کے دل بہت ادا اور غمگین ہو جاتا ہے کہ سالگرہ کے دن عروشہ اپنی شازیہ ماما کو ڈھونڈے گی اور اسے نہ پا کر اس کے ننھے سے دل کو جو صدمہ ہوگا ہم سے کیسے برداشت ہوگا۔ خدا بھی تو دیکھ رہا ہوگا سب کچھ۔ اس کی خدائی میں کوئی ہلچل نہیں مچے گی اس معصوم یتیم کی آہ سے۔ اللہ! تو ان بچوں کو صبر اور حوصلہ عطا کرنا اور ہمیں بھی تیری رضا پر راضی رہنے کی طاقت اور حوصلہ عطا کرنا اور شازیہ چوہدری کو جنت الفردوس میں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دینا اور اسے حضور پاک کی شفاعت نصیب فرمانا۔ آمین! قارئین کرام سے بھی شازیہ مغفرت کے لیے دعائی درخواست ہے۔

میری زندگی کی ساتھی

محمد طارق (شوہر)

عزیز اتنی ہی رکھو کہ دل بہل جائے
اب اس قدر بھی نہ چاہو کہ دم نکل جائے

شازیہ ہمیشہ یہ شعر گنگنایا کرتی تھی اور میں کہتا تھا کہ یار میرا تو دم نکل ہی جائے گا مگر نہیں، میں جھوٹ کہتا تھا اور وہ سچ کہتی تھی۔ میرا دم نہیں نکلا اور وہ میری زندگی میں آ کر میرے اندر خاموشی سے سوتی ہوئی زندگی کو جگا کے اس میں ہلچل مچا کر اور ساتھ ہی میرے پیروں میں تیمور اور عروشہ نام کی بیڑیاں ڈال کر مجھے باندھ کر بے بس کر کے چلی گئی۔ تنہا چھوڑ کے کہ اب مجھ تک پہنچنا ہے تو کچھ کر کے آؤ۔

5 مئی 2004ء کو G-10 سے آتے ہوئے شام تقریباً مغرب کا وقت تھا، میں موٹر سائیکل چلا رہا تھا۔ ہم دونوں خاموش تھے کہ اچانک شازیہ ہنسنے لگی۔ اس کی وہ ہنسی عجیب تھی۔ گزشتہ تین سالوں میں، میں نے اس کی ایسی ہنسی نہیں سنی تھی۔ باریک سی کھنکھناتی سی ہنسی جیسے کسی کے ہاتھ کی چوڑیاں بج اٹھیں، جیسے کوئی معصوم سی بچی اچانک کسی بات پر بے اختیاری میں کھلکھلا کر قہقہہ لگا کر ہر ایک کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے۔ میں نے گردن گھما کر دیکھا "یہ تم ہنسی ہو۔"

"ہاں، میں سوچ رہی ہوں کہ اگر مجھے کچھ ہو گیا تو تم کیا کرو گے؟"

"یار شازیہ ہر وقت بکواس نہیں کرتے کوئی وقت ہوتا ہے۔"

"نہیں، میں ویسے ہی بات کر رہی ہوں۔"

"تم خاموش نہیں ہو سکتیں۔"

مستقل ہنستے ہوئے "نہیں میں بات کر رہی ہوں۔"

"یار میں نے یہیں سے ہاتھ گھمانا ہے اور تم نے وہاں روڈ پر پڑے ہونا ہے۔ ہر وقت بکواس نہیں کرتے، کسی وقت منہ سے نکلی بات پوری ہو جاتی ہے۔"

مستقل ہنستے ہوئے "نہیں، میں یہ سوچ رہی ہوں کہ تم کیا کرو گے۔"

"شازیہ تم خاموش ہو جاؤ!"

"میں سوچ رہی ہوں کہ بچی میری امی کے ساتھ اٹیچ ہے، وہ وہاں رہ لے گی۔ بیٹا تمہارے گھر والوں کے ساتھ ایڈجسٹ ہے، کچھ دن گزریں گے ماما کو بھول جائے گا۔ میں یہ سوچ رہی ہوں کہ تم کیا کرو گے، تمہیں کون سنبھالے گا......؟"

6 مئی 2004ء کو صبح اسے ہر کام کی جلدی تھی۔ عموماً جب وہ بچوں کو اپنی والدہ کے پاس چھوڑنے جاتی تھی، جن کا گھر ہم سے ایک گھر چھوڑ کر واقع تھا تو وہاں دس پندرہ منٹ لگا کر آتی تھی۔ اس روز دروازے سے اندر ہی نہیں گھسی۔ حالانکہ اس کی والدہ نے اسے اندر بلایا۔ کہنے لگی کہ ابھی واپس آؤں گی تو بیٹھوں گی اور واپسی پر گھر آتے ہوئے ایکسیڈنٹ سے چند لمحے پہلے مجھ سے کہنے لگی۔

"طارق کیا بات ہے آج تم تیز نہیں چلا رہے ہو، جلدی چلو۔"

میں نے کہا "تم رہنے دو ایسے ہی ٹھیک ہے۔"

اور چند لمحوں بعد تقریباً 2:15 پر گھر کے بالکل قریب پہنچ چکے تھے، ہائی وے پر عین کھنہ پل کے نیچے ہمارا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ کسی گاڑی نے ٹکر نہیں ماری، بلکہ وہ دو لڑکے تھے شاید کالج کے۔ میں انہیں دور سے دیکھ کر آہستہ ہو گیا۔ وہ دونوں بھی روڈ کے درمیان کھڑے ہو گئے کہ موٹر سائیکل گزر جائے بس جب میں عین ان کے پاس پہنچ گیا تو ان میں سے ایک

لڑکا دوڑ پڑا، دوسرے نے اسے پکڑا لیکن وہ اس سے کندھا جھٹک کر بھاگا اور آ کر ہماری موٹر سائیکل سے ٹکرا گیا۔ اس کو بھاگتا... کر شازیہ کے منہ سے جو آخری الفاظ نکلے وہ تھے۔

"یا اللہ خیر!"

لمحوں میں سب کچھ ہو گیا۔ فاصلہ اتنا تھا کہ اس لڑکے کا ایک قدم زمین پر پڑا اور دوسرے قدم پر وہ ہماری... سائیکل سے ٹکرا گیا۔ وہ بھی گرا، ہم بھی گرے۔ میں فوراً اٹھا کہ شازیہ کو چوٹ نہ لگ جائے، مڑ کر اسے دیکھا تو وہ بے ہوش... تھی۔ ناک اور کانوں سے خون بہہ رہا تھا۔ میں نے اسے اٹھایا، پاس ہی ایک گاڑی والا رکا شازیہ کو اس میں ڈال کر منٹوں... اسپتال پہنچا۔ میں بھی ساتھ ہی گرا تھا، مجھے کچھ نہیں ہوا سوائے دونوں ہتھیلیوں کی معمولی خراشوں کے، موٹر سائیکل جو کہ روڈ... اس کونے سے اس کونے تک گھسٹتا گیا اس پر ایک خراش تک نہیں آئی۔

اور وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئی۔ 6 دن PIMS کے ICU میں رہنے کے بعد 04-05-11 شام 07:15 پر مجھے چھوڑ کر خود بھی تنہا ہی چلی گئی۔ جو میرے بغیر کھانا نہیں کھایا کرتی تھی۔ میں اگر گھر میں نہیں ہوتا تو سویا نہیں کرتی تھی۔ میرے... کہیں جایا نہیں کرتی تھی، وہ میرے بغیر چلی گئی۔ کہا کرتی تھی کہ...... "میں مر گئی تو کیا کرو گے؟"

میں کہتا تھا "ہم دونوں ہر کام ساتھ کرتے ہیں مریں گے بھی ایک ساتھ۔"

کہتی تھی "نہیں۔"

میں کہتا تھا "اگر نہیں تو پہلے میں مروں گا۔"

کہتی تھی "تم دیکھتے رہ جاؤ گے اور میں مر جاؤں گی۔"

اور میں دیکھتا رہ گیا اور وہ مر گئی۔

شازیہ کو ملنے والے لوگ بہتر طور پر جانتے ہیں کہ وہ خود تو کیا ڈپریس ہوتی کسی غیر کو بھی خاموش اور اداس نہیں... سکتی تھی۔ کسی کو بھی ایسی گفتگو نہیں کرنے دیتی تھی۔ ہر وقت ہنسنا ہنسانا اور زندگی سے بھرپور رہنا لیکن حادثے سے کوئی ایک ڈ... ماہ پیشتر اس نے اس طرح کی گفتگو شروع کر دی تھی لیکن مایوسی کے انداز میں نہیں، ہنستے ہنستے ساری باتیں کر گئی اور میں نادان... ہی نہ سکا کہ یہ کیا کہہ گئی ہے۔ آج اس کی کہی ہوئی ساری باتیں ایک ایک کر کے یاد آتی ہیں تو سمجھ آتی ہے کہ وہ کون تھا جو اس... یہ باتیں کروا رہا تھا۔ وہ مجھ سے ایک لمحے کو بھی جدا نہیں۔

میں اس کی رفاقتوں پہ نازاں
محسن وہ غرور دوستی ہے

آپ سب سے جو شازیہ کو جانتے ہیں، اس کو پڑھتے ہیں اور جن کے ہاتھ اٹھتے ہیں شازیہ کو دعا دینے کی خاطر... تمام بہنوں اور بھائیوں سے میری ایک چھوٹی سی گزارش ہے کہ جب بھی دعا کریں، اگر ہو سکے تو ہمارے لیے یہ دعا کریں کہ... تعالیٰ مجھے اتنی توفیق دے دیں کہ میں اپنے رب کو، اس اللہ کو راضی کر لوں کہ جس کا وعدہ ہے کہ اگر تمہارے اعمال نیک ہیں... صبر کے ساتھ مجھ پر یقین رکھتے ہو تو میں تمہیں آخرت میں ملا دوں گا۔

جانا سب نے ہے اپنے وقت پر۔ آج شازیہ گئی کل کیا پتا کس کی باری ہے۔ آپ سب سے التجا ہے کہ ہمار... لیے اتنی سی دعا کریں کہ وہ وقت آنے سے پہلے میں اپنے اور شازیہ کے لیے اتنا زادِ راہ اکٹھا کر لوں کہ اپنے اللہ اور اس کے محبو... کے سامنے شرمندگی سے بچ جاؤں اور وہاں جا کر اس کو حاصل کر لوں...... آمین!

آپ کی دعاؤں کا طلب گار طارق۔

گو شازیہ ہم سب کو چھوڑ کر بہت دور جا چکی ہے، مگر پھر بھی شازیہ کی والدہ کی نگاہیں دروازے پر لگی ہیں کہ ا... شازیہ شور مچاتی آئے گی کہ امی چلیں جلدی سے تیار ہو جائیں نمائش پر جانا ہے

امی چلیں اتوار بازار جانا ہے......

امی چلیں منگل بازار جانا ہے......

لیکن ماں کی سہیلیوں جیسی بیٹی اب نہیں آئے گی کیونکہ وہ ایسے دیس سدھار گئی جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔ اس کی والدہ سے کوئی پوچھے کہ ان کا کیا حال ہے کہ جس بیٹی کے ہوتے انہیں کبھی گھر کی کسی چیز کے بارے میں سوچنا نہیں پڑا۔ آج وہ سوچتے ہیں کہ ان کی بیٹوں جیسی بیٹی اچانک بغیر کوئی بات کیے چپکے سے انہیں تنہا کر گئی۔

میری والدہ اب بھی بچوں کو دیکھتی ہیں تو ان کی آنکھوں سے سوتے پھوٹ پڑتے ہیں کہ جب یہ بچے تھوڑے سمجھدار ہوں گے اور پوچھیں گے کہ ماما کہاں گئیں تو ان کو کیا جواب دوں گی۔ ہر آنکھ میں آنسو ہیں۔ اللہ تعالیٰ سب کو صبر جمیل عطا فرمائے...... آمین!

میری پیاری بہو شازیہ

(شازیہ کی ساس)

کیا خوبصورت شام تی جب نکاح ہو رہا تھا۔ بیٹا خوشی سے ہنس ہنس کر سب سے باتیں کر رہا تھا۔ بہو شرمائے جا رہی تھی۔ ان کی خوشی دیکھتے ہوئے میرا خون منوں بڑھ رہا تھا۔ اولاد کا دکھ سب سے بڑا اور اس کی خوشی سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ دنیا کی رنگینی ماں کے لیے اولاد کی آنکھوں میں ہوتی ہے جو کہ خوشی اور غم کی سچی عکاس ہوتی ہیں اور یہی خوشی مجھے فضاؤں میں اڑا رہی تھی۔ جس خوشی کے ساتھ نکاح کی تیاری کی گئی اس سے زیادہ زور شور سے شادی کی تیاری کی۔ 16 جون کو جب شازیہ نے گھر میں قدم رکھا۔ میرا سر فخر سے بلند اور دل خوشی سے سرشار ہو گیا۔ گھر کی روشنی میں اضافہ ہو گیا۔ اپنی بیٹیاں پرائی اور پرائی اپنی ہوتی ہیں اور بہوئیں اصل بیٹیاں ہوتی ہیں۔ فکر اور پریشانیوں میں کمی ہو گئی تھی۔ کچھ دنوں بعد تیمور کی خوشخبری سنا کر گھر کی خوشیوں میں مزید اضافہ کر دیا۔ اس کے بعد عروشہ کی آمد۔ لگتا تھا خوشیاں سمیٹے نہ سمٹیں گی۔ ہر دن خوبصورت اور رات رنگین ہوتی جا رہی تھی۔ دو مہینے پہلے تیمور کی سالگرہ پر عروشہ کی سالگرہ اور عقیقے کا پروگرام بناتے ہوئے یہی کہا تھا۔ آنٹی پتا بھی نہیں چلے گا تین مہینے گزر جائیں گے اور عروشہ کا دھوم دھام سے عقیقہ اور سالگرہ کریں گے۔ ابھی تو خوشیوں کے بادل پوری طرح چھائے بھی نہیں تھے کہ 5 مئی کو ملنے والی خبر میری روح فنا کر گئی۔ ایکسیڈنٹ کی خبر سے پہلے دل پریشان ہو رہا تھا۔ جب اسپتال پہنچی تو وہ منظر دیکھ کر میری روح فنا ہو گئی۔ چھ دن میں ایک منٹ گھر آنے کو دل نہ کرتا تھا، ایسا لگتا تھا کہ ابھی آنکھیں کھولے گی اور باتیں کرنے لگے گی۔ اللہ سے ایک ہی دعا تھی، یا اللہ ان معصوم پھولوں پر ان کی ماں کا سایہ سلامت رکھنا۔ رو رو کر اس کی رحمت مانگتے رہے۔ 11 مئی شام کو میں پاس کھڑی تھی، ڈاکٹر پاس کھڑے تھے، شوہر بیوی کے سرہانے کھڑا تھا مگر سب بے بس تھے۔ خدا کی مرضی پوری ہو کر رہتی ہے۔ اللہ کو کچھ اور منظور تھا، شازیہ ہمیشہ کے لیے ہم سے اپنا ہاتھ چھڑا کر اگلے سفر پر چل پڑی۔ ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ الفاظ منجمد ہو گئے۔ فون کر کے شازیہ کے ماں باپ کو اس بری خبر کی اطلاع دی، پھر ہم سب اپنے ہاتھوں سے ایمبولینس میں لے کر آئے۔ میری تو دنیا ویران ہو گئی۔ اولاد کا دکھ جینے نہیں دیتا مگر مجبور ہیں اس ذاتِ پاک کے آگے۔

میری پیاری بھابھی

مزمل (چھوٹی نند)

گلی کا کونا مڑتی ایمبولینس دیکھ کر گزرے خواب جیسے دن آنکھوں میں گھوم گئے۔ گزشتہ دو سال، دس مہینے اور 25 دن کا ایک ایک لمحہ اور اس لمحے کی ہنسی میرے کانوں میں گونجنے لگی جیسے کل کی بات ہے۔

5 جنوری کو تمام گھر والے خلاف توقع صبح جلدی اٹھے کیونکہ ظہر کے بعد نکاح کے لیے جانا تھا۔ دونوں گھروں میں خوشیاں منائی جا رہی تھیں، ہر کوئی خوشی سے تیاری میں مصروف تھا۔ دونوں گھروں کی پہلی پہلی خوشی تھی اس لیے چند قریبی رشتے دار اور دوستوں کے ساتھ جب ہم بھابھی کے گھر پہنچے تو وہ لوگ بھی خوش آمدید کہنے کو موجود تھے۔ گھر کی بڑی بہو اور ہماری بڑی

بھابھی سے نکاح کے بعد کافی دیر تک گپ شپ ہوتی رہی اور تصاویر بنوائی گئیں۔ اس سے زیادہ اچھا مجھے اگلی صبح لگا جب فون آیا۔ ان کی آواز اور بولنے کا انداز۔ کیونکہ دونوں گھروں کے تمام فیملی ممبرز کا ملاپ اکٹھے نکاح والے دن ہوا تھا جو کہ بہ رہا تھا۔ انہوں نے فون کر کے سب کا فرداً فرداً شکریہ ادا کیاں سب کے گفٹس پسند کیے اور بہت تعریف کی۔ اتنے تھوڑ میں اتنا سب انہیں بہت اچھا لگا تھا اور مجھے ان کا پسند کرنا اچھا لگا۔ 5 جنوری سے 16 جون تک بھابھی کے ساتھ ہمار خاصی انڈر اسٹینڈنگ ہوگئی۔ ہر بات شیئر کرنا، آنا جانا رہا۔ 15 جون کو مہندی تھی جو کہ اپنے اپنے گھر کرنی تھی لیکن ہم پیلے جوڑے میں دیکھنے کی خاطر سامان لے کر جادھمکے۔ پانچ منٹ کے اندر اندر انہیں تیار کیا۔ ساس نے اپنی بہو کی بلائیں دیوروں اور نندوں نے مہندی لگا کر منہ میٹھا کیا اور شرماتی ہوئی بھابھی کا چہرہ دیکھ کر خوش ہوتے رہے۔ اگلے دن برات گئے۔ واقعی چاند شرماتا تھا دلہن دیکھ کر۔ سب خوشی سے پاگل ہو رہے تھے۔ بڑے دیور صاحب تو کان میں کھسر پھسر آتے تھے۔ بھابھی کے گرد سب نے گھیرا ڈالا ہوا تھا۔ آخر وقت رخصت آیا اور ہم اپنی بھابھی لے کر چل دیئے۔ برات آئی، پٹاخوں کی آواز سے پورا ماحول گونج رہا تھا۔ سب کچھ خواب کی طرح اچھا لگ رہا تھا۔ موتیے اور گلاب کے پھولوں سے پورا کمرا معطر ہو رہا تھا۔ ولیمے والے دن بھابھی گلاب کی طرح خوبصورت لگ رہی تھیں۔ اس کے بعد ہمیں سب خوشخبری بھابھی نے دی (تیمور کی) سب کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ ساس کو بہو کے علاوہ کوئی نظر نہ آتا تھا۔ طرح طرح چیزیں، ناز برداریاں، نندوں دیوروں کی چھیڑ چھاڑ۔ آخر 27 مارچ کو یہ ننھا مہمان ہمارے گھر میں آیا۔ خوشیاں دگنی ہو بھابی ساس اور سسر کی آنکھوں کا تارا تھیں۔ ہر کام شازیہ کے مشورے سے کرنا ہے۔ بھابھی اور باجی کی دوستی اچھی سہیلی طرح چل رہی تھی۔ کہیں آؤٹنگ یا خریداری کے لیے جانا ہوتا تو اکٹھے جاتیں۔ کچھ عرصہ بعد عروشہ کی خوشخبری ملی اور ایک پھر سب خوشی کے گیت گانے لگے۔ ہمیں لگتا تھا کہ ہر دن عید اور ہر رات شب برات ہے۔ ویک اینڈ پر بھابھی بھائی آ ساری رات گپ شپ میں گزرتی۔

کوئی کام ہوتا، میں فوراً فون کرتی۔ بھابھی میں نے فلاں جگہ جانا ہے، کوئی چیز لینی ہے آجائیں۔ فرض خو سکون میں دن گزر رہے تھے۔

ایکسیڈنٹ سے ایک ہفتہ پہلے ایک گھنٹے کی بات چیت ہوئی۔ میں نے فون کیا۔ بھابھی کیسی ہیں؟ ٹھیک بیٹے۔ بھابھی کب چکر لگانا ہے، تیمور بہت یاد آرہا ہے۔ ٹھیک ہے، آج آئیں گے! پھر کچھ ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے کے وقت بھابھی آئیں اور روٹین کی گپ شپ چلتی رہی۔ ان کی وہ باتیں وہ ہنسی میری آنکھوں میں اسی طرح مجسم ہے او کی وہ شام بھی ابھی بھولی نہیں ہوں۔

اور پھر اتوار کو بھائی تیمور کو لے کر آئے۔ بھابھی نے وعدہ کیا تھا کہ آؤں گی، آؤٹنگ کے لیے جانا تھا۔ جب نے دیکھا وہ نہیں آئیں تو میں نے فون کر دیا۔ ہمیشہ کی طرح ان کی سب سے بڑی مجبوری۔

بیٹے میں نے ناول پورا کرنا ہے اس لیے شام میں چلیں گے۔ میں نے کہا۔ نہیں بھابھی پھر دیر ہو جائے گی کہ دن چلیں گے۔ چلو ٹھیک ہے، میں فارغ ہو جاؤں تو آرام سے چلیں گے۔

پیر کو باجی نے پھر فون کر دیا۔ ”شازیہ مجھے کچھ چیزیں چاہئیں۔“

انہوں نے ہنستے ہوئے فوراً شرط رکھی۔ ”لیکن اس کے بدلے اپنے ہاتھ سے پکی چکن بریانی کھلاؤ گی تب دوں“

”ٹھیک ہے بھوکی۔“ وہ دونوں سہیلیوں کی طرح آپس میں باتیں کرنے لگیں۔

”اچھا ایک دو دن تک چکر لگے گا تو لیتی آؤں گی۔“ بھابھی نے کہتے ہوئے فون بند کر دیا۔

آج کل عروشہ کے عقیقے اور سالگرہ کی تیاری بھی ہم لوگ کر رہے تھے اس لیے بھی مشورہ کرتے رہتے تھے۔ دن کو تقریباً تین بجے بھائی کا فون آیا۔ امی کی طبیعت سخت خراب تھی، دوائی دے کر سلایا تھا۔ وہ ہارٹ پیشنٹ بھی ہیں۔ بھائی بتایا بھابھی اور بھائی کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔ یہ سن کر پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ کب، کہاں، کیسے، یہ کس نے بتایا ہے؟

ت سے سوال کیے۔

امی ہارٹ پیشنٹ ہیں، انہیں ایک دم نہیں بتا سکتے تھے۔ وہ تو سو رہی تھیں دوائی کھا کے۔ ”اچھا انہیں ایک دم سے بتانا۔“

”مجھے تو کچھ بتاؤ۔“

”مجھے خود ابھی کچھ نہیں پتا۔ اسپتال سے طارق کا فون آیا تھا۔ ابھی جاؤں گا تو تفصیل بتا دوں گا۔“

گھر میں کوئی نہ تھا۔ سب کو آفسز میں فون کر کے اطلاع دی۔ تھوڑی دیر میں بڑی باجی اور بھائی آگئے۔

”کیا ہوا ہے؟“

”پتا نہیں۔“

”امی کو بتایا۔“

”نہیں۔“

جب اولاد پریشان ہو تو ماں کو جلدی خبر ہو جاتی ہے۔ وہ ایک دم گھبرا کر اٹھیں۔ سب کو دیکھ کر پریشان ہوئیں تو ہم بتایا۔

سارے بھائی اور ان کے دوست اسپتال پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے فون کر کے بتایا۔ تھوڑی دیر میں بھابھی کی امی ہیں۔ تیمور کو گھر چھوڑا اور اسپتال چلے گئے۔

سب اسپتال میں تھے۔ میں بار بار فون کر کے معلوم کر رہی تھی پر تسلی نہیں ہو رہی تھی۔ رات ایک بجے بھائی اور کزن ے جلدی میں۔ کھانا دے دو کیونکہ دیور نے اور اس کے دوست نے خون دیا ہے۔ انہوں نے پورے دن کچھ بھی نہیں کھایا تھا کے لیے۔

پریشانی بڑھ گئی۔ یا اللہ ایسا کیا ہوا ہے، دل سے خود بخود دعائیں نکل رہی تھیں۔

صبح آٹھ بجے باجی بھائی کے ساتھ آئیں تو پتا چلا رات آپریشن ہوا ہے دماغ کا مگر پھر بھی ہوش نہیں آیا۔ آنکھوں آنسو رواں تھے۔ باجی دعائیں کرتی جا رہی تھیں۔ دن کو ہم تیمور کو ساتھ لے کر اسپتال پہنچے۔ سب لوگ وہیں موجود تھے۔ ی کی حالت دیکھ کر آنسو نہیں رکتے تھے۔ بھائی اپنی چوٹیں اور درد بھول کر بھابھی کے لیے دعا میں مشغول تھے۔ ہم باہر آ کر گئے، سب رو رو کر نڈھال ہو رہے تھے۔ بھائی پوری امید سے ایک ہی بات کر رہے تھے۔ کچھ نہیں ہوتا انشاء اللہ! اپنے ؤں پر چلتی ہمارے ساتھ جائے گی دیکھنا۔ امی گھر نہ آتی تھیں۔ ہر ایک سے یہی کہہ رہی تھیں۔ دعا کرو اللہ میری بہو کا سایہ کے بچوں پر سلامت رکھے۔

11 مئی منگل شام سات بجے قرآن خوانی سے فارغ ہوئے تھے کہ فون کی بیل بجی اور یہ بری خبر روح کو فنا کر گئی۔ گھر میں ابھی کل دلہن بن کر آئی تھیں وہ۔ ابھی تو راستے بھی پرانے نہ ہوئے تھے، اتنی جلدی جس جگہ برات رکی تھی جہاں قدم رکھا تھا وہاں ایمبولینس آ کر رکی۔ وہ قیامت کا دن۔

وہ دیور جو اپنے ہاتھ سے بھابھی لائے، نندیں جنہوں نے ہاتھ پکڑ کر گھر میں داخل کیا۔ انہوں نے اپنے ہاتھوں لحد میں اتارا، لگتا ہے دل پھٹ جائیں گے۔ آنسو نہ تھمتے تھے۔ ایسا زخم جس کا بھرنا مشکل لگتا تھا۔ دو معصوم پھول، وہ اپنی مما لیے ترس گئے۔

قارئین سے استدعا ہے، دعا کیجئے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ پالنے والا تو یقیناً اللہ تعالیٰ ہے مگر اور عروشہ کی نگہبانی کرنے والوں کو اللہ صحت و سلامتی عطا فرمائے......اور یہ پیارے پیارے بچے زندگی کی تمام تر خوشیاں، رانیاں حاصل کر سکیں۔ اے اللہ! میری پیاری بھابھی کو اگلے جہاں میں تمام تر آسانیاں حاصل ہوں۔ ان کی قبر نور سے بھری ران کے درجات بلند ترین ہوں۔ آمین!

میری پیاری دوست

فری (شازیہ کی دوست)

میری اور شازیہ کی دوستی 96ء میں ہوئی جب ہم نے ایم۔ایس۔سی میں داخلہ لیا تھا۔ایم۔ایس۔سی کے پہلے
سال بہت یادگار گزرے۔ شازیہ کی سنگیت میں، میں نے بہت انجوائے کیا۔وہ نہایت ہی زندہ دل لڑکی تھی۔ ہر وقت متحرک
اس کی عادت تھی۔ وہ ایک وقت میں اتنے کام نمٹا لیتی تھی کہ ہم لوگ حیران رہ جاتے تھے۔اس نے ایم۔ایس۔سی کی پڑھائی
ساتھ ساتھ لکھنے کا سلسلہ جس خوبی سے جاری رکھا آپ سب اس سے واقف ہیں۔آپ لوگوں کے لیے شاید یہ نئی بات
شازیہ ہومیو پیتھک ڈاکٹر بھی تھی۔ میں کالج میں اکثر اس سے پوچھتی تھی" یار تم نے اتنی چھوٹی سی عمر میں اتنے سارے کام
کر لیے ہیں؟" تو وہ ہنس دیتی تھی۔ وہ تقریباً میری ہم عمر تھی لیکن عقل مندی اور ذہانت میں مجھ سے دس سال آگے تھی۔

میرے لیے شازیہ کیا تھی یہ بتانا بہت مشکل ہو رہا ہے۔ میری کوئی بہن نہیں ہے اور شازیہ نے یہ کمی پوری کی
تھی۔ وہ میری دوست، بہن، غمگسار، راز دار اور بہت کچھ تھی۔ مجھے جب بھی کوئی پریشانی ہوتی تھی تو میں شازیہ سے ہی ذکر
کرتی تھی اور وہ چٹکیوں میں میرے مسئلے کا حل نکال لیتی تھی۔ میرے کانوں میں اس کا مخصوص فقرہ گونج رہا ہے جو وہ
پریشانی سننے کے بعد کہا کرتی تھی "ارے فری، پاگل یہ بھی کوئی پریشانی کی بات ہے۔"

میری شادی پر شازیہ نے بھرپور طریقے سے حصہ لیا تھا۔ کیونکہ امی کو تو رسموں وغیرہ کا زیادہ آئیڈیا نہیں تھا تو
نے مہندی پر امی کے ساتھ ساتھ ساری رسمیں کروائی تھیں۔ امی کے ساتھ بیٹیوں کی طرح مٹھائی کی پلیٹ اٹھا کر کھڑی رہی
مہندی والے دن جب میرے سسرال والے ہال میں آئے تو شازیہ نے میرے چھوٹے بھائی فاری کے ذریعے میرے
ہال سے باہر بلوایا اور انہیں بطورِ خاص میرا خیال رکھنے کو کہا۔

شازیہ کی شادی 16 جون 2001ء کو ہوئی تھی۔ اس موقع پر ہم سب دوستوں نے شازیہ کو خوب تنگ کیا تھا
میں لانے سے پہلے جب وہ پارلر سے تیار ہو کر آئی تو بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ اس دن بھی اسے پاکیزہ میں سلسلے وار ناول کی
قسط بھیجنے کی فکر ہو رہی تھی۔

شازیہ کے میاں طارق بھائی اور میرے میاں ممتاز حسن میں بھی بہت دوستی ہو گئی تھی۔ شازیہ مجھے اکثر کہا کرتی
کہ "فری، اللہ کا شکر ہے کہ ہمارے شوہروں کی بھی آپس میں اچھی دوستی ہو گئی ہے۔"

شازیہ اور طارق بھائی اکثر ہمارے گھر آتے تھے اور ہم لوگ بھی اکثر ان کے ہاں جاتے تھے اور رات کو دیر تک
گپ شپ چلتی رہتی تھی۔ شازیہ کو میرے ہاتھ کی بنی گلاب جامن بہت پسند تھی۔ عید الفطر پر جب شازیہ اور طارق بھائی تیمور
عروشہ کے ساتھ ہمارے گھر آئے تو میں نے اور چیزوں کے ساتھ ساتھ گلاب جامن بھی بنائیں جو شازیہ کو بہت پسند آئیں
اس نے مجھ سے اس کی ترکیب بھی لی تھی۔ اس کے علاوہ اس نے مجھ سے حلیم کی بھی فرمائش کی ہوئی تھی۔ وہ میری اس عادت
اچھی طرح واقف تھی کہ میں کھانے اکثر فریز کر دیتی ہوں۔ اسی لیے اس نے اپنے مخصوص دوستانہ انداز میں مجھ سے کہا تھا "
میں تیرے گھر آؤں گی، تو حلیم بنانا لیکن خبردار فریزن حلیم مت کھلا دینا۔" شازیہ کی یہ فرمائش پوری نہ ہو سکی کیونکہ زندگی نے
مہلت ہی نہ دی۔ شازیہ سے میری آخری بات 28 مارچ کو ہوئی تھی جب اس نے مجھے میری سالگرہ پر وش کرنے کے لیے
کیا تھا۔ بس وہ ہماری آخری بات چیت تھی۔ اس دن شازیہ نے مجھ سے ہماری ایک اور دوست سعدیہ (جس کی کچھ ہی
پہلے شادی ہوئی ہے) کی دعوت کرنے کے بارے میں پروگرام بنایا۔

شازیہ اکثر میرے میاں کو اور مجھے کہا کرتی تھی کہ کسی دن فوڈ اسٹریٹ میں چاروں مل کر ڈنر کریں گے۔ یہ
باتیں ادھوری رہ گئی ہیں۔

شازیہ کے بغیر بہت عجیب لگ رہا ہے۔ میرے گھر کے کونے کونے میں اس کی یادیں بکھری پڑی ہیں۔ اس

یے گئے تحفے اور کارڈز اب میرے پاس اس کی نشانیاں ہیں۔ اللہ میری بہن+دوست کی مغفرت کرے۔ آمین ثم آمین!
نازیہ میری ایک فون کال پر دوڑی چلی آتی تھی۔ ایک مرتبہ میں بہت ڈپریس تھی، میں نے اسے فون کر کے آنے کو کہا تو اس نے
بچوں کو امی کی طرف چھوڑا اور کچھ ہی دیر میں میرے گھر پہنچ گئی۔

6 مئی سے 11 مئی تک PIMS کے ICU میں کوما میں رہنے کے بعد وہ ہم سے بچھڑ گئی۔ ان 6 دنوں میں ہر روز
ICU کے باہر کوریڈور میں ہم سب اس کی زندگی کے لیے دعائیں مانگتے رہے لیکن اللہ کی مرضی کچھ اور تھی۔ مجھے صحیح معنوں میں
زمین آسمان ایک ہونے کا مطلب اس وقت سمجھ آیا جب میرے میاں نے ICU سے باہر آ کر مجھے وہ خبر سنائی جو سننے کے لیے
میرے کان ہرگز تیار نہ تھے۔ 12 مئی کو سفرِ آخرت پر روانہ ہونے سے پہلے شازیہ کا چہرہ اتنا معصوم، پرنور اور خوبصورت لگ رہا تھا
کہ میں بیان نہیں کر سکتی۔ میری آپ سب سے درخواست ہے کہ شازیہ کے لیے نوافل، درود شریف، قرآن پاک پڑھ کر دعا
کریں اور اس کے امی ابو، بہن بھائی، طارق بھائی، تیمور، عروشہ اور ہم سب کے لیے صبر کی دعا کریں۔

شازیہ کے ساتھ میری اتنی یادیں وابستہ ہیں کہ اگر لکھنا شروع کروں تو صفحوں پہ صفحے بھرتے چلے جائیں۔
اس مضمون کا اختتام چند اشعار سے کر رہی ہوں جو شازیہ نے OCT 97ء میں مجھے ایک کارڈ پر لکھ کر دیے تھے۔
اس نے لکھا تھا۔

پیاری لڑکی!

خدا نہ کرے کہ تیرے بن رہوں میں
یہ دنیا تو کیا ہے کہ جنت نہ لوں میں
تیرے اشک میں اپنی آنکھوں میں بھر لوں
اگر موت آئے تو پہلے مروں میں
یہ جیون تو کیا ہے جو مل جائے مجھ کو
تو یہ چاند سورج بھی صدقے کروں میں

واقعی شازیہ کی پہلے مرنے والی دعا قبول ہو گئی۔ اللہ میری دوست+بہن کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے،
آمین! اس کی قبر کو روشن اور کشادہ کر دے اور وہ وہاں بہت بہت خوش رہے۔ آمین، ثم آمین!

تیری یاد کی کن من

فائزہ افتخار

شازیہ، تمہاری اور میری دوستی کا آغاز انہی دنوں میں ہوا تھا ناں۔ یہی تیز ہواؤں، گرم دوپہروں، ٹھنڈی راتوں اور
بھیگی شاموں والے موسم میں۔ بارش تمہیں کتنی پسند تھی۔ اس سال بھی ساون آئے گا۔ برسے گا۔ اگلے سال بھی۔ اس سے اگلے
سال بھی، ہر سال، مگر تم...... آہ شازیہ، تم نہ ہو گی، نہ بارش کی رم جھم دیکھنے کے لیے، نہ اس کی کن من سے ہتھیلیاں بھگونے کے
لیے...... مگر میں یہ ضرور کہہ سکتی ہوں شازیہ کہ تم رہو نہ رہو، آؤ نہ آؤ، تمہاری یاد ہمیشہ ہم سب کے دلوں میں جل تھل پیدا کیے رکھے
گی۔ ہمارے دلوں کی مٹی ہمیشہ تمہاری یادوں کے سہارے نم رہے گی۔

پیاری شازیہ، اتنا تو بتا جاتیں کہ میں اس کارڈ کا کیا کروں؟ یاد ہے جب محض تمہیں چڑانے کے لیے میں نے
پاکیزہ میں ایک خط لکھ کر تمہیں باجی اور سینئر محترم بزرگ رائٹر کہہ کر چڑایا تھا۔ اس سے چند ہی روز قبل میں نے تمہیں بڑا
خوبصورت سا برتھ ڈے کارڈ بھی ارسال کیا تھا۔ تم اس خط کے بعد فون پہ مجھ پہ کتنا برسی تھیں اور اگلے آنے والے ہر خط میں تم نے
مجھے "اے میری بڑی عمر کی سہیلی" کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ ابھی تمہاری برتھ ڈے یعنی بارہ اکتوبر کو گزرے زیادہ عرصہ نہ ہوا تھا کہ
تمہارے ساتھ اسلام آباد میں "سعید بک بینک" میں کارڈز دیکھتے ہوئے اکیس دسمبر کی سرد ترین رات میں تم نے میرے اور میں

نے تمہارے لیے ایک دوسرے سے چھپا کر کارڈ خریدا تھا۔ تم نے تو تین دن بعد ہی پچیس دسمبر کو میری ویڈنگ اینی ورسری کارڈ بھیج دیا تھا مگر مجھے اس کارڈ کے بھیجنے کے لیے اگلی بارہ اکتوبر کا انتظار کرنا تھا۔ وہ کارڈ آج بھی میرے دراز میں پڑا ہے۔ کارڈ جس میں ایک جھریوں والے چہرے والی، سفید برف سے بالوں والی عورت ایک ایسا برتھ ڈے کیک کاٹ رہی ہے جس ایک سو ایک موم بتیاں روشن تھیں۔ شازیہ...... کاش میں نے وہ کارڈ پہلے خریدا ہوتا، تمہیں اسی برتھ ڈے پہ دے دیتی۔ شاید خ کو یہ شرارت بھا جاتی اور تقدیر تمہاری عمر میں مزید بہتر سال ڈال دیتی۔ بھلے تم کتنا ہی چلاتیں، مجھ سے کتنا ہی جھگڑتیں۔ شاز بتاؤ اب میں اس کارڈ کا کیا کروں؟ ساون کی طرح بارہ اکتوبر بھی ہر سال آئے گی مگر اب میں پہلے کی طرح ٹھیک بارہ بجے تمہ فون پہ وش نہیں کرسکوں گی۔ تم نے تو اس سال گرمیوں کی چھٹیوں میں لاہور آنے کا وعدہ بھی کیا تھا۔ اب بتاؤ میں ان پروگرا کیا کروں جو تمہارے اس وعدے کی آس میں میں نے وقت سے پہلے ہی ترتیب دے ڈالے تھے۔

مجھے چھوڑو، تم نے تو طارق بھائی کا بھی نہ سوچا۔ جن کے بارے میں تم نے خود کہا تھا، فائزہ جتنا پیار میں اپنے شو کو کرتی ہوں، وہ اس کا نصف بھی نہیں جتنا طارق مجھے کرتے ہیں۔ تم نے تو تیمور کے لیے اسکول کا نام تک سوچ رکھا تھا، ا آخری خط میں تم نے یہی ذکر کیا تھا اور عروشہ...... یار انتظار کر لیتیں، اس کے بال لمبے ہونے میں بھلا کتنا وقت لگنا تھا۔ تم نے ا کی پونیاں دیکھ کر کہا تھا "پتا نہیں کب عروشہ کے بال اتنے لمبے ہوں گے کہ میں اس کے رنگ برنگے کلپ اور پونی ٹیلز بناؤں گی۔" تب عروشہ صرف پانچ ماہ کی تھی۔ پچھلے ہفتے انکل سے بات ہوئی۔ بڑے ہی آزردہ لہجے میں انہوں نے کہا تھا:

"عروشہ پہلے بھی شازیہ جیسی لگتی تھی، اب ہو بہو اس کی کاپی ہوتی جارہی ہے۔ اس کی صورت میں شازیہ ہمیں ہمارے پاس رہے گی۔"

اور آنٹی، کتنے حسرت بھرے انداز میں انہوں نے کہا تھا۔ "شازیہ تو ایک بار مری ہے بیٹا، لیکن تمہاری آنٹی روز مرے گی جب بچے اپنی ماں کے بارے میں پوچھیں گے۔"

آنکھیں بھیگ جاتی ہیں

زاہدہ پروین

جون کا پاکیزہ خرید کر میں نے بقایا لوٹانے تک حسب عادت پاکیزہ کے اوراق الٹ پلٹ کر دیکھنے چاہے اور... یہی وہ وقت تھا جب میری بے عینک کی آنکھیں ساکت ہو کر رہ گئیں۔ انجم نے لکھا تھا "آہ...... شازیہ چوہدری......!"

لمحہ بھر کو تو میری سوچ سمجھ ہی جاتی رہی۔ میں نے نظریں گاڑ گاڑ کر پڑھنا چاہا مگر چشمے کے بغیر ایک سطر بھی نہ پڑ جاسکی۔ خریداری کرنے والے افراد کے درمیان مزید بلا سبب کھڑے رہنا ممکن نہ تھا مگر دھڑ دھڑاتا ہوا سینہ ناخوشگوار دھڑکنوں آماجگاہ بن چکا تھا۔ چھٹی حس چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی، "کوئی بچھڑ چکا" مگر خوش گمانی ہر بار اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیتی تھی۔ اس شدت سے احساس ہوا کہ بغیر عینک کے بھی انسان کتنا بے بس ہوتا ہے۔ آنکھوں کے سامنے ایک ہی سرخی گھوم رہی تھی "آہ... شازیہ چوہدری......!"

حالانکہ میں ہمیشہ کی طرح چھوٹے موٹے سودے سلف کی خاصی طویل فہرست لے گئی تھی مگر دل پر ایک ہول طاری ہو چکا تھا۔ طبیعت ہر طرف سے اچاٹ ہو رہی تھی۔ چنانچہ میں جلد ہی رکشا کر کے گھر چل دی۔

اتفاق سے گھر میں دو مہمان خواتین آئی بیٹھی تھیں۔ میں نے اڑے اڑے احساسات کے ساتھ بمشکل ان حال احوال لیا۔ مزاج پرسی کی۔ انہیں آئے ہوئے خاصی دیر ہو چکی تھی۔ بچوں نے خاطر تواضع کر دی تھی۔ وہ فوراً ہی پھر آ وعدہ کر کے چلی گئیں تو میری وحشت میں قدرے کمی آئی۔ دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا لیکن...... دروازے سے کمرے پہنچنا مشکل ہو گیا۔ میری بڑی بیٹی چلا چلا کر پکار رہی تھی۔ شدتِ غم سے اس کی آواز پھٹ رہی تھی۔

"امی امی......! جلدی آئیے...... دوڑ کر آئیے...... یہ...... یہ...... یہ دیکھیے کیا ہو گیا......"

مجھ سے پہلے پورا گھر ہی اس کی پکار پر دوڑ پڑا۔

وہ پاکیزہ کھولے وہی صفحات پھٹی پھٹی آنکھوں سے تکے جا رہی تھی جنہوں نے بازار سے یہاں تک میرے ہوش اڑا ڈالے تھے۔

پاکیزہ وہ واحد ماہنامہ ہے جسے میں نے اس کی اشاعت کے پہلے رسالے سے آج تک کبھی بھی اپنی زندگی سے خارج نہیں ہونے دیا، جس عمر سے خود پڑھنا شروع کیا تھا، آج ماشاءاللہ اسی عمر میں میری اولادیں بصد شوق پڑھ رہی ہیں۔ خدا کا شکر ہے پاکیزہ کے اعلیٰ معیار نے کبھی کسی دور میں بھی کسی ماں کے اعتماد کو ٹھوکر نہیں لگنے دی۔

تھوڑی دیر گم صم رہنے کے بعد ہم سب ماں بیٹی تڑپ تڑپ کر، پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھیں۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ہماری کوئی قریب ترین، عزیز ترین محبوب ہستی ہم سے اچانک بچھڑ گئی تھی۔ جس سے دوبارہ ملنے کا اب دور دور تک کوئی امکان نظر نہیں آ رہا تھا۔ نظروں کے سامنے اس کی ہنستی مسکراتی خوبصورت تصویریں بکھری پڑی تھیں۔ دل و نظر کو کسی صورت یقین نہ آ رہا تھا کہ یہ من موہنی حسین صورت اور دلربا سراپا مٹی کی منوں تہوں میں دفن ہو چکا اور اس باغِ ہستی کی چہکاریں مارتی ہر لمحہ کوکتی بلبل راہیِ ملکِ عدم ہو چکی ہے۔ کسی قدر ناقابلِ یقین اور خوفناک حقیقت تھی کہ شازیہ چوہدری کو موت کا ظالم پنجہ آنِ واحد میں اس کے پیاروں سے چھین لے گیا۔ اس کی حادثاتی موت ایک زبردست دھچکا بن کر دل پر لگی ہے۔ اس افسوس ناک خبر نے یقیناً ہر کسی کا کلیجا نوچ لیا ہو گا تو پھر خاص اس کے گھر والوں کا کیا حال ہوا ہو گا؟ سچ کہا انجم نے کہ "ابھی تو اس کے بچے بہت کم سن اور چھوٹے ہیں۔ ابھی تو اس نے ان کے دل بھر کے لاڈ بھی نہ اٹھائے ہوں گے۔"

معصوم تیمور اور عروشہ کی آنکھیں اب تا حیات ماں کو ڈھونڈیں گی۔

تا حشر تیرے سائے کو ترسیں گی نگاہیں
یوں تجھ سے بچھڑنے کا نہ تھا وہم و گمان بھی

یہ المناک جدائی اور سانحہ عظیم معمولی نہیں ہے۔ بے شک اس صدمۂ جانکاہ نے اس کے دلی اور خونی رشتوں کو نچوڑ ڈالا ہو گا۔ اے خدا! تو ان سب پر اپنی خصوصی رحمتوں اور عنایتوں کا سایہ ڈال۔ ان کے جان و تن میں وہ توانائی اور حوصلہ ڈال دے، جو اس عظیم صدمے کو تیری رضا اور مصلحت جان کر بہ آسانی جھیل جائیں، آمین! اے رب العزت! اس کے تمام عزیزوں کو صبر جمیل عطا فرما اور جنت میں شازیہ کے درجات بلند فرما۔ ہر چھوٹے بڑے گناہ سے اس کی مغفرت فرما، آمین! اس کی قبر پر رحمتوں کا مینہ برسا اور اپنے محبوبؐ کے واسطے سے وہاں آسانیاں مہیا فرما...... آمین!

بے پناہ صلاحیتوں کی مالک

ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی

اگر صدمے والی خبر اچانک ملے تو میری آنکھ کے آنسو خشک ہو جاتے ہیں۔ میں یک دم خاموش ہو جاتی ہوں۔ شازیہ چوہدری کی حادثاتی وفات کی خبر ایسی ہی اچانک تھی جسے پڑھ کر میں پتھر کی بن گئی۔ بہت دیر تک عجیب عجیب طرح کے خیالات آتے رہے۔ ہر انسان کا انجام یہی ہونا ہے کسی کا جلد کسی کا دیر سے۔ موت کو اتنے نزدیک سے دیکھتے ہیں مگر بے خبر رہتے ہیں۔ بے شک موت برحق ہے مگر بے وقت کی موت، جواں مرگ ایک عظیم سانحہ ہوتی ہے۔ معصوم بچوں سے ماں بچھڑ جائے تو اس کی کمی تا حیات پوری نہیں ہوتی۔ مجھے رہ رہ کر شازیہ کے معصوم بچوں کا خیال آ رہا ہے مگر انسان بے بس ہے۔ اللہ تعالیٰ کے حکم کے آگے سر جھکانے اور راضی بہ رضا رہنے پر مجبور۔ کسی کے بچھڑ جانے کے بعد اس کے لیے اپنے تاثرات لکھنا بے حد مشکل ہوتا ہے۔ ذہن پر صدمے کے اثرات ہوتے ہیں۔ الفاظ کہیں گم ہو جاتے ہیں۔ میرا بھی یہی حال ہے۔ یوں لگتا ہے کچھ بھی لکھنے کی صلاحیت ختم ہو گئی ہے۔ شازیہ اچھا لکھتی تھی، زیادہ لکھتی تھی۔ اگر زندگی باقی رہتی تو وہ نہ جانے کتنا اور لکھتی اور یقیناً اس کی تحریروں میں نکھار آ جاتا۔ اس کی اکثر تحریروں سے اختلاف رکھنے کے باوجود میں یہ یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ وہ بے پناہ

صلاحیتوں کی مالک تھی۔ اگر زندگی نے وفا کی ہوتی تو بہت سارے تجربات سے گزر کر کندن بن جاتے۔

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ شازیہ کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین، ثم آمین

بھرپور لکھا......!

شیریں حیدر

کس قدر جانکاہ حادثہ تھا کہ جو اتنی پیاری رائٹر، ایک بیٹی، ماں، بہن اور بیوی...... کتنا کچھ اپنے ساتھ لے گ
شازیہ تو ہمارے درمیان اپنی تحریروں کے باعث رہے گی لیکن جو خلا اس کے خاندان میں اس کے جانے سے پیدا ہوا ہے
شاید اس کی تحریریں پر نہ کر سکیں گی۔

بالکل درست کہا انجم جی! اسے سب کام جلدی جلدی نمٹانے کی جلدی تھی۔ اسی لیے شاید اس نے جلدی جل
لیکن بھرپور لکھا......اور اپنی تحریریں چھوڑ کر چل دی۔

اللہ تعالیٰ سے ہم سوائے اس کے اہل وعیال کے لیے صبر اور حوصلے کی دعا کے کیا مانگ سکتے ہیں۔ اس کی مغفر
اور بخشش کے لیے دعا گو ہیں، اگر اس کے والدین حیات ہیں تو ان کے لیے یہ جواں مرگی سب سے بڑا سانحہ ہے۔ اللہ تو
انہیں بھی صبر اور سکون عطا فرمائے!

شازیہ چوہدری کے نام کھلا خط

تحریر: پروفیسر سیما سراج

سنو شازیہ! کیسی ہو؟ مجھے یقین ہے کہ اس وقت جہاں بھی ہو اچھی ہو۔ اچھے لوگ جس مقام پر بھی ہوں ہمیشہ ا
رہتے ہیں۔ پرسکون اور مطمئن۔ مگر ایک بات بتاؤ، کیا تمہیں خیال نہیں آتا کہ جن لوگوں کے درمیان سے یوں اچانک تم ایک
دیکھی منزل کی سمت روانہ ہو گئی ہو وہ بھری محفل میں کس قدر تنہا ہو گئے ہیں۔ زندگی کی تمام رنگینیوں کے باوجود وہ کس قدر تنہا
کمی محسوس کر رہے ہیں۔ شاید تمہیں اندازہ نہ تھا کہ تم ہمارے لیے کتنی اہم ہو۔ ہاں اہمیت کا اندازہ تو اس وقت ہوتا ہے جب ک
ہم سے بہت دور چلا جاتا ہے۔ ذرا بتاؤ تو سہی کیسی جگہ ہے، جہاں سے لوٹ کر آنے کو کسی کا دل ہی نہیں چاہتا۔ تمہیں اپنا ہم
بچے اور ہم سب یاد نہیں آتے۔ دیکھو ہمیں تو آج بھی انتظار ہے۔ شاید تم چپکے سے لوٹ آؤ اور انجم کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر کہو
انجم میں واپس لوٹ آئی ہوں، ایک نئی کہانی کے ساتھ۔

کہانیاں لکھنے کے باوجود میں آج تک کہانی کو سمجھ نہ سکی۔ کبھی کہانی طویل ہوتی چلی جاتی ہے اور کبھی انتہائی مختص
کبھی ادھوری اور کبھی مکمل آخری کہانی لکھتے وقت تو تمہیں بھی پتا نہ ہوگا کہ تمہاری کہانی اچانک ایک حادثے پر ختم ہو جائے گ
حادثے کو پتا نہ ہوگا کہ اس نے ایک تخلیق کار کو نگل لیا۔ ایک ایسے نسوانی کردار کو جو کہ اپنے عہد کی سچائیاں رقم کر رہی تھی۔

دیکھو شازیہ کتنی عجیب بات ہے کہ بہت سے لوگوں کے ہم عمر بھر قریب رہتے ہیں لیکن پھر بھی انہیں ہم نہیں جا
اپنی تمام تر کوشش کے باوجود اور بعض لوگوں سے ہم کبھی بھی ملے نہیں ہوتے لیکن پھر بھی وہ ہمارے بہت قریب ہوتے ہیں
بھی تو ان ہی میں سے ہو۔ تمہارے تخلیق کردہ کردار اور موضوعات تمہاری منفرد پہچان ٹھہرے۔ تمہاری لکھی ہوئی خوبصور
کہانیاں تمہارا تعارف تھیں۔ تمہاری تخلیقات ایک ایسا آئینہ تھیں جن میں تمہارا چہرہ انتہائی شفاف اور واضح نظر آتا تھا۔

دلہن نمبر میں تمہارے روپ نے مجھے اداس کر دیا۔ میں نے تمہاری تصویر دیکھی۔ اس لمحے کی تصویر جس کا خواب
لڑکی اپنی آنکھوں میں سجاتی ہے۔ سولہ سنگھار، ماتھے پہ ٹیکا، ناک میں نتھ، عروسی جوڑا اور پہلو میں ہم سفر۔ تمہارے چہرے کا

بھرپور نکھار اور مسکراہٹ۔ میری آنکھیں پرآب ہو گئیں اور ہر شے دھندلا گئی۔ سرخ جوڑے میں لپٹی ہوئی لڑکی جب سفید
کفن میں لپیٹ دی گئی ہو گی تو کیسی لگی ہوگی۔ تصور سے میرا وجود کانپ اٹھا۔ کسے صبر آیا ہوگا، کیسے اپنے آپ کو سنبھالا ہوگا۔ کیسے
تمہیں الوداع کہا ہوگا۔ شاید قیامت اسی کا نام ہے۔ نہ گلہ نہ شکوہ نہ کچھ کہا نہ سنا۔ چپکے سے ہمارے وجود کو ریزہ ریزہ کر کے کوئی چلا
گیا، اپنی نشانیاں چھوڑ کر۔

تم حقیقت سے خواب بن گئی ہو اور اب یہ خواب ہی تمہارے اداس دل کا سہارا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ تم اسی جگہ
چلی گئی ہو جہاں سے کوئی واپس اس دنیا میں نہیں آتا۔ ہمیں یقین ہے کہ ایک دن ہمیں بھی اسی مقام پر واپس لوٹ کر جانا ہے۔
ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے، آمین!

اِک شام بہت کم

رخ چوہدری

بنیادی طور پر خبر کی دو ہی اقسام ہیں۔ خوشی کی خبر یا غمی کی خبر۔ یہ دونوں اپنے اپنے شدید اثرات کے ساتھ انسانی
محسوسات پر اثر انداز ہوتی ہیں اور کچھ خبریں ایسی بھی ہوتی ہیں جو ہماری سماعتوں کو چھوئے بغیر گزر جاتی ہیں۔ یعنی ایسی بھی بے
شمار اچھی بری خبریں ہوتی ہیں جن کو سن کر یوں پس پشت ڈال دیا جاتا ہے گویا ہمیں ان سے سروکار نہ ہو، جن سے ہماری صحت پر
اثر نہ پڑتا ہو۔

لیکن کچھ خبریں ایسی بھی ہوتی ہیں کہ جن کو سنتے ہی ہماری سماعتوں کا روشن آسمان تاریک ہو جاتا ہے۔ ہماری
دھڑکنوں کے ساز یک دم رک جاتے ہیں۔ زبان گنگ ہو جاتی ہے اور آنکھیں اور منہ بے یقینی سی حیرت سے ایسے پھیل
جاتے ہیں گویا کسی جادو نے ہمیں متحرک ہونے سے روک دیا اور ایسی ہی دھماکا خیز خبر ہم گیارہ مئی کو سنتے ہیں جو ہماری سماعتوں کو
مفلوج، زبان گنگ اور دھڑکنوں کو روک دیتی ہے۔ گیارہ مئی کو ملنے والی خبر کہ ہماری پیاری شازیہ چوہدری اب ہم میں نہیں رہیں
کسی قیامت سے کم نہیں تھی یہ خبر۔

ایک روز تقریباً شام ساڑھے پانچ بجے روٹین میں، میں انجم کو فون کرتی ہوں، میرے سلام کے جواب میں ان کا
پہلا جملہ یہ تھا۔

"رخ تم نے شازیہ چوہدری کے بارے میں کچھ سنا......" انجم کے لہجے میں دکھ، افسوس اور پریشانی کو محسوس کر کے
میں بھی پریشان ہو گئی۔

"کیوں انجم خیریت تو ہے ناں......" کسی منحوس خبر کے خوف سے میرا دل رکنے لگا۔

"ارے بھئی شازیہ کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے، وہ کومے میں ہے اور اس کے والدہ کا آفس میں دعا کے لیے فون آیا تھا،
تم بھی دعا کرنا۔"

"اوہو! یہ تو بہت بری خبر ہے۔ اللہ ہماری شازیہ کو زندگی عطا فرمائے۔"

میں نے صدق دل سے دعا کی پھر انجم اور میں کتنی دیر تک شازیہ کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ اس کے لیے
دعا کرتے رہے پھر عصر کی نماز پڑھی۔ شازیہ کے لیے شدت سے دعائیں کیں، نفل پڑھے۔ میں نے سجدے میں گڑگڑا کر دعا کی
کہ پروردگار بس کسی طرح بھی سہی شازیہ واپس لوٹا دے۔ میں فطری طور پر بہت حساس ہوں مگر امی کے جانے کے بعد سے تو
میں ذرا سا دکھ بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ ماں زندگی کا وہ کردار ہے جس کے بغیر اولاد خواہ کسی عمر کی ہو خوش نہیں رہ پاتی۔ امی کے
جانے سے جو میری زندگی میں، ہم سب کی زندگی میں خلا پیدا ہوا، جن مصائب اور مسائل کا ہم نے سامنا کیا ان کو سوچتے ہوئے
دل کی ہر دھڑکن شازیہ کے لیے دعا گو تھی جب میں اس کے لیے دعا کر رہی تھی تو مجھے نہ تو وہ بیٹی لگی نہ بہن، نہ بیوی۔ مجھے صرف وہ

اپنے بچوں کی ماں لگ رہی تھی اور ماں بچوں کے لیے کتنی ضروری ہے یہ وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو اس نعمت سے محروم ہ
حال جب تک اس کے چلے جانے کی خبر نہیں آگئی میں ہر ہر لمحہ اس کے لیے دعا کرتی اور کراتی رہی۔ کبھی خیال آتا اس
بچی عروشہ کس طرح ماں کے لمس کو تڑپ رہی ہوگی، یہ احساس دعاؤں میں اور شدت پیدا کردیتا۔ ننھا تیمور درد سے ماں کو
گا۔ آنکھوں میں بڑے بڑے آنسو لیے بارہا اس نے اپنی پیاری مما کی گود میں جانے کی ضد کی ہوگی۔ ماں...... ماں...
پروردگار شازیہ ماں ہے، اسے زندگی عطا فرمادے۔ لیکن کبھی کبھی ہماری دعاؤں کا وقت گزر چکا ہوتا ہے۔ یا ہماری گہرائی
میں شدت کی کمی ہوتی ہے کہ وہ قبولیت کی سند حاصل نہیں کر پاتیں لیکن شاید یہ بات بھی نہیں، شازیہ کے پاس اب سا
نفدی ہی نہیں بچی تھی تب ہی تقریباً بارہ بجے دن میں احتل الصبور کا فون آتا ہے...... "رخ شازیہ تو چلی گئی......" احتل کے
لہجے میں نہ مزید کچھ کہنے کی سکت تھی نہ مجھ میں سننے کی۔ مجھے تو بس اپنی ایک چیخ کی بازگشت سنائی دی۔ میرے ہاتھ
ریسیور بھی میری بھابھی نے لے کر رکھا، جن سے میں شازیہ کے بارے میں پوچھتی رہی۔ وہ مجھے کومے کی اقسام کے بار
بتاتیں کہ یہ تو چوٹ پر منحصر ہے کہ چوٹ کی شدت اور نوعیت کیا ہے۔ اتنا دکھ، اتنا صدمہ کہ بیان سے باہر تھا۔ انجم سے با
ہے وہ غم سے نڈھال ملتی ہیں۔ آہ شازیہ ڈیئر تمہارے چاہنے والوں نے تو دن رات ایک کردیئے، تمہیں دعائیں دیتے
تمہارے پاس وقت ہی کم تھا۔ کس طرح کس زبان سے کہوں شازیہ چوہدری چلی گئی۔

جہاں تک میرا خیال ہے شازیہ مجھ سے کوئی دو تین سال بعد میدان میں آئی...... آئی اور چھا گئی، اس پر اللہ
کرم تھا کہ اپنے قلمی دور کے اس مختصر عرصے میں اس نے اتنا لکھا...... اتنا لکھا کہ حیران کردیا۔ خواتین کے جتنے بھی بڑے
ڈائجسٹ ہیں ہر کسی میں رائٹرز کی فہرست میں ہر ماہ اس کا نام ضرور ہوتا۔ اس نے ہر موضوع پر لکھا اور کھل کر لکھا۔ اسی لیے
افسانے سے آخری افسانے تک تعریف اور تنقید کے چکر میں رہی۔

اس کی تحریر کے بارے میں ہر قاری کی اپنی الگ رائے تھی مگر سب اس بات پر متفق تھے اور ہیں اور رہیں
شازیہ چوہدری بہت ذہین اور قابل رائٹر تھی۔ آہ شازیہ! تم اگر پچاس سال کی زندگی گزار جاتیں تو تمہارے جانے کا تب
ہی دکھ ہوتا مگر اب تو تمہیں "تھی" لکھتے ہوئے دل پر چوٹ پڑتی ہے۔

میں چونکہ شازیہ سے پہلے اس میدان میں رخ چوہدری کے نام سے اتر چکی تھی تو جب شازیہ چوہدری آ
قاری کا یہ سوال ہوتا کہ آیا یہ دونوں بہنیں ہیں۔ ایک عرصے تک تو اس بات کی تردید بھی نہیں ہوئی۔

انجم کا یہ جملہ اسلام آباد کی سڑکیں پروین شاکر اور شازیہ چوہدری کو کھا گئیں تڑپا گیا۔ اب جبکہ میں اپنی ماں
بہن شازیہ جو کہ بائیس سال کی عمر میں 16 دن کا بیٹا چھوڑ کر چلی گئی تھی کے ساتھ جب دعائے مغفرت میں شازیہ چوہدری
لیتی ہوں تو مت پوچھیں کیا حال ہوتا ہے۔

تب میں نے پاکیزہ ہی کے توسط سے اپنے اور اس کے قارئین کو بتایا کہ میرے اور شازیہ کے درمیان صرف
کا رشتہ نہیں بلکہ وہ میری ہم مذہب ہے، ہم وطن ہے اور ہم اہل قلم ہیں، تو جہاں اتنے خوبصورت رشتے ہوں وہاں کسی اور
کی کیا ضرورت ہے۔ وہ اتنی پیاری اور پسندیدہ رائٹر تھی کہ اس سے نام کی نسبت اچھی لگتی تھی مجھے اور سب نے اتنی بار ا
بہن کہا کہ مجھے وہ واقعی بہنوں کی طرح ناہید چوہدری کی طرح عزیز ہوگئی تھی۔

تب ہی تو جب اس کے جانے کی اطلاع ملتی ہے تو بتا نہیں سکتی کہ دل حزین کی کیا حالت ہوئی۔ میرے ز
ہرے ہوگئے ہیں۔ جب امی گئی تھیں تو کیا حالت تھی، ہم سب بہن بھائیوں کی، اتنے بڑے ہو کر ہم پاگل ہوگئے تھے۔ د
کی طرح اندر باہر امی کو تلاش کرتے رہتے تو جب یہ سوچتی ہوں کہ اس کا دو سالہ بیٹا کس طرح دوڑ دوڑ کر ماں کے پاس جا
مچلتا ہوگا، کس طرح اپنی مما سے لپٹ جانا چاہتا ہوگا۔ معصوم عروشہ جس کی حسیات صرف ماں کے لمس کو ہی محسوس کر
صلاحیت رکھتی ہیں۔ معصوم نہ پوچھ سکتی ہے کہ لوگو، میری پیاری مما کہاں ہے، میری مما کو لاؤ میری ممتا کا چشم کیوں ٹھہر گیا۔

بسے میں ان بچوں کو سنبھالنے والے شازیہ کے والدین، بہن بھائی، شوہر عزیز و اقارب کا صدمے سے جو حال ہو رہا ہوگا میں وہ
نظر سوچ سکتی ہوں سمجھ سکتی ہوں مگر اس کی منظر کشی نہیں کرسکتی۔ میں اس داستان الم کو زیر قلم نہیں لاسکتی اس لیے شازیہ ڈیئر معاف
کرنا میں تمہارے لیے کچھ نہیں کہہ پائی۔ تم سے وابستہ کسی ایک رشتے کو بھی نہیں بناہ پائی۔

ہاں چھوڑنا تو پڑتا ہے۔ جب ہمارے خالق و مالک کا حکم آجاتا ہے تو بندے چپ چپ سر جھکائے اللہ کے حکم پر چل
دیتے ہیں۔ اب شازیہ کو ہمارے پاس نہیں آنا، ہم کو اس کے پاس جانا ہے۔ ہم سب کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ جو مراحل شازیہ
طے کرچکی ہمیں طے کرنے ہیں۔ اللہ تعالیٰ شازیہ کو جنت کا بلند ترین مقام عطا فرمائے۔ اس کی مغفرت فرمائے، اس کی کوتاہیں
سے درگزر فرمائے اور اس کی اس ناگہانی جدائی کا صدمہ اس کے والدین کے ساتھ ہم سب کو بھی صبر جمیل عطا فرمائے، آمین!

جسم کا ٹکڑا جدا ہوگیا

شمیم فضل خالق

پاکیزہ کا شمارہ ملا۔ شازیہ چوہدری کی رحلت نے تو میرے ہوش و حواس چھین لیے۔ میں بری طرح ڈسٹرب ہوگئی
اور میرے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔ شازیہ کے ساتھ میرا کوئی رابطہ نہیں تھا، کوئی ہیلو ہائے نہیں تھی لیکن اس کی وفات سے مجھے یوں
لگ رہا تھا جیسے مجھ سے میرا کوئی عزیز ترین بندہ بچھڑ گیا ہو، جیسے میرے جسم سے کوئی ٹکڑا جدا ہوگیا ہو۔ انجم، کیا یہ قلمی رشتہ اتنا
مضبوط ہوتا ہے کہ اپنوں سے زیادہ اپنائیت محسوس کرتے ہیں قلم کار ایک دوسرے کے ساتھ۔

میں شازیہ چوہدری کی تحریریں بہت شوق سے پڑھتی تھی۔ نکھر گئے ہیں گلاب سارے کا انتظار میں پورا مہینہ کرتی
تھی۔ خدا اپنے کاموں کو بہتر جانتا ہے لیکن شازیہ چوہدری کی عمر اتنی جلدی جانے کی نہیں تھی۔ میں سمجھتی ہوں کہ شازیہ چوہدری
کی وفات ایسا خلا ہے جو کبھی پر نہیں ہوسکے گا۔ یہ نقصان ہم سب مل کر بھی پورا نہیں کرسکیں گے۔ ہائے موت...... تو کتنی بے رحم
ہے۔ یقین کرو انجم، میں نے پاکیزہ بالکل بھی ہاتھ میں نہیں لیا۔ بس اتفاق ہی تھا کہ بڑے شوق سے رسالہ کھولا تو سب سے پہلے
آہ شازیہ چوہدری پر نظر پڑی پھر میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔ میں تھر تھر کانپنے لگی۔ بیٹی نے حیرت سے میری طرف دیکھا لیکن
میں اپنے حواس میں نہیں تھی۔ اس کے بعد میں نے رسالہ ہاتھ میں نہیں لیا اور آپ کو بے حد درد اور کرب کے عالم میں یہ خط لکھ
رہی ہوں کہ کچھ درد بانٹے نہیں جاتے اور شازیہ چوہدری کا درد ایسا ہی درد ہے۔

انجم! شازیہ چوہدری نمبر نکال کر آپ ہم سب پر احسان کررہی ہیں۔ خدا آپ کو ہمیشہ خوش رکھے کہ اس طرح دکھے
دلوں پر جیسے مرہم سا لگ جائے گا کہ ہم جانے والوں کو تو واپس نہیں بلاسکتے لیکن ان کی خدمت پر انہیں خراج تحسین تو پیش کرسکتے
ہیں۔ مجھے تو یقین ہی نہیں آتا کہ چھوٹی سی شازیہ، اتنی بڑی بڑی تحریریں لکھنے والی شازیہ سچ مچ ہمیں چھوڑ کر چلی گئی ہے۔ مجھے
بتائیں کیا آپ کو اس کا یقین ہے؟

وہ آئی، اس نے فتح کیا اور وہ چلی گئی

حمیرا راحت

زندگی بے شک ختم ہوجانے والا افسانہ ہے لیکن عموماً ہر افسانہ کسی نہ کسی منطقی انجام تک پہنچتا ہے۔ شازیہ چوہدری
کی زندگی کا فسانہ یوں اچانک ادھورا رہ جائے گا یہ تو کسی نے سوچا بھی نہ تھا لیکن کبھی کبھی ہم جن حادثوں کا تصور خواب میں بھی
نہیں کرتے، وہ عمل پذیر ہوجاتے ہیں۔ شازیہ کی موت بھی ایک ایسا ہی حادثہ ہے۔ جس پر ابھی تک یقین نہیں آتا۔ مجھے زہرہ
جنید نے فون پر بتایا تو میں ہکا بکا رہ گئی۔ ایک لمحے کو شبہ ہوا کہ شاید سماعت نے صحیح کام نہیں کیا۔ شاید یہ...... شاید وہ...... لیکن
حقیقت سفاک تھی۔ شازیہ کو گزرے کئی دن ہوچکے تھے جب مجھے خبر ملی اور کیسی المناک خبر۔ اس کا معصوم سا چہرہ میری آنکھوں
کے سامنے گھوم رہا ہے۔ اگرچہ میں اس سے کبھی نہیں ملی لیکن ہم قلم کاروں کے دل کبھی نہ ملنے کبھی نہ بات کرنے کے باوجود ایک

ساتھ دھڑکتے ہیں۔ ابھی کچھ ہی دن پہلے تو نوجوان افسانہ نگار اور تبصرہ نگار ہوا خامان کی المناک موت ہوئی ہے اور پھر یہ
سانحہ......

بہر حال اس موقع پر شازیہ کے لواحقین اور پرستاروں سے صبر کی تلقین اور اس کی مغفرت کی دعا کے علاوہ کیا کہا
سکتا ہے۔ یہ جو کچھ لکھا ہے یہ کافی نہیں، میرے پاس کہنے کے لیے بہت کچھ ہے لیکن پہلے مجھے شازیہ کی موت کا یقین
جائے۔

یہ موت بھی کتنی سنگدل ہے
کہ جس نے دو ایسے ہاتھوں سے
روح کھینچ لی ہے کہ جو قلم کا وقار تھے
اور حرف کا مان بن گئے تھے
جو لفظ کی حرمتوں کے ضامن تھے
صدق کی گہری گھاٹیوں میں
شمع جلاتے ہوئے وہ دو ہاتھ گر گئے ہیں
وجود اس کا ہماری نظروں سے
گو کہ اوجھل ہوا ہے لیکن
دلوں میں سچائی بن کے اب بھی دھڑک رہا ہے

میں کیا کہوں گی......!

عطیہ عمر

پاکیزہ کے آفس سے شازیہ چوہدری کے انتقال کی خبر ملی تو مجھے یقین نہ آیا۔ سوچا سننے میں غلطی ہوئی ہو۔ دوبارہ
کیا تو معلوم ہوا، یہ تو سچ ہے......

انجم باجی کو فون کرنا چاہا مگر چند نمبر پش کر کے ٹیلی فون آف کر دیا۔

میں کیا کہوں گی، وہ کیا جواب دیں گی......

انسان یقیناً مجبور محض ہے۔ اس مالک کائنات، خالق کون ومکاں کی مصلحتیں وہی جان سکتا ہے۔

میرے آنسو بہتے رہے اور میں اس کی مغفرت کی دعا کرتی رہی۔

انسان اور اس کی منصوبہ بندیاں......سب عارضی سب ناپائیدار۔

شازیہ کے بچوں کا غم سب سے بڑا ہے۔ وہ تو اس ناقابل تلافی نقصان کا صحیح سے ادراک بھی نہیں کر سکتے۔

اس کی ماں کی نظروں میں تو ابھی بھی پہلا قدم دھرتی منی سی شازیہ ہوگی۔ کبھی دلہن بنی شازیہ دل کے دریچوں سے
جھانکتی ہوگی، تو کبھی انہیں نانی کے منصب پہ فائز کرنے والی منے سے بچوں کی ماں شازیہ اپنی ذمے داریاں ادا کرتی نظر آتی ہوگی۔
باپ کا حال بھی ایسا ہی ہوگا۔ بہن بھائی کے آنسو اور یادیں ہر لمحہ انہیں گھیرے رکھتے ہوں گے۔

اور اس کے شریک حیات، جن کی زندگی کا ساتھی انہیں راستے میں چھوڑ گیا......اور ہم سب جو شازیہ کی تحریروں کے
حوالے سے اسے خود سے بہت قریب سمجھتے ہیں۔

ہم سب کچھ نہیں کر سکتے، سوائے اس کے کہ اس کے لیے دعائے مغفرت کریں۔

شازیہ کے والدین، بہن بھائی، شوہر اور دیگر عزیز واقارب! ان سب سے رسمی تعزیتی الفاظ نہیں کہنا چاہتی۔

آپ سب کا صدمہ بہت بڑا ہے مگر ہم سب مسلمان ہیں۔ الحمدللہ! شازیہ بھی مسلمان تھی۔ ہمارا عقیدہ یہی ہے کہ دنیا کی زندگی
رضی ہے۔ ہم سب نے اپنے اپنے مقررہ وقت پر یہ عارضی ٹھکانا چھوڑ کر جانا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ شازیہ کی
لحد کشادہ کردے۔ ایمان کا نور اس کے ساتھ رہے۔ اس کی دائمی زندگی اللہ کی رحمتوں اور نعمتوں سے بھرپور ہو۔ آمین ثم آمین!

اِک تمہارے جانے سے!

عظمیٰ آفاق

تمہیں مرحوم لکھوں تو دل میرا خون ہوتا ہے
ارے ایسی جوانی میں بھلا ایسا بھی ہوتا ہے

شازیہ چوہدری کی جدائی بڑی شاق گزری ہے۔ ایسی خوبصورت رائٹر، جس کی تحریریں پڑھنے سے دل کھل سا
جائے......وہ یکدم چلی گئی!

اس کے بچوں کا خیال آتا ہے تو دل میں ایک ہوک سی اٹھی ہے اور یہ دعا لبوں پر آ جاتی ہے۔
"خدایا، سب کی ماؤں کو سلامت رکھنا۔" ماں کی ضرورت تو بچوں کو ایک ایک قدم پر پڑتی ہے۔

آنکھوں میں اُمڈتے ہیں تو رکتے نہیں آنسو
پلکوں میں کہیں درد کا دریا تو نہیں ہے

شازیہ کے بچوں کے ساتھ ساتھ مجھے شازیہ کے والدین کا خیال آتا ہے کہ یہ سانحہ کس قیامت کا تھا، کیسے اپنے
آپ کو انہوں نے سنبھالا ہوگا۔ اب تو یہی دعا ہے کہ بچوں کے نانا، نانی، دادا، دادی، خالہ، ماموں، پھوپھیوں اور چچاؤں کو
سلامت رکھنا جو بن ماں کے بچوں کا مان اٹھا سکیں۔

شازیہ کا نام، اس کی تحریروں کی صورت میں انشاء اللہ ہمیشہ زندہ رہے گا اور ہم سب اس کو دعاؤں کے تحفے ہمیشہ
بھیجتے رہیں گے۔

یارب الکریم! ہماری پیاری رائٹر شازیہ چوہدری کی قبر گوشہ گوشہ منور رکھنا اور اس جہاں میں، قدم قدم پر اس کے لیے
آسانیاں کرنا۔ اس کی مغفرت کرنا۔ آمین، یارب العالمین۔

میری دوست

صدف حمید

شازیہ چوہدری! یہ نام ذہن ودل کے پردے پر چھاتے ہی جو عکس ان آنکھوں میں آسماتا ہے، وہ ہے ایک زندگی
سے بھرپور، شوخ وشنگ، کھنکتے ہوئے خوبصورت لہجے اور مسکراتے چہرے کی مالکہ کا سفید یونیفارم پر پیلے ربن لگے، دوپٹے کو
شانوں پر پھیلائے (جیسے اس کی کہانیوں کی ہیروئن پھیلاتی ہے) بالوں کو کبھی بینڈ میں جکڑے کبھی کھلا چھوڑے اونچی سی ہیل
والے جوتے پہنے، اِدھر اُدھر مگن پھرتی ہوئی۔ جب کبھی کالج کے کوریڈور میں آمنا سامنا ہوا تو "کیا حال ہے صف! یار، میری نئی
کہانی پہ کوئی تازہ تازہ تبصرہ ہو جائے" کہتی ہوئی شازیہ چوہدری۔

شازیہ چوہدری سے ان کی تحریر کے طفیل تو تعارف 1995ء سے ہو ہی چکا تھا مگر باضابطہ تعارف کیسے ہوا، آپ یقیناً
جان کر محظوظ ہوں گی۔ وہ ستمبر 97ء کی کوئی چمکیلی صبح ہوگی، جب میں اپنے والد کے ساتھ اپنے کالج پہنچی جہاں میری ایم ایس سی
اپلائڈ سائیکالوجی کی کلاسز کا آغاز ہونے والا تھا۔

بی ایس سی بھی وہیں سے کرنے کی وجہ سے کالج سے تو واقفیت تھی ہی دو تین فرینڈز بھی وہی بی ایس سی والی ہی تھیں
اور ہم سب میں نوٹس بورڈ کے سامنے کھڑے اپنی نئی کلاس فیلوز کا انتظار کر رہے تھے۔ جب ایک نسبتاً کم قد والی دبلی سی اونچی ہیل

پہنے لڑکی آئی اور پاس کھڑی ہوگئی اور لسٹ میں سے نام دیکھنے لگی چہرے پر قدرے نروس نیس تھی۔ خدمت خلق کے جذبے ہی کالج ہونے کے فخر سے سرشار میں نے فوراً پیش قدمی کی اور پوچھا تو پتا چلا کہ ہماری ہی کلاس میں یعنی پری پولیس میں ان کا ایڈمیشن ہوا ہے اور کالج بھی نیا ہے اور نام ہے "شازیہ" شازیہ تو لسٹ میں کئی تھیں لہٰذا شک کی تو گنجائش نہ تھی۔ فوراً ہی دوستی کی اور ہر ممکن مدد کی آفر دے دی۔ جو بصد تشکر قبول کر لی گئی۔ میرا نام پوچھا اور جان کر بولیں۔ آپ کا انٹرویو تو نہیں پاکیزہ میں؟ میں نے اقرار کیا تو لگی تعریف کرنے حالانکہ نہ میں رائٹر ہوں نہ بہت ہی ایکٹیو تبصرہ نگار، بس ایک آدھ نظم چھپنے اور چند تبصروں کے بعد ایوارڈ سے نوازے جانے کی وجہ سے پاکیزہ بہنوں میں تھوڑی نمایاں تھی۔ شازیہ کے منہ سے مجھے ٹھٹکا گئی۔ ساتھ شکل بھی تھوڑی یاد آ گئی۔ میں نے فوراً نام پوچھا اور سن حیرت اور خوشی کے مارے ساکت رہ گئی۔ حیرت اس لیے کہ اتنی اچھی رائٹر اور میری تعریف اور خوشی اس لیے کہ میری تو وہ بہت پسندیدہ تھیں۔ خیر فخر سے تنی گردن، کچھ اور تن گئی جب پتا چلا کہ وہ میری کلاس فیلو ہوں گی۔ پہلی کلاس شروع ہوئی۔ میں نے بصد شوق اپنے ساتھ نشست دلوائی جیسے یہ ٹیچر کلاس میں داخل ہوئیں۔ شازیہ کے چہرے پر بے چینی سی نظر آنے لگی اور جیسے ہی ٹیچر کے منہ سے نکلا۔ "آپ یہاں کیا کر رہی ہیں؟ فائنل ایئر! تو میں نے شازیہ کو آناً فاناً وہاں سے رفو چکر ہوتے دیکھا اور جب ٹیچر نے ہم سے استفسار کیا کہ کوئی قیمتی مگر نایاب چیز دلانے کے یا نوٹس کے بہانے کوئی رقم تو نہیں اینٹھ لی انہوں نے تو ہم نے نفی میں سر ہلا دیا اور اپنے فول بنائے جانے پر شرمندہ ہوئے۔ پیریڈ ختم ہونے پر پوری فائنل ایئر نے دھاوا بول دیا اور شازیہ ہمارے گروپ کو منانے لگیں کہ زیادہ فول تو وہ بنے تھے۔ تب سے ایسی دوستی ہوئی کہ کیا بتاؤں۔ میری طرف سے جوش زیادہ تھا کہ وہ میری فیورٹ رائٹر جو تھیں۔

شازیہ بے حد زندہ دل تھیں۔ بہت پر جوش اور زندگی کے تمام تر تقاضوں کو نبھانے والی۔ بے حد پر اعتماد، ان کی ذات سے اور ان کی تحریروں سے میں نے بہت کچھ سیکھا مگر دو چیزیں بہت زیادہ لیں، ایک بلا کا اعتماد اپنی ذات شخصیت اور اپنی صلاحیتوں پر اور دوسرے "یار" کہنے کی عادت۔ ان کا فائنل ایئر اور میرا پری پولیس اکٹھے گزرا، اس کے بعد فون کے ذریعے کافی عرصہ تک دوستی رہی۔ میں جب کوئی ایسی کہانی یا ناول یا ناول کی قسط پڑھ لیتی، جس پر کسی پوائنٹ پر اختلاف ہوتا تو میں فوراً شازیہ کو فون کرتی اور ڈسکس کرتی۔ اسی طرح کوئی چیز بے حد پسند آتی تو فوراً بتانے کے لیے فون کرتی۔

31 تاریخ کو ہاکر جون کے میگزین دے کر گیا تو اسکول سے دیر ہونے کی وجہ سے میں نے ایسے ہی رکھ دیا۔ واپس آئی تو پہلے پاکیزہ اٹھایا۔ فہرست پر نگاہ ڈالی کہ کس کس رائٹر کی تحریریں ہیں۔ اس دفعہ مگر "آہ! شازیہ چوہدری" پڑھ کر تڑپ کر اٹھ بیٹھی۔ وہ صفحہ کھولا نہیں گیا مجھ سے۔ پانچ منٹ قیاس آرائیاں کرتی رہی کہ شازیہ کو کوئی صدمہ (خدانخواستہ) پہنچا ہو مگر ذہن کہتا کہ آہ! شازیہ چوہدری کا تو کوئی اور ہی مطلب لگ رہا ہے۔ دل نے خوش گمان ہو کے ذہن کو جھڑکا اور صفحہ کھولتے ہی منہ سے چیخ نکلی۔ میں گھر پہ اکیلی تھی۔ مجھ پر دحشت سی طاری ہوگئی۔ سمجھ نہیں آ رہا تھا، کیا کروں؟ تصویر دیکھتی اور روتی جاتی۔ دل چاہتا اونچی اونچی چیخیں ماروں مگر پھر تصویر پر نظر پڑتی اور رونے لگ جاتی۔ اسی کیفیت میں امی کو فون کیا، وہ سنتے ہی رو پڑیں اور ابھی تک عالم یہ ہے کہ بات یاد آتے ہی ذہن و دل ایک لمحے کو ماننے سے انکاری ہو جاتے ہیں۔ کالج کے بعد میری شازیہ سے ملاقات نہیں ہوئی مگر مختلف میگزینز میں ان کے انٹرویوز پڑھنے کو ملتے رہے۔ تیمور اور عروشہ بن دیکھے پیارے لگتے تھے اور اب قدرت کی بے نیازی پر حیران پریشان ہوں کہ مجھے ساڑھے تین سال کے بعد بھی اولاد کی نعمت عطا نہ ہوئی اور شازیہ تین سالوں میں دو پھول سے بچوں کو پا کے دنیا کی اس بے رحم افراتفری میں کیونکر چھوڑ گئی۔ واہ رے قدرت کی مصلحت ہوگی، دس ماہ کی عروشہ سے ماں کی نرم گود چھیننے میں۔ اے اللہ! ان بچوں پر اپنا سایہ اور اپنی رحمت قائم و دائم رکھ (آمین) شازیہ کے شوہر، ماں باپ اور بہن بھائیوں کو صبر جمیل عطا کرنا۔ آمین۔ اے اللہ، شازیہ کی روح کی مغفرت فرما (آمین) اور اسے سکون دینا (آمین) اب اجازت چاہوں گی کہ اتنا کچھ لکھ کر بھی ابھی لگتا ہے کہ جو بات دل میں تھی وہ تو کہہ نہیں پائی ہوں۔"

وہم و گمان بھی نہ تھا

حفصہ نور سید

گمان بھی نہ تھا
وہ اِک شخص
جو جگنوؤں کا دیس تھا
یوں کبھی اچانک
حقیقت سے خیال ہو جائے گا

سات سال......اور سات سالوں کے دو ہزار پانچ سو پچپن دن۔

میرا اور شازیہ چوہدری کا ساتھ رہا مگر اب آج ایسا لگ رہا ہے جیسے یہ ساتھ لمحہ بھر کو کسی خوش رنگ تتلی کی طرح مٹھی میں آیا اور اڑ گیا۔

مسکراتی خوبصورت جذبوں سے بھری محبتیں بکھیرتی وہ لڑکی، وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ایک دن اچانک چپ چاپ ایسے روٹھ جائے گی۔ اتنا بڑا نقصان کر جائے گی ہمارا......

دل یقین کی سیڑھی چڑھنے کو تیار نہیں۔ دماغ نے سوچنا چھوڑ دیا ہے۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ کیونکر ہو سکتا ہے؟

ہنستی مسکراتی وہ لڑکی یکدم کیسے خاموش ہوگئی؟

میں اس وقت حیران پریشان بیٹھی ہوں۔ دل کر رہا ہے دھاڑیں مار مار کر روؤں۔

بھلا کوئی یوں بھی جاتا ہے؟

کوئی یوں بھی روٹھتا ہے؟

ابھی تو بہاروں نے اپنا قدم جمایا بھی نہ تھا۔

یہ خزائیں کہاں سے آن وارد ہوئیں۔

آنسوؤں کی روانی میں کچھ کچھ نہیں آ رہا کہ کیا لکھوں۔

شازیہ چوہدری میری بہن، میری دوست۔ قیامت ٹوٹ پڑی تھی جیسے۔ میں اس وقت کچن میں کھڑی تھی جب مجھے یہ روح فرسا خبر ملی۔ میرے ہاتھ پیر کانپنے لگے۔ دل کیسے بیٹھ جاتا ہے اس بات کا اندازہ مجھے اس وقت ہوا۔ امی میرا دل گھبرا رہا ہے، بڑی مشکل سے یہ الفاظ میرے منہ سے نکلے، کیا ہوا ہے؟ امی پریشان ہوگئیں۔

"شازیہ چوہدری چلی گئیں۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔"

میں نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔

اور آج اس اندوہناک کو ملے تیسرا دن ہے مگر آنسو رکنے کا نام نہیں لے رہے۔ نماز کے بعد دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتی ہوں تو صرف اللہ میرے اللہ کے آگے کوئی لفظ زبان پر آتا ہی نہیں۔

میں، جو شازیہ چوہدری کے لیے کچھ بھی نہیں تھی اور شاید کچھ تھی بھی۔

اس حادثے کے بعد مجھے اندر ہی اندر اپنا آپ سنبھالنا بہت مشکل ہو رہا ہے تو انکل صابر چوہدری کا کیا حال ہوا ہوگا۔ جنہوں نے اپنی چہیتی لاڈلی بیٹی کا جنازہ اپنے کندھوں پر اٹھایا ہوگا۔

اس ماں کا کیا حال ہوا ہوگا جس نے اپنی بیٹی کو پاؤں پاؤں چلنا سکھایا تھا اور پھر اسے چار کندھوں پر سوار ہوتے جاتا دیکھ کر کیسے کیسے کلیجا شق نہ ہوا ہوگا۔

اور کس حوصلے سے ندیم بھائی اور نومی نے اپنی پیاری بہن کی قبر پر مٹی ڈالی ہوگی۔
سعدیہ اب کہاں کہاں کس کس چہرے میں اپنی بہن کو تلاش کرے گی جو اس کی بہت اچھی دوست بھی تھی۔
اور اس شخص کا کیا حال ہوگا؟
جس نے اپنی ٹوٹ کر چاہنے والی محبوب بیوی کی رفاقتوں کے صحیح طرح مزے بھی نہ لیے ہوں گے کہ اسے
ہمیشہ کے لیے جدائی کے جانکاہ صدمے سے گزرنا پڑا۔
طالب علمی کے زمانے سے لے کر شازیہ کے نکاح اور پھر شادی اور پھر شادی پر دلہن بنے ہوئے اور بعد
اور پھر عروشہ کے ساتھ کھینچی گئی شازیہ کی تصویریں میری نظروں کے سامنے بکھری پڑی ہیں۔
اور سمجھ نہیں آرہا کہ کیا لکھوں۔ ایسے چہرے کو بھی مٹی میں مل جانا تھا؟
مگر اس کے یوں چلے جانے سے جو خلا پیدا ہوا ہے وہ شاید کبھی پر نہ ہوسکے گا۔
اور بہت سچائی لکھنے والی آجائیں گی
اور بہت محبت کرنے والی ملیں گی
مگر وہ شازیہ چوہدری نہ ہوگی
اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت کرے، آمین ثم آمین۔
ایک دفعہ پتا نہیں کس رو میں آکر شازیہ چوہدری نے زندگی کے فلسفے کے بارے میں ایک شعر کی صورت
جواب دیا تھا۔

جیو تو ایسے جیو زندگی کو رشک آئے
مرو تو موت کہے کون مر گیا یارو

اور واقعی، میں حیران پریشان ہوں کہ شازیہ کی زندگی ہی نہیں، موت بھی اس ایک شعر کے اندر سمٹ آئی ہے
کی زندگی رشک آمیز زندگی تھی۔ اس کی موت پر موت خود بھی پھوٹ پھوٹ کر روئی ہوگی۔
مگر شازیہ ہمیشہ دلوں میں زندہ رہے گی، انشاءاللہ۔

اشک جاری ہیں

زینب زریں

ابھی کچھ ہی دیر پہلے ہاکر نے مجھے ہر ماہ کی طرح چار ماہنامے لاکر دیئے ہیں۔ سب سے پہلے حسب
"پاکیزہ بہنوں کی محفل" کے اوراق دیکھے۔
"دھڑکنیں کیسے تھمتی ہیں؟ دل کا بند ہوجانا کسے کہتے ہیں؟ اچانک ہی ان احساسات سے گذری ہوں" اوہ نو
نہیں ہوسکتا" بے اختیار بلند آواز میں میرے منہ سے یہ الفاظ نکلے تو میری بچیاں جو ہوم ورک کررہی تھیں چونک کر میری
دیکھنے لگیں۔

یہ ایک دم میرے گھر پر کیسا سوگ طاری ہوگیا ہے یہ کیسا سناٹا ہے جو روح میں اتر رہا ہے یہ کس کے رو
آوازیں میرے اس دل کو چیر رہی ہیں یہ معصوم چیخیں مجھے کہاں سے سنائی دے رہی ہیں۔ میرا دماغ ماؤف ہوا جارہا ہے
کہہ رہا ہے کیا پوچھ رہا ہے مجھے کچھ نہیں سنائی دے رہا۔ بس ایک فقرے کی گونج میرے کانوں میں بازگشت بن کر
ہے۔ ہاں! کوئی بہت ہی قریبی عزیز میرا مجھ سے بچھڑا ہے۔ ایک ایسا قریبی عزیز جس سے میرا کوئی خونی رشتہ نہیں نہ
جذباتی تعلق بھی نہیں تھا لیکن پھر بھی اس کی جدائی اس دل پر گراں گزر رہی ہے۔

آنسو ہیں کہ تواتر سے بہے چلے جارہے ہیں وہ کون تھی؟ میرا اس سے کیا رشتہ تھا بچوں کے یہ معصوم سوال میرے
لوں کی زبان نہیں سمجھ رہے ہیں۔ میں نے اسے دیکھا نہیں تھا کبھی میں اسے پہچانتی نہیں تھی اور دوسری قاری بہنوں کی طرح
ں بھی اس کے افسانوں پر تنقید و تعریف کے خطوط لکھتی تھی۔ اس کا انداز تحریر مجھے بہت پسند تھا۔
شازیہ کے لیے کچھ بھی لکھنا میرے بس کی بات نہیں۔ مجھے تو اس کی ذاتی زندگی کے متعلق پاکیزہ محفل سے ہی پتا
لتا تھا کب شادی ہوئی کب وہ بچوں کی ماں بنی بچوں کے کیا کیا نام رکھے۔ یہ سب باتیں پاکیزہ کے وسیلے سے ہی پتا چلیں تو پھر
یا لکھوں شازیہ یہ تمہارے لیے؟

بہت جی چاہتا ہے
آج کچھ ہم تمہارے نام لکھتے
لکھیں تو کیا لکھیں تم ہی بتاؤ
قلم میں طاقت گفتار ہے کب؟
نہ تم سن سکتے ہو جاناں!
تو جاناں کیا لکھیں پھر ہم
بڑا دل چاہتا ہے
کہ پھر تمہارے نام لکھیں
کئی یادیں کئی باتیں
جو ہم کو یاد رہتی ہیں
نہ ہم محفوظ کرتے ہیں
کسی بھی لوح فرفر پر
تو پھر کیا لکھیں شازی
بتا! اب کیا لکھیں پھر ہم
بس میری اشکوں کی یہ زباں ہی تمہارے لیے دعائے مغفرت کی رہی ہے اور وہ معصوم بچے جو ابھی ماں کی صورت
ر پیار سے آشنا نہیں ہیں ان کے لیے درازیٔ عمر اور سرفرازیٔ علم کی دعا کر رہی ہوں۔ جو خواب تم نے ان کے حوالے سے دیکھے
را انہیں پورا کرے اور تمہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے جنت میں اعلیٰ مقام نصیب ہو۔ آمین ثم آمین

شازیہ چوہدری کے نام

رضوانہ حیٔ

کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں
دل میں جو اتر جاتے ہیں
بصارت کو طلب اُن کو دید کی ہوتی ہے
سماعتیں منتظر ان کی آواز کی ہوتی ہیں
مسکراہٹیں ان کی بکھیر دیتی ہیں خوشیاں ہر سو
لفظوں میں جن کے ہوتا ہے جادو
فقط اک ان کے چلے جانے سے
دل پہ چھا جاتی ہے اداسی سی

اپنے پیاروں کی صدا پر بھی
لوٹ کر پھر وہ نہیں آتے
پھر کوئی چاہے بھی تو
خلا ان کا پر نہیں سکتا!

دلوں میں رہتی تھی وہ

غزالہ طارق

بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رُت ہی بدل گئی
اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا!

آج کپڑے دھو رہی تھی کہ بڑی بیٹی نے کہا ماما نان لا دیں میں بھیگے کپڑوں سے چل پڑی۔ نان لگنے میں ... میں ساتھ بک شاپ پر چلی گئی، لڑکے نے مجھے آتا دیکھا تو پاکیزہ شاپر میں ڈالنے لگا میں نے قہقہہ لگایا! تمہیں پتا چل گیا ... پاکیزہ لینے آئی ہوں۔ ہاں باجی آپ دو دن پہلے سے پوچھنا شروع کر دیتی ہیں۔ گھر آئی نوالہ نہ توڑا پاکیزہ کھول کر بیٹھ گئی ... ذہن نمبر میں شازیہ بھی ہے لیکن آہ! کیوں لکھا ہے۔ پہلا پیراگراف پڑھا اور چیخ مار کر رسالہ پرے پھینک دیا، میرے ... صرف ایک آواز نکل رہی تھی نہیں ایسا نہیں ہو سکتا شازیہ نہیں مر سکتی۔ میری چھوٹی بیٹی بھاگ کر میرے پاس آئی۔ ماما یہ ... مر گئیں۔ ماما کیا یہ ہماری خالہ تھیں منجھلی نے آنکھیں پٹپٹائیں۔ ارے بیوقوف ضرور ماما کی دوست ہوں گی۔ ماما کیا یہ کبھی گھر آئی تھیں، چھوٹی نے پھر میرے آنسو صاف کرتے ہوئے سوال کیا، ہاں بیٹا ہر مہینے آتی تھیں کبھی پاکیزہ کی شکل میں ... دوسرے رسائل کی شکل میں، میں خود کلامی کر رہی تھی۔ طارق پردیس میں ہیں اور میں چاروں بچوں کے ساتھ یہاں اکیلی ... کے اس صحرا میں بھی شازیہ تو کبھی دوسرا رائٹرز بہنیں اپنے کرداروں کے گھر لے جاتیں اور حوصلے ہارتی غزالہ کہانی کے اختتام ... بار پھر توانا ہو کر حالات کا مقابلہ کرنے کھڑی ہو جاتی کرداروں کے مسائل بڑے اور اپنے چھوٹے لگنے لگتے آج بک شاپ ... بچی کی کتاب لینے گئی۔ ایک خاتون برے حالوں میں اندر آئیں! اے جلدی سے پاکیزہ دینا، اس نے پاکیزہ ہاتھ میں ... میں نے اس کا ہاتھ ...

تمہیں پتا ہے شازیہ چوہدری مر گئی، ہاں میری بھابھی نے ابھی فون پر بتایا، مجھے یقین نہیں آیا اس لیے پاکیزہ ... آئی ہوں۔ سنا ہے سب سے پہلے خبر پاکیزہ نے دی ہے ہم دونوں آنکھوں میں آنسو بھرے ایک دوسرے سے افسوس کر ... لگے۔ سوچا انجم! تمہیں بھی پرسہ دوں اور تمام بہنوں کو بھی شازیہ چلی گئی ہماری اپنی شازیہ۔ اپنی اس لیے کہ وہ پاکیزہ بہنوں ... دلوں میں رہتی تھی تمہارا اور ادارہ سونے پہ سہاگا تھا اپنے بچے لپٹاتی تصور میں شازیہ کے بچوں کے لیے آنسو بہاتی جاتی تھی ... شازیہ کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔ آمین ثم آمین

آسماں تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے

ناہید بنت نور

انجم باجی سے شازیہ کی فوتگی کی اطلاع ملی۔ یہ ایک ایسی خبر تھی جس کے سننے کے لیے کان اور دل دونوں ... تھے میں بالکل شاکڈ رہ گئی...... لیکن بعض خبریں ایسی ہوتی ہیں جنہیں بھاری دل، بوجھل دماغ اور اشکبار آنکھوں سے ... پڑتا ہے۔

شازیہ چوہدری...... جنہیں مرحومہ لکھتے ہوئے کلیجا منہ کو آتا ہے اس نے اتنی جلدی رخت سفر باندھ کر حلقہ ... سوگوار کر دیا ہر فرد یہ کہنے پر مجبور ہو گیا کہ

کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتی کوئی دن اور

موت برحق ہے مگر الٰہی......

یہ کیسی جوانی کی موت ہے جس کا زہر ہمارے ذہنوں، ہمارے دلوں اور ہماری روحوں میں سرائیت کر گیا ہے۔

یہ کیا دست اجل کو کام سونپا ہے مشیت نے

درد شناسائی

ساجدہ حبیب

میں شازیہ چوہدری سے کبھی نہیں ملی۔

حالانکہ ہم لوگ ایک ہی شہر میں مقیم تھے۔ درمیانی فاصلہ بھی طویل نہ تھا میں اور گل (شوکت رانا الطاف) اکثر اس کی تحریر کو پڑھنے کے بعد تنقید کرتے ہوئے یہ کہہ کر بات ختم کر دیتے۔ "چلو...... کبھی ملاقات کریں گے۔" لیکن...... یہ ملاقات کبھی نہ ہو سکی۔

ہم ادیب برادری کے لوگ اور ہمارے قارئین اک عجیب احساس کی ڈور سے بندھ جاتے ہیں۔ کبھی ایک دوسرے سے ملاقات نہ ہونے کے باوجود بھی۔ ایک دوسرے کو نہ سمجھنے نہ جاننے اور نہ پرکھنے کے سبب بھی ہر شخص دوسرے سے ایک عجب شناسائی رکھتا ہے۔ لکھنے والا اپنے قارئین کے ناموں سے خیالات سے آشنا ہوتا ہے۔ اور قارئین ہر ادیب کے نام سے واقف اور لفظوں کی جادوگری کے فنکار کو پہچاننے کی بہترین صلاحیت رکھتے ہیں۔

سو رسم شناسائی کا یہ ایک عجب سلسلہ ہے۔

پھر ایک شام شازیہ چوہدری نے مجھے فون کیا۔

یہ موسم سرما کا اختتام تھا۔ اور بہار کی اولین رُت کا ایک خوبصورت لمحہ......! کہ اس کا زندگی اور خلوص سے بھرپور اک جملہ میرے دل میں اترتا چلا گیا۔

اب کیا بتاؤں؟ کہ وہ کس انداز سے میری ہر تحریر کی تعریف کر رہی تھی اور میں اس کے خلوص کا شکریہ ادا کرنے کے لیے لفظوں کا سہارا تلاش کرنے کی کوشش میں تھی۔

انجم...... تم نے بالکل صحیح کہا کہ وہ تو ہر کام جلدی جلدی کرنے کی عادی تھی۔ کیونکہ وہ بہت تیز لہجے میں اپنے جذبات کا اظہار کر رہی تھی۔ بہت کچھ کہہ رہی تھی۔ شاید اس لیے بھی کہ اس کی میرے لیے یہ پہلی اور آخری ٹیلیفون کال تھی۔

نہ جانے کیوں؟ میں شازیہ چوہدری کو کال بیک نہ کر سکی۔ حالانکہ اس کا ٹیلیفون نمبر میری ڈائری میں لکھا ہوا موجود ہے لیکن اتنا ضرور ہوا کہ کبھی فری سے ملاقات ہوتی تو اس کا ذکر خیر ضرور ہوتا۔ میں گل اور رفعت ناہید سجاد کبھی گپ شپ لگاتے تو تحریروں کے حوالے سے وہ ہماری گفتگو میں موجود ہوتی۔ میں سلسلے وار ناول کبھی نہیں پڑھتی۔ البتہ کبھی کبھار نظر پڑتی تو کہیں کوئی یہ کوئی منظر کشی یا پھر زندگی کی کوئی انتہائی تلخ حقیقت ضرور اپیل کر جاتی۔ اس کی اکثر تحریروں میں زندگی کی نزاکتوں کا احساس نمایاں ہوتا۔

ہر پل گزرتا چلا گیا۔ وہ رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئی۔ فری نے مجھے بتایا۔ "وہ بہت خوش ہے آنٹی۔ طارق بھائی بہت اچھے شوہر ہیں۔" یقیناً وہ خوش تھی کہ قدرت نے باکمال مہربانی بہت جلدی پاؤں کی جنت نصیبوں میں کر دی۔

بھلا کن ارمانوں سے اس نے بیٹے کو اپنی رفاقت دی ہوگی؟ کیا کیا سپنے دیکھے ہوں گے بچوں کے مستقبل کے خوابوں کے حوالے سے کس کس جہان کی سیر کی ہوگی؟

بیٹی کی پیدائش کے بعد یقیناً اس نے سوچا ہوگا کہ بس اب یہ کائنات مکمل ہے۔ اور کیا چاہیے؟

لیکن اسے زندگی چاہیے تھی۔ اپنے لیے، اپنے گھر شوہر اور بچوں کے لیے۔ اپنے قارئین ادیب دوستوں
جیسی بہن کے لیے (جو آج تک اس صدمے سے باہر نہیں نکلی)

مگر......وقت اب نصیبوں میں نہ تھا۔

چھ مئی کی گرم دوپہر کو وہ اپنے بیٹے کے لیے اتالین فوڈ لینے ہی تو گئی تھی کہ بس یہی زندگی کا آخری سفر تھا، آ
اس نے کائنات کو اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھا۔ زندگی کے ہر رنگ کو محسوس کیا۔ اپنے ہمسفر سے زندگی کی آخری گفتگو کی او
کی طرف آخری موڑ مڑتے ہوئے اس نے حکم ربی پر لبیک کہا۔ اِک گہری خاموشی، اِک گہرا اندھیرا ہر طرف چھا گیا۔

پھر......ایک شام فری نے مجھے فون کیا۔ بھرائی ہوئی آواز میں وہ کہہ رہی تھی۔ ''آنٹی...... چھ مئی دن سوا دو
وہ کومے میں ہے۔ Head Ingury ہوئی ہے۔ ڈاکٹرز کہتے ہیں کہ صرف فائیو پرسنٹ چانس ہے۔ لیکن طارق بھا
مانتے۔ ان کا خیال ہے کہ وہ ٹھیک ہو جائے گی۔ میں اسے دیکھنے گئی تھی وہ تو پہچانی ہی نہیں جا رہی۔'' فری اس سے زیادہ کہ
سکی۔

''کیا بہت زیادہ زخمی ہے؟'' میں نے بمشکل تمام پوچھا۔

''Swelling بہت زیادہ ہے؟'' فری کہہ رہی تھی۔ ''بس آپ دعا کریں۔''

میں نے دعاؤں کی قبولیت کی دعا مانگتے ہوئے اپنے رب کے حضور سر جھکایا۔ اور مجھے یاد آیا۔

میری ایک انتہائی مہربان سہیلی کی خالہ ایک زبردست حادثے کے بعد نہ صرف یہ کہ ہوش میں آگئیں ب
صحت یابی کے بعد جب وہ مجھے شادی کی ایک تقریب میں ملیں تو میں انہیں دیکھ کر حیران رہ گئی۔

اور ایسا بھی تو ہوتا ہے۔

میرا ایک رشتے کا بھائی جو انگلینڈ میں مقیم ہے دو ماہ تک کومے میں رہا۔ اس دنیا کے جدید ترین اسپتا
میڈیکل سائنس اور بہترین دماغوں والے ڈاکٹرز مایوس تھے غم زدہ باپ اور بھائیوں نے ہمیں آخری تیاری کے بار
اطلاع دی۔ ہر طرف مایوسی تھی التجائیں تھیں۔ رب کریم نے فریاد سن لی اور اسے ہوش آگیا۔

یہ قدرت کا وہ معجزہ ہے جو اس اسپتال کے ریکارڈ میں باقاعدہ طور پر لکھا گیا کہ آج وہ مکمل صحت یابی کے بعد
شدہ اور دو بچوں کا باپ ہے۔

مجھے مسز کرنل جلیل یاد آئیں۔ جو نیلوفر کے نام سے باکمال شاعری کرتی ہیں۔ برین ہیمرج کے نتیجے میں
بے ہوشی جن کا مقدر رہی۔ مکمل صحت یابی کے بعد جب میری اُن سے ملاقات ہوئی۔ تو میں حیرت زدہ تھی۔ حضرت علام
کے تمام اشعار انہیں زبانی یاد تھے، یہی نہیں بلکہ میری ایک تحریر پر انہوں نے اس طرح تبصرہ کیا۔ گویا کہ صفحات ان کے
کھلے موجود ہوں۔

بھلا کون سی چیز قدرت کی دسترس سے باہر ہے۔ بلاشبہ وہ غفور و رحیم ہے، ہر شے پر قادر ہے۔ سب کچھ کر سکتا
انشاء اللہ وہ ضرور ہوش میں آئے گی۔ یہ دنیا یہ زندگی اور حیات کے سبھی رنگ پھر سے اس کا نصیب ہوں گے......! میں بڑ
اپنے آپ کو تسلی دیتی رہی۔

''انشاء اللہ کوئی معجزہ ضرور ہوگا۔ وہ پلٹ آئے گی۔''

اس دوران مجھے ایک دن کے لیے میرپور (آزاد کشمیر) جانا پڑا۔ رات کھانے کی ٹیبل پر میں نے اچا
آ جانے پر پوچھا۔

''شازیہ چوہدری کس کی پسندیدہ رائٹر ہے۔''

''میری۔'' نجمہ نے فوراً کہا۔ ''میری بھی'' عالیہ نے پہل کرنے کی کوشش کی۔ ''کیوں پھوپھو؟ کیا ہوا؟'' آ

چہرے کے تاثرات نوٹ کرتے ہوئے کہا۔

زارا اور مافیا خاموش رہیں۔

میں نے حادثے کی تفصیل بتائی۔ تو بچیاں ششدر رہ گئیں اور ایک افسوس کا سلسلہ ہر طرف بکھر گیا۔

''آپ سب دعا کریں۔'' میں صرف اتنا ہی کہہ سکی۔

اگلے دن راولپنڈی واپسی کے بعد جب میں نے فری کو فون کیا تو معلوم ہوا کہ بس حیات تو فقط اتنی ہی تھی اور غم
ور......اتنا لامحدود جتنی کہ اس کائنات کی وسعت، جتنا کہ آکاش کا پھیلاؤ اور کسی مرقد کی گہرائی۔

''وہ بہت معصوم لگ رہی تھی۔'' فری روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ''وہ چلی گئی آنٹی، ہم سب کو چھوڑ کر آج مجھے کالج
نے کا اک اک لمحہ یاد آ رہا ہے۔'' میں کچھ نہ کہہ سکی۔ خاموشی سے گرتے آنسوؤں کے ساتھ سنتی رہی، فری کہہ رہی تھی۔
بھائی بتا رہے تھے کہ تقریباً ایک ماہ پہلے اس کی گفتگو عجب رنگ اختیار کر گئی تھی۔ ایک دن وہ کہنے لگی۔

''مجھے قبرستان سے بہت ڈر لگتا ہے۔ اگر میں مر جاؤں تو مجھے یہیں گھر کے پورچ میں دفن کر دینا۔''

مجھے یقین ہے کہ برادرم طارق نے یہ سن کر مصنوعی خفگی سے اسے نہایت پیار بھری ڈانٹ پلائی ہوگی کہ ابھی تو جینے
تھے۔ سولہ جون کو اس کی شادی کی تیسری سالگرہ تھی۔ اور تیس جون کو عروشہ کی برتھ ڈے۔ ابھی تو کائنات کے سبھی رنگ
تھے۔ بہت چھوٹے معصوم اور پیارے بچوں کی ماں کو بھلا یہ احساس کس طرح ہوا کہ موت اس قدر قریب ہے۔

پانچ مئی کی شام مغرب کے وقت اس نے طارق بھائی سے کہا۔ فری کی آنسوؤں سے رندھی ہوئی آواز آئی ''میں
وں۔ اگر میں مر جاؤں تو تیمور کو تمہاری امی جان پال لیں گی، اور عروشہ کو میری امی لیکن تمہارا کیا بنے گا؟''

میں نہیں جانتی کہ اس بات پر برادرم طارق کا ردِعمل کیا ہوگا؟ لیکن دوسری شام جب وہ اس دنیا سے بے خبر کومے
کی تھی۔ یہ بات سننے والوں نے ضرور سوچا ہوگا کہ وہ تو جیسے ولی، فقیر، قطب اور ابدال دیا کرتے تھے۔ کہ ان میں سے کچھ
کے اس درجے پر پہنچ جاتے تھے۔ جہاں وہ آنے والے ہر امر سے باخبر ہوتے تھے۔

مجھے یاد آیا۔ مرحومہ پروین شاکر ''جنگ'' میں کالم لکھا کرتی تھیں۔ ان کا آخری کالم جو ان کی وفات کے دو دن
ہوا۔ اس کا پہلا فقرہ تھا ''موت برحق ہے''۔

میں نے شازیہ کے سلسلے وار ناول کی آخری قسط کا اینڈ پڑھنا چاہا اور میں حیران رہ گئی۔ ''باقی آئندہ'' سے پہلے اس
کا حادثے میں زخمی ہونا دکھایا۔ اور آخری فقرہ تھا ''اسے کیا خبر تھی؟ کہ وہ اپنی زندگی سے نہیں بلکہ موت سے ملنے جا رہا
ں کے بعد ''باقی آئندہ شمارے میں پڑھیے'' تحریر تھا۔ تسلی کے تمام بول تعزیت کے سارے لفظ اور ہمت کی تمام طنابیں
وٹ گئیں، میرے آنسو نوحہ کناں تھے۔ ابھی تو خالدہ اسد کا غم تازہ تھا، عطیہ بانو کی قبر کی مٹی نم تھی۔ ہوا خاماں کے بے
رجانے کا سانحہ اپنی جگہ تھا کہ اچانک تم بھی چلی گئیں شازیہ۔ ذرا دیکھئے تو اس امر باکمال کو کہ میری اس سے کوئی ملاقات
تی نہ تھی۔ میں نے اسے کبھی دیکھا نہیں تھا۔ میں اس کی طبیعت عادات اور مزاج سے واقف نہ تھی۔ وہ میری زندگی میں
ں کسی ناتے، کسی رشتے سے وہ میری کچھ نہ لگتی تھی۔ فقط فری کے توسط سے اک مبہم سا رابطہ ضرور تھا لیکن میں اس شام
ں۔

میں نے رات کے وقت انجم کو فون کیا۔ وہ گھر پر نہیں تھیں۔ پیام دیا تو پاکیزہ کے توسط سے جواب آیا کہ ''ساجدہ
نے عرصے سے ناتا توڑ رکھا ہے۔ خدا جانے اس پر کیا گزری ہوگی؟''

نہیں انجم...... ہرگز نہیں میں نے ایک بار اپنا لینے کے بعد کبھی کسی سے ناتا نہیں توڑا۔ یہ بات میری فطرت
مول کے خلاف ہے۔ خدا جانے کیوں لکھنا کم کر دیا۔ لیکن میرے قارئین میرے دوست اور میری ادیب برادری ہمیشہ
ل کے اندر بستی رہی۔

اب یہی دیکھ لو کہ شازیہ چوہدری کے چلے جانے کے بعد مجھے کتنے تعزیتی ٹیلیفون آئے۔

کل شام آزاد کشمیر کے ایک دور دراز علاقے ڈڈیال سے ڈاکٹر شہناز خان نے (پاکیزہ ملتے ہی) اس حا
خبر پا کر مجھے فون کیا۔ اور مجھ سے دلی طور پر تعزیت کا اظہار کیا۔ ایئر ڈیفنس لیڈیز کلب کی میٹنگ میں بیگم جنرل خطیر
نے مجھ سے تعزیت کی اور پاکیزہ کی مستقبل قاری مسز کرنل خالد حمید شاہ، مسز کرنل سلیم اعوان اور مسز کرنل ڈاکٹر سلیم کے
کرنل حامد (جو میں جانتی ہوں کہ اس خبر سے کس قدر آزردہ ہوں گی۔ کوثر بھابی مسز جنرل اشرف سلیم جو کہ پاکیزہ کی منہ ہر دفعہ
ہیں۔ شمع علی کے نام سے کبھی کبھار پاکیزہ میں لکھتی ہیں نے خاص طور پر اس سانحے پر دلی رنج کا اظہار کیا۔

وہ اک دنیا جسے چاہتی تھی، جانتی تھی بھلا کس طرح زمانے سے گزر گئی۔

میں نے امتل الصبور کو فون کیا۔ وہ کہہ رہی تھی "ہاں مجھے معلوم ہے میں ہمیشہ اس سے رابطہ میں رہتی تم
رابطے ختم ہوئے سب راستے جدا ہوئے۔

اور...... یہ تو بہت ہی بہتر ہوا کہ میری کبھی اس سے ملاقات ہی نہ ہوئی۔ بنا ملے، بنا جانے میرا دل اس کے
قدر اداس ہے میری آنکھیں اس کے لیے رو رہی ہیں۔ اگر زندگی میں ایک مرتبہ بھی اس کا چہرہ دیکھ لیں تو خالدہ اسد کیا
بھی زندگی بھر فراموش نہ کر سکتی۔

واقعی...... قدرت کے بعض کاموں میں بڑی بہترین مصلحت پنہاں ہوتی ہے۔

آہ! شازیہ چوہدری

آصفہ شفیق

وہ اگلا موڑ جدائی کا
اسے آنا ہے وہ تو آئے گا

اور اسی آنے والے اگلے موڑ کو فراموش کیے ہم دنیا کی گہما گہمی میں مصروف ہیں۔ کون جانے کب ا
دوسرے سے جدا ہو جانا ہے۔ شازیہ کی اتنی اچانک موت نے کتنا کچھ واضح کر دیا ہے ہم نے یہ نہ جانا تھا کہ تحریر کے
بندھا ہو یہ بندھن اتنا مضبوط ہوگا کہ اس کے جانے کی خبر سے دل یوں تڑپے گا اور آنکھیں برسات کی رم جھم کی طرح،
میری طرح بہت سے لوگوں نے شازیہ کو اس کی تحریر ہی کے ذریعے دیکھ رکھا تھا۔ میں تو بڑی دیر اس ک
دیکھتی رہی۔ ابھی تو انجم! اس کے دلہناپے کے دن تھے۔ نہ جانے کیوں اس کے شوہر کی تڑپ اور بچوں کی حسرت!
بھی میری سماعت میں واضح طور پر سنائی دے رہی ہیں اور میں تڑپ تڑپ کر اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ وہ اسے غ
کرے۔ اس کی اگلی تمام منزلیں آسان کر دے، اس کے بچوں کو سکونِ قلب عطا کرے اور جنت الفردوس میں اے
حاصل ہو۔ آمین

روشن ستارہ شازیہ

نکہت نسیم

انجم سے فون پر بات کرتے وقت یہ ہرگز بھی وہم گمان میں نہ تھا کہ ایک ایسی اطلاع میری منتظر ہے جو ا
پیر تک ہلا دے گی!

وقت ایسے نقصان کی اطلاع دے گا کہ جس کا ازالہ کسی کے پاس بھی نہ ہوگا، شازیہ کا گزر جانا ایسا حادثہ
ہر روز ہی ہوتا ہوگا لیکن ایسا نقصان کسی کا نہ ہوتا ہوگا جان بہت قیمتی چیز ہے اور اس کی قسمت کا اندازہ اس کے گھر وا
والے لگا سکتے ہیں لیکن شازیہ جیسے حادثے اور نقصان سے متاثرہ لوگ بھی ہوئے ہیں جو اس سے نہیں ملے تھے

کہانیوں اور لفظوں کی جادوگری نے متاثر کن تھے اور ایسے لوگ پوری دنیا میں ملیں گے جو اس نقصان کو ذاتی نقصان محسوس کرتے ہیں
ور میں کیا کہوں! کہاں سے شروع کروں، کس کس کہانی کا ذکر کروں اس کے کہے ہوئے کن کن لفظوں کو دہراؤں! اللہ جنت
نصیب کرے میری بے حد پسندیدہ رائٹر تھی! میں اس سے ملی کبھی نہیں تھیں ہمیشہ یہی لگتا تھا جیسے بہت نزدیک سے جانتی ہوں۔
ہر دفعہ سوچتی اچھا اس دفعہ پاکستان جاؤں گی تو ضرور مل کر آؤں گی! لیکن ہر دفعہ کچھ ایسا ہو جاتا کہ سب کچھ دھرا کا دھرا رہ جاتا۔
اور پھر انجم کی مہربانی سے۔ بہنوں کی محفل میں آگاہی ہو جاتی کہ کون کیا کر رہا ہے، یہ ایک ایسا پلیٹ فارم ہے جہاں
کھڑے ہو کر ہم سب ایک ہی خاندان کے ہو جاتے ہیں۔ کاش میں شازیہ کو بتا سکتی ہم تمہیں بہت پیار کرتے ہیں، تمہیں بہت
مس کر رہے ہیں، تمہیں بہت زیادہ دن رات یاد کرتے ہیں۔ اللہ پاک تمہیں جنت میں اعلیٰ جگہ عطا فرمائے۔ خدا جانے تمہیں
اتنی جلدی کیوں جانا تھا۔ لیکن یہ سچ ہے شازیہ تمہاری جگہ کسی بھی جگہ کوئی نہیں لے سکے گا! تم ہی وہ روشن ستارہ ہو جو ہر جگہ اب بھی
جگمگ کر رہا ہے!

اپنا آپ منوا گئی

ملیحہ منصور

آج پھر شدت سے احساس ہو رہا ہے کہ بعض دفعہ الفاظ کتنے بے معنی سے ہو جاتے ہیں ایسے جیسے ساحل کی ریت پر پڑی آڑی ترچھی لکیریں جن کا کوئی مطلب نہیں ہوتا۔ جن میں کوئی استعارہ کوئی معنی کچھ بھی تو نہیں ہوتا۔ بعض دفعہ الفاظ بھی تو ایسی ہی بے مقصد بے شکل تصویریں بن کر رہ جاتے ہیں، جب آپ اپنے احساس کی گہرائیوں میں شدت سے طوفان اٹھاتے درد کو لفظوں کے کسی بھی پہناوے میں نہ ڈھال سکیں......!

شازیہ چوہدری کے گھر والوں کے لیے صبر اور برداشت کی دعائیں کہ یہ مشیت ایزدی ہے اس کی مصلحت کو ہم گنہگار بندے کہاں پا سکے ہیں۔

اللہ اس کو جہاں رکھے خوش رکھے، بس اس سے زیادہ کچھ نہ سوچا جا رہا ہے نہ لکھا جا رہا ہے۔

زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا
ہم ہی سو گئے داستاں کہتے کہتے

شائستہ عزیز

چند لمحوں قبل میں نے کتنی خوشی خوشی "دلہن نمبر" کھول کر دیکھنا شروع کیا تھا۔ اس نمبر کا مجھے کتنی شدت کے ساتھ انتظار تھا۔

تین چار دلہنوں کے بعد ہی جس "دلہن" نے مجھے پتھرا دیا وہ "شازیہ چوہدری" تھی۔

ایک بار، دو بار، بار بار میں نے خود کو جھوٹی تسلی دے کر، اسے شازیہ کا کوئی مزاحیہ کالم سمجھ کر پڑھنا چاہا۔ مگر یہ ایک اٹل اور سفاک حقیقت نکلا۔

دلخراش، ناقابل یقین اور دل ہلا دینے والا ظالم سچ، مجھے برسوں ہو گئے۔ میں رونا بھول گئی ہوں۔

چاہتی بھی ہوں کبھی پھوٹ پھوٹ کر روؤں کہ دل ہلکا ہو سکے مگر آنسو اندر ہی اندر جھیل بنا لیتے ہیں باہر آ کر نہیں برستے۔

خدا گواہ ہے کہ اس دلہن نے مجھے آنسوؤں سے رلا دیا۔ میں پتھر بن گئی چند ثانیے کو۔ اور اس پتھر کو شازیہ کے غم میں بہنے والے آنسو قطرہ قطرہ پگھلانے لگے یہ عشا کا وقت تھا۔

میں نے نماز کے بعد اس کی مغفرت کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے۔

”رب کریم اپنے حبیبؐ کے صدقے میں اس کی مغفرت فرمادے۔ اس کے تمام گناہِ کبیرہ اور صغیرہ کی معافی کردے۔ اس کی لحد کو چاروں اوٹ سے ٹھنڈا کردے اسے اپنے محبوب کی شفاعت سے نواز دینا۔ اس کے ماں باپ، بہن، شوہر اور بالخصوص اس کے بچوں کو صبر عطا کردے کہ بے شک تو بہت بے نیاز سہی مگر صبر دینے والا بھی بس تو ہی ہے، آمین

اسے جانے کی جلدی تھی!

عالیہ حرا

جب انجم انصار آپی نے فون پر بتایا کہ شازیہ چوہدری کے لیے دعا کرو عالیہ اس کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے اور وہ کو میں ہے میں ساکت کھڑی رہ گئی...... کیسے آپی۔ کیسے؟

میری آنکھوں کے سامنے دھند ہی دھند تھی اور دل سے اس کے لیے دعا نکلی۔ اے اللہ شازیہ کو زندگی دے، دے اور صرف دو دن بعد شمیم ناز صدیقی فون پر کہہ رہی تھی عالیہ شازیہ اب ہم میں نہیں رہی وہ......وہ۔

کیا!!!...... میرا سانس رہ گیا تھا۔

یوں...... آناً فاناً اچانک وہ جذبوں سے بھری لڑکی وہ لفظوں کی کہنہ مشق کھلاڑی یوں جاسکتی ہے آہ!!!...... اپنے پڑھنے والوں کو کیسے حیرانیاں دے گئی ہو، سوچیں بھی ششدر رہ گئیں۔

اس کی زندگی کی ادھوری داستان، شازیہ تم ہی اپنے بچوں کے صدقے تھوڑی سی ہمت کرلیتیں۔

مجھے خدا سے شکوہ ہے! اتنے لوگوں کی دلی دعائیں اس کے معصوم بچوں کی آہ وزاریاں والدین کی گریہ زاری نے نہ سنی، ایسا کتنا سفر اس نے طے کرلیا تھا ابھی تو زندگی کی پہلی سیڑھی تھی ابھی تو بہت اوپر جانا تھا۔

مجھے یقین ہے موت بھی اس کی موت پر اشک بار ہوگی یہ میں نے کیسا کھیل کھیل ڈالا۔ لمحوں میں زندگی کے رخ بدل گئے۔ شازیہ مدتوں روئے گا زمانہ تم کو...... وہ شدت پسندی وہ رعنائی وہ گرم جوشی تحریر، اک نشست میں اپنی ہم عصر کو پڑھنے کی خواہش جب بھی ان رسالوں کو کھولیں گے تمہیں ڈھونڈیں گے کوئی تمہارا پر تو نہیں ہوسکتا۔ ابھی تو تم نے جانے خوبصورت آئیڈیاز پر لکھنا تھا ابھی تو کتنی ادھوری کہانیاں لکھنی تھی۔

ایسا عظیم نقصان جس کو ادب کے قارئین کبھی بھلا نہ پائیں گے اسے مرحوم لکھتے ہوئے قلم بھی رو رہا ہے۔ اے معصوم بچوں کو صبر جمیل عطا فرما۔

اے اللہ اس کے والدین، شوہر، دوست احباب کو اس دکھ کو برداشت کرنے کی توفیق عطا فرما۔

اے اللہ اس کے ہم قلم، ہم عصر، ہم قدم ساتھیوں کو صدمۂ جانکاہ برداشت کرنے کی قوت اور ہمت عطا آمین...... ثم آمین

ناکامِ تمنا دل اس سوچ میں رہتا ہے
یوں ہوتا تو کیا ہوتا، یوں ہوتا تو کیا ہوتا
امید تو بندھ جاتی، تسکین تو ہو جاتی
وعدہ نہ وفا کرتے، وعدہ تو کیا ہوتا

* * *

دیباچہ

کچھ کہانیاں ایسی ہوتی ہیں جو اپنا تعارف خود ہوتی ہیں، ان کے بارے میں کچھ لکھنا' کہنا یا دعویٰ کرنا ضرور نہیں ہوتا۔ پڑھنے والا انہیں پڑھتا ہے تو خود ہی سمجھ جاتا ہے۔ جب سمجھ جاتا ہے تو ان میں کھو جاتا ہے۔ جب کھو جاتا ہے تو ان کے کرداروں میں رچ بس جاتا ہے اور جب کردار آپ کے دل میں آپ کے احساسات میں آپ کی سوچوں میں دھڑکتے ہوں تو ان کرداروں کے تعارف کی کیا ضرورت باقی رہتی ہے!!!!

”میں بھلا کون ہوں“ اس معاشرے کی وہ تلخ سچائی ہے جسے کوئی معاشرہ پوری ذمہ داری سے سے قبول کرنے کو تیار نہیں ہوتا۔

ایک ایسا سچ جیسے معاشرہ اپنے آپ سے بھی چھپاتا ہے!!!

ایک ایسی حقیقت جس پر پردہ ڈالے رکھنے کی تمنا کی جاتی ہے۔

لیکن اس کہانی کے کرداروں نے نہایت جرأت، بے باکی اور نڈری کے ساتھ ان حقائق کو تسلیم کیا ہے اور ظاہر کیا ہے۔

اس ناول سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کے لیے اپنے سارے نامکمل کام مکمل کرلیجئے اور پھر سکون کے ساتھ آغاز کیجیے کیونکہ اس ناول کے کردار عنقریب آپ کو اپنے ساتھ بہالئے جانے والے ہیں۔ آپ کو ایک ایسی نگری کی سیر کروانے والے ہیں جو بے حد شوخ وشنگ اور رنگین ہونے کے ساتھ ساتھ بہت ہیبت ناک اور وحشت زدہ بھی ہے۔

والسلام

شازیہ چوہدری

''اماں جی! آپ کے گھر میں تو ہر وقت میلے کا سا سماں رہتا ہے۔'' افراح کا لہجہ حقیقی مسرت سے سرشار تھا۔ یہاں چند دن رہ کر ہی اُسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس گھر کے در و دیوار اُداسی اور بوریت کی کائی سے محفوظ ہیں۔ یوں بھی بھرا پُرا گھرانا تھا پھر عزیز رشتے دار بھی اسی علاقے میں بکھرے پڑے تھے۔ سارا سارا دن آنا جانا' ملنا جلنا لگا رہتا تھا۔

''چل شکر ہے' تیرا دل تو لگا۔ تیری ماں کو بہت فکر تھی جاتے سمے۔'' اماں جی نے سکھ کا سانس لیا۔

''اللہ دونوں میاں بیوی کا حج قبول کرے۔ کرماں والے ہیں جنہیں اس سال مقدس دھرتی پر قدم رکھنے کی سعادت حاصل ہوئی ہے۔ اللہ خیر رکھے تو ڈیڑھ دو ماہ بعد لوٹ آئیں گے۔ تو تسلی سے رہ میرا بچہ۔'' اماں جی بیٹی اور داماد کے حج پر جانے پر حد درجہ خوشی کا اظہار کر رہی تھیں۔

''ذرا دیکھو تو تمہاری صفیہ ممانی نے بریانی بنالی ہے؟ اُن سے میری طرف سے کہہ دینا کہ ساتھ میں آلو اور کدو اُبال کے اچھا سا دہی کا رائتہ ضرور بنائیں۔ ہارون رائتے کے بغیر چاول نہیں کھاتا۔ آج کل تو ویسے بھی وہ گھر پر کھانا گاہے گاہے ہی کھاتا ہے۔'' اماں کے لہجے میں پوتے کی محبت لشکارے مار رہی تھی۔

افراح کو اچھا خاصا رشک آیا' موصوف کی خوش بختی پر۔ گھر کا ہر فرد اُس سے خصوصی سلوک روا رکھتا تھا۔ شاید وہ تھا بھی کچھ مختلف سا۔

سنجیدہ بلکہ خوش مزاج' کم گو۔ ہمہ وقت مصروف و مگن اور نہایت پُر تکلف انداز کا مالک۔ ایسا تکلف جس سے گریز اور اجنبیت ٹوٹ ٹوٹ کر برستی ہے۔

ان پانچ دنوں میں اُس نے اُس شخص کو شاذ ہی کسی سے مخاطب ہو کر تفصیلی بات کرتے دیکھا تھا۔

انتہائی ضرورت کے وقت بھی وہ مختصر ترین لفظوں میں اپنا مدعا بیان کرتا اور کام کی بات

کرنے کے فوراً بعد منظر سے غائب ہو جاتا تھا۔

اتنے ہنستے مسکراتے' کھلکھلاتے چہچہاتے ماحول میں ایک شخص کی اس درجہ کم آمیزی
گھریلو معاملات سے عدم دلچسپی کم از کم افراح کو تو بہت کھٹکتی تھی۔

"اے مادام' تم ادھر بیٹھی ہو۔ ہم ڈھونڈ ڈھونڈ بھاوا ہو گئے۔"

اسما ڈیوڑھی میں داخل ہوتے ہوئے اُسے دیکھ کر اپنے مخصوص بے فکرا اسٹائل میں گویا ہوئی۔

"ایسی کیا قیامت برپا ہو گئی ہے جو تو اُسے ڈھونڈنے چل پڑی اور گھر کون سا محل جتنا
ہے جو تیرا یہ حال ہو گیا؟" اماں جی نے ناک سکوڑ کر پوتی کو لتاڑا تھا۔

"صغریٰ چاچی نے دَم کے کباب بنائے ہیں۔ بُلا رہی ہیں اپنے پورشن میں۔"

"زبردست۔" اسما کی زبانی دم کے کباب کا ذکر سن کر افراح نے چٹخارہ لیا۔

"چلو چلتے ہیں۔" وہ بے تکلفی سے دوپٹہ شانے پر سیٹ کر کے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"اے صغریٰ سے اتنا نہ ہو سکا کہ پلیٹ بھی بچی کے لیے اور ہمارے چکھنے کے لیے ادھر
بھجوا دیتی۔ لے کے بلاوا بھیج دیا۔"

صفیہ اندر داخل ہوتے ہوئے تلملا کر گویا ہوئیں۔ دیورانی کے پیغام نے انہیں اچھا خاصا
دیا تھا پھر یوں بھی کھانے پینے کی صفیہ بہت شوقین تھیں۔ اپنے ہاتھ سے کم دوسروں کے ہاتھ
کھانے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتی تھیں' اسی لیے دن بدن پھیلتی ہی چلی جا رہی تھیں۔

"وہ بھی تو افراح کی ممانی کا گھر ہے۔ گھر بھی کیا ایک چھوٹا سا باغیچہ ہی تو ہے' دونوں پور
کے درمیان۔ کیا ہوا جو انہوں نے ادھر بلوا لیا اور آپ کے اور اماں کے لیے وہ توقیر کے ہاتھ ٹر
میں بھجوا رہی ہیں۔"

اسما نے ماں کی پوری طرح تسلی کرائی تھی۔ بڑوں کے درمیان جو کھٹ پٹ رہتی تھی' اس
بچوں کے آپس کے تعلقات میں قطعی فرق نہیں پڑا تھا۔ ان کے دل اسی طرح صاف شفاف آ
کی طرح جگمگاتے رہتے تھے۔

صغریٰ بیگم کے پورشن میں ایک ہنگامہ مچا ہوا تھا۔ ساری نوجوان پارٹی کبابوں کی خوشبو سونگ
ہوئے ادھر ہی آ گئی تھی۔

"آئیے آئیے' مہمان خاص! آپ ہی کا انتظار تھا۔" حارث نے افراح کو آتے دیک
لہک کر کہا۔

"جی ہاں! اور وہ بھی خالی پلیٹ کے ساتھ۔" اسما نے اس کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی پلیٹ
رکھ کر اُسے گھورا۔ پلیٹ میں موجود آخری کباب بھی حارث کے ہاتھ سے سفر کرتا ہوا منہ کے
ذریعے معدے تک رسائی حاصل کر چکا تھا۔

"لگتا ہے' سارے ندیدے آج ہمارے گھر میں جمع ہو گئے ہیں۔" کچن سے برآمد ہوتی
ہوئی افزا نے ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے خوشدلی سے ارشاد کیا۔

"دیکھ لو افراح! یہ ہے اُن کی مہمان نوازی کا عملی نمونہ۔" حارث نے اسے طیش دلانے کی
کوشش کی۔

وہ آہستگی سے مسکرا دی۔

"افراح ہمیں تم سے زیادہ اچھی طرح جانتی ہے۔ بھڑکانے کی ناکام کوشش مت کرو۔"

اسما دھپ سے کشن نکال کر نیچے دری پر تشریف فرما ہو چکی تھی۔

"آ گئی ہو بیٹی!" صغریٰ بیگم ٹرے میں کبابوں کی پلیٹ' گھر کے تلے ہوئے چپس اور چائے
کے دیگر لوازمات سلیقے سے سجا کر لے آئی تھیں۔

"آ جاؤ جلدی سے۔ وگرنہ یہ آفت مارے سب کچھ چٹ کر جائیں گے۔ اے صبح سے
ٹھونسنے لگے ہیں۔ حلق تک "بھرائی" کر چکے ہیں مگر نیتیں سیر ہونے کا نام نہیں لیتیں۔"

صغریٰ بیگم نے بلا تخصیص علاوہ افراح کے سب کو کچا چبا جانے والی نظروں سے دیکھا تھا۔

"اے توقیر' اپنی صفیہ تائی کے ہاں دے آیا ہے نا' کبھی وہ تیوری چڑھا لیں کہ جٹھانی کو نہیں
پوچھا۔ غصہ تو ویسے بھی اُن کی ناک پر دھرا رہتا ہے۔" وہ افراح کے آگے چیزیں رکھتے ہوئے منہ
بنا کر کہہ رہی تھیں۔

"اُن کا بھی آپ کے بارے میں کچھ یہی خیال ہے۔ کتنی ذہنی ہم آہنگی ہے دیورانی جٹھانی
میں۔"

توقیر نے فراخدلی سے دانت نکالے' جواب میں اپنی امی حضور کا زوردار دھموکا کمر پر وصول
کرنا پڑا۔

"ناہنجار' بدذات کہیں کا۔ جب بولے گا بے تکا ہی بولے گا۔ اے میرے انہوں نے کون
سے مربعے واپس کرنے ہیں جو اُن سے پرخاش رکھوں گی۔ دو برتن بھی ہوں تو پاس پڑے بج ہی
جاتے ہیں۔ اس میں حیرت کیسی۔"

افراح نے ایک بات خصوصیت سے نوٹ کی تھی کہ اس گھر کے مکین بے رحمی کی حد
صاف گو اور کھرے تھے۔ جو خیال بھی ان کے دل میں جڑ پکڑتا' کسی طور زبان کی سرحدیں
کے باہر آجاتا تھا۔ آپس میں کوئی پردہ' کوئی دیوار نہ تھی۔

جو بھی دل میں خیال آگیا کہہ دیا۔ اکثر تو یہاں یہ عالم رہتا تھا کہ صفیہ' صغریٰ کے بچ
موجودگی میں ان کی ماں کے خلاف غبار نکال رہی ہوتی تھیں اور صغریٰ بیگم بے جھجک اسما
ہارون اور طیبہ وغیرہ کے سامنے صفیہ کے متعلق نکتہ چینی کرتی رہتی تھیں۔ دونوں اطراف سے چھا۔
پارٹی قطعی توجہ نہ دیتی کہ سب جانتے تھے' جتنی ظاہری عداوت ہے اس سے دوگنی باطنی قر
یگانگت فریقین کے دل میں ایک دوسرے کے لیے موجود ہے' سو وہ لوگ اسے قطعی نارمل اور مو
کے سے انداز میں لیتے تھے۔

"رضوانہ بھابی نظر نہیں آرہی ہیں۔" افراح نے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے صغریٰ بیگم
استفسار کیا۔

"بازار گئی ہے' احمد کے ساتھ۔ کچھ خریداری کرنا تھی۔ کپڑے لتے جوتے وغیرہ۔ اے
مجھے یاد آیا' اسما اپنی امی سے پوچھنا' انہوں نے جانے کے لیے تیاری کر لی ہے یا نہیں۔ پندرا
ہی تو رہ گئے ہیں شادی میں۔ ہمیں کم از کم دو دن پہلے تو پہنچ جانا چاہیے۔ رضوانہ تو کل صبح سو
احمد کے ساتھ روانہ ہو جائے گی۔ اُس کے بھائی کی شادی ہے آخر' سو کام ہوتے ہیں۔" وہ گ
کہہ رہی تھیں۔

ویسے تو جب سے تاریخ طے کی گئی تھی' رضوانہ بھابی تین چار دفعہ چکوال اپنے میکے کا چ
چکی تھیں مگر ایک آدھ ہفتے بعد واپس روانہ ہو جاتی تھیں کہ بچوں کی پڑھائی کا مسئلہ تھا۔

"امی تو شاید نہ ہی جائیں چاچی۔" اسما نے سوچتے ہوئے کہا۔ اسے ماں کے بر فیلے ت
آگئے تھے۔

"اے' کیسے نہیں جائیں گی۔ لو یہ بھی بھلی ٹھانی اُنہوں نے۔" صغریٰ بیگم کو تپ چڑھ گ
"میں اماں جی سے بات کروں گی۔ رضوانہ صرف میری ہی نہیں اس گھر کی بھی بہو ہ
سنے گی تو اُس کا دل کتنا میلا ہوگا پھر یوں بھی ہماری ریت رہی ہے کہ کسی شادی میں بلا امتیاز
کے ساتھ شریک ہوتے ہیں۔" انہیں خاصا صدمہ پہنچا تھا۔

"خیر میں جانتی ہوں۔ وہ احمد کی رضوانہ سے شادی کی رٹ پر خوش نہیں تھیں۔ احمد کے

نہیں اور دیکھ چکی تھیں اس لیے بہو سے کھچی رہتی ہیں۔ بہرحال تم لوگ اپنی تیاری رکھو۔ میں صفیہ
بن کو راضی کر لوں گی اور اگر میری نہ سنیں گی تو اماں جی کو اس مشن پہ لگا دوں گی۔ اماں جی کو انکار
کرنا ان کے لیے ممکن نہیں ہوگا۔" صغریٰ بیگم خود ہی حل بتا کر مطمئن ہو گئیں۔

"ہم تو دل و جان سے تیار ہیں چاچی۔" طیبہ چہک کر بولی۔

"افراح بھی چلے گی نا' ہمارے ساتھ۔" افزا نے اُمید بھری نظروں سے ماں کو دیکھ کر

"کیوں نہیں۔ عجیب بات کرتی ہو۔ وہ یہاں اکیلی کیا کرے گی۔ خاندان سے باہر کی تو
نہیں ہے وہ۔" صغریٰ بیگم نے افزا کو ڈانٹ پلائی۔

"کیوں بیٹی' چلو گی رضوانہ کے میکے؟"

"آپ لوگ چلیں گے تو میں بھی ایڈونچر کے طور پر ساتھ ہو لوں گی۔ چکوال میں کس جگہ رہتی
ہیں بھابی؟"

"بلوکسر ہے اُن کے گاؤں کا نام۔ شاید تم نے سنا ہو۔ چکوال سے بارہ کلومیٹر دور ہے۔ اس
گاؤں کے ساتھ ہی تمہاری صفیہ ممانی کا میکہ ہے۔"

"لیں تو بھلا پھر صفیہ ممانی کیوں نہیں جائیں گی۔ اسی بہانے اپنے میکے والوں سے بھی مل
لیں گی۔" افراح کو اچھا خاصا اچنبھا ہوا۔

"بس اُن کی مرضی اور موڈ کی بات ہے ساری۔" اس سے آگے صغریٰ بیگم سکون سے بات
جاری نہ رکھ سکیں' اسی دوران بڑی دیر سے پنجہ آزمائی کرتے کشتیاں لڑتے' راشد اور توقیر بڑے
زوردار انداز میں اُن کے کمرے سے کچھ فاصلے پر دھڑام سے آگرے تھے۔ رضوانہ کے بچے
دونوں کی کشن اور پلاسٹک کے چھوٹے موٹے برتنوں سے "مدد" کر رہے تھے اور باقی لوگ دلچسپی
سے خونی لڑائی ملاحظہ کر رہے تھے۔

"اوئی میرے اللہ! یہ کیا کر رہے ہو تم دونوں؟" اُن کے پھٹے ہوئے گریبان' بکھرے بال
اور دگرگوں حالت دیکھ کر صغریٰ بیگم کا کلیجا دہل گیا۔ بے اختیار سینے پر ہاتھ رکھ کر بولیں۔ "چھوڑو
ایک دوسرے کو۔ میں کہتی ہوں ہٹو پرے ورنہ میں اماں کو آواز دینے لگی ہوں۔"

دھمکی کارآمد ثابت ہوئی' فریقین ایک دوسرے کو چھوڑ کر الگ ہو گئے۔

"یہ کیا ہو رہا ہے' کم بختو! کسی پل تو امن چین سے بیٹھ جایا کرو۔" انہوں نے بلاتوقف دونوں

کو ایک ایک دھول جمائی۔

"کچھ نہیں امی! ہم ذرا فائٹ کر رہے تھے۔" توقیر نے بال درست کرتے ہوئے
سے وضاحت کی۔

"آپ نے خواہ مخواہ سارے میچ کا مزہ خراب کر دیا۔ اتنا زبردست نظارہ دیکھنے کو
تھا۔" افزا نے شرارت سے چاچی کو دیکھ کر آنکھیں جھپکائیں۔

"ٹھہر جا' پہلے تجھے میں نظارہ کرواتی ہوں۔" صغریٰ جوتی لے کر اُس کے پیچھے لپکیں
ایک چھلانگ میں باغیچہ عبور کر کے تائی کے پورشن میں پہنچ چکی تھی۔

"ٹھہر جا یار دا نظارہ لین دے۔" حارث بڑے مسرور انداز میں گا رہا تھا۔
افراح سے ہنسی روکنا محال ہو گیا۔ یہاں اسی طرح بات بے بات ہنگامہ برپا رہتا تھا
ایک پورشن میں تو کبھی دوسرے میں۔"

تھوڑی دیر بعد مطلع صاف ہونے پر افزا دوبارہ اپنے پورشن میں واپس آ گئی تھی۔
ڈرے ڈرے مگر شرارتی انداز میں ماں سے مخاطب ہوئی۔

"قسم سے امی اب اپنی جوتی کا اسکڈ میزائل نہ داغ دیجئے گا۔ مجھے صفیہ تائی نے بھیجا
وہ کہہ رہی ہیں اگر دو چار کباب بچ رہے ہیں تو دے دیں۔ ہارون بھائی آئے ہیں' انہیں
کے ساتھ دینے ہیں اور رائتہ بنانا انہیں یاد ہی نہیں رہا۔ اس لیے اگر کل شام کی پودینے کی چٹنی
ہو تو وہ بھی دے دیں۔ دہی میں گھول کر ساتھ رکھ دیں گی۔"

"ہارون آ گیا ہے۔" صغریٰ کی آنکھوں میں محبت اور خوشی رقص کرنے لگی۔ ہارون سے
بلا امتیاز پیار کرتے تھے۔ کچھ لوگوں میں دوسروں کے لیے بڑی خاص کشش ہوتی ہے۔

"میں نے اُس کے لیے پہلے ہی کچھ کباب سنبھال کر رکھے ہوئے تھے۔ چٹنی تو نہیں
صبح احمد کے بلو نے پراٹھے کے ساتھ کھالی تھی۔"

"لائیں ممانی! مجھے دے دیں۔ میں اُدھر ہی جا رہی ہوں۔" صغریٰ پلیٹ لے کر کچن میں
نکلیں تو افراح کھڑی ہو گئی۔

"اے بچی! بیٹھو نا' دم بھر کو۔ رونق لگی ہوئی تھی۔" صغریٰ نے محبت سے روکا مگر افراح
نرمی سے انکار کر دیا۔ یکا یک ہی اُس کا دل صفیہ ممانی کے ہاں جانے کے لیے مچل گیا تھا۔
تھی یہ تو وہ خود بھی نہیں جانتی تھی۔

"اسلام وعلیکم ہارون بھائی!" وہ آئی تو ہارون کو اماں جی کے پاس بیٹھے دیکھ کر آہستگی سے
سلام جھاڑ دیا۔

بلیو شرٹ اور سیاہ پینٹ میں ملبوس گندمی سرخی مائل چہرے پر حسب معمول تفکر کے عکس لیے
اماں جی سے محو گفتگو ہارون نے توجہ بٹنے پر ایک دم سر اُٹھا کر پلٹ کر دیکھا تھا۔

"وعلیکم السلام۔ کیسی ہو افراح بی بی۔" وہ دھیرے سے جواب دیتے ہوئے سنجیدگی سے سر
جھکا کر بریانی کی پلیٹ پر جھک گیا تھا۔

"ٹھیک ہوں۔" وہ بھی کہہ سکی۔

اس شخص کی شخصیت میں کچھ ایسا طلسمی سا مرعوب کن تاثر جھلکتا تھا کہ مخاطب چاہتے ہوئے
بھی کچھ کہنے کی ہمت خود میں نہیں پاتا تھا۔

پورے ایک ہفتے بعد شکل دکھائی ہے۔ اے میں کہوں' بچے! یہ کس قسم کی نوکری ہے۔ جو دن
دیکھتی ہے نہ رات۔ تمہارے کام کے کوئی اوقات مقرر نہیں ہیں کیا؟" اماں جی کو اس سے سخت
شکایت تھی۔ ہارون خفیہ میں ملازم تھا اور ایک انتہائی حساس پوسٹ پر کام کر رہا تھا۔ کام کیا تھا' اس
بارے میں پورا گھر لاعلم تھا۔

"بس اماں جی' کام ہی کچھ ایسا ہے۔" وہ ٹالنے والے مؤدب لہجے میں گویا ہوا۔ "یہ بتائیں'
آپ دوائیں باقاعدگی سے کھاتی ہیں نا۔ اگر ختم ہو گئیں ہوں تو بتا دیجئے گا' میں واپسی پر لے آؤں
گا۔"

اماں بھی گٹھیا کی مریض تھیں۔

"اے چھوڑو بچے! بڑھاپا بذات خود سو بیماریوں کی ایک بیماری ہوتا ہے۔ ڈاکٹر پیسے
بٹورنے کے لیے اپنی مرضی کے نام دیتے رہتے ہیں۔ کبھی جوڑوں کا درد تو کبھی بلڈ پریشر۔ کبھی
شوگر تو کبھی دل کی بیماری۔ ہٹاؤ۔ تم اپنی کہو۔ ٹھیک تو رہے میرے لال۔" اماں جی لاپروائی سے

"مجھے کیا ہونا ہے اماں جی۔" وہ سر جھکا کر چمچ سے پلیٹ کو کریدنے لگا۔ اس کی گہری سیاہ
آنکھوں میں کس قسم کی رنجیدہ و مضمحل یاسیت تیر رہی تھی' افراح جان تو نہ سکی البتہ اُس کا دل دکھ کے
کسی گہرے پاتال میں ڈوب گیا۔

"ایسے نہ رہا کرو میرے بچے۔ میرے چاند۔" اماں جی نے بے ساختہ اُس کا سر چوم لیا۔

"اے میرا بس چلے تو دو جہاں کی خوشیاں تیرے قدموں میں ڈال دوں۔ میری آنکھ کی ٹھنڈک' تیرے دل کی مراد پوری کر دوں مگر کیا کروں' اپنی جگہ مجبور ہوں۔"

انہوں نے ٹھنڈی سانس لی۔ دونوں دادی پوتا اُس کی موجودگی کو قریب قریب فرا چکے تھے۔

"چھوڑیں' اس قصے کو اماں جی۔" افراح نے دیکھا' اس کی آنکھوں میں عجیب سا سوز تھا ہونٹ دانتوں تلے دبائے' وہ خاموش خاموش سا گہری سیاہ دلکش آنکھوں اور گندمی رنگ والا مرد اُس سے عجب بے بس سا دکھائی دے رہا تھا۔

"اس کا دل اتنا پتھر کیوں تھا۔ عورت تو اتنی بے رحم نہیں ہوا کرتی۔ چھ سال کم تو نہیں ہ جاننے بوجھنے کے لیے۔ کیا کمی تھی' میرے لال میں! کیوں اُس کے سینے میں بند چٹان سا دل پگھلا۔ اے کبھی نظر آئی تو مجھ سے ضرور ملوانا۔ میں بھی دیکھوں' کس شیر کے جگر والے مرد کی ہے وہ۔ لے کے میرے بچے کی زندگی تباہ کر ڈالی۔ روگ لگا دیا' بھری جوانی میں۔" اماں آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے تھے۔ لہجے میں غم و غصے اور بے بسی کی جھلک تھی۔

"اماں جی پلیز۔" وہ اُن کے شانے پر بازو رکھ کر ہارے ہوئے انداز میں انہیں تسلی لگا۔ "جو ہوا سو ہوا۔ بھول جائیں سب کچھ۔"

"اے کیسے بھول جاؤں۔" اماں جی کے لہجے میں طیش گھلنے لگا۔ "تم نے اپنے اوپر خوشی کے دروازے بند کر لیے ہیں۔ تیرے سے ڈیڑھ برس چھوٹا سا احمد' آج اُس کے آنگ ماشاء اللہ' تین بچے کھیل رہے ہیں۔ تیرے ساتھ کے سب لڑکوں کی شادیاں ہو چکی ہیں۔ اللہ' ہنستی بستی زندگی گزار رہے ہیں۔ اولاد کا سکھ' بیوی کی محبت' گھر کی رونق۔ کون سی خوشی نہیں اُن کے آنگن میں اور تم اکیلے' گم صم اور اُداسی کے اندھیروں میں لپٹے پڑے رہتے ہو۔"

"یہ تو اپنے نصیب کی بات ہوتی ہے اماں جی! آپ کیوں اپنا دل چھوٹا کرتی ہیں۔" ا جی کی افسردگی کم کرنے کے لیے ہلکے پھلکے انداز میں گویا ہوا۔

"نصیب بدلے بھی تو جا سکتے ہیں۔ اے بیٹے! دیکھو' گنجائش تو نکل سکتی ہے نا۔" لجاجت سے اس کا بازو تھام کر بولیں۔ "وہ زندگی کا 'آخر' تو نہیں ہے نا۔ تم ایک دفعہ شادی کی حامی بھر لو۔ دیکھنا' کتنی اچھی اور نیک طبیعت کی لڑکی ڈھونڈ کر لاؤں گی تمہارے لیے۔ سا بھلا دے گی وہ۔"

"آپ آرام کریں اماں جی!" وہ کترا کر اُٹھنے لگا۔ اُن کی بات یوں نظر انداز کی تھی جیسے سنی نہ ہو۔

"اے بہت آرام کر لیا۔ تم میری بات سنو دھیان سے۔" انہیں طیش آ گیا پھر اچانک ہی وار گیر الماری سے ٹیک لگائے نیلے پرنٹڈ کپڑوں میں ملبوس افراح پر نظر پڑی تو کچھ کہتے کہتے رک گئیں۔ "ایسے کیوں کھڑی ہو بچے' ادھر آ کر بیٹھو میرے پاس۔"

"میں چلتی ہوں' اماں جی' ممانی بلا رہی ہیں شاید۔" اماں جی کے متوجہ ہونے پر وہ ایک دم جل سی ہو گئی تھی پھر کچھ سمجھ نہیں آیا تو وہ باہر نکل گئی۔

"اس کو دیکھو' تمہاری پھوپو کی بیٹی ہے۔ کیسی نیک طبیعت' سعادت مند اور میٹھی زبان والی بچی ہے کہو تو۔" اماں جی کے ارمان اُن کی آنکھوں سے ٹپکنے لگے تھے۔

"پلیز اماں جی۔" ہارون نے بات مکمل ہونے سے پہلے ہی جھنجلا کر ٹوک دیا تھا۔ "آپ میرے بارے میں نہ سوچا کریں۔ میں آپ سے درخواست کر چکا ہوں۔ حارث اور توقیر شادی کی عمر کو پہنچ چکے ہیں۔ آپ اُن کے بارے میں خیال کریں۔"

"افراح میں کیا خرابی ہے جو۔" اماں جی کو دلی صدمہ لاحق ہو گیا۔

"خرابی کسی میں بھی نہیں ہے اماں جی' سب اپنی جگہ بہت اچھے ہیں مگر شاید میں کسی کے قابل نہیں ہوں۔ میں اسی طرح خوش ہوں۔ مزے میں ہوں۔ پلیز مجھے ڈسٹرب نہ کیا کریں۔"

اس کے لہجے کا حتمی پن محسوس کر کے اماں جی دل مسوس کر رہ گئیں۔

"اور ایسا ویسا تذکرہ کہیں افراح کے سامنے نہ کر دیجئے گا۔ لڑکیوں کے جذبات بڑے نازک ہوتے ہیں۔ کبھی وہ مجھ سے کوئی اُمید وابستہ کر لے۔ وہ میرے لیے محض طاعرہ پھوپو کی بیٹی ہے اور میں اول تا آخر اُس سے یہی رشتہ قائم رکھنا چاہتا ہوں۔ اب اس طرح سے سوچئے گا بھی نہیں۔"

اور کھڑکی سے لگی افراح قدموں کی چاپ سن کر فوراً سے پیشتر دبے پاؤں اپنے کمرے میں گھس گئی تھی۔

"سن تو میں چکی ہوں بالآخر۔" وہ بستر پر گر کر ساکت سی سوچ رہی تھی۔ اپنا نام نانی کے منہ سے سن کر وہ فطری تجسس کے تحت کمرے کے بیرونی کھڑکی کے پاس ٹھہر گئی تھی اور اپنے متعلق ہونے والی ساری گفتگو اُس کی سماعت تک رسائی حاصل کر چکی تھی۔

وہ کچھ بھی سوچنا نہیں چاہتی تھی مگر اُس کا ذہن اسے اُلجھاؤں میں ڈال دیا تھا۔

"اماں جی کو کیا ضرورت تھی۔ اس طرح کی بات کرنے کی۔" اسے عجیب سی شرمندگی
ہارون کا سامنا کرنے سے گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ "اماں جی لے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا۔"
اس نے ذہن بٹانے کے لیے دوسرے پہلو سے اس ساری گفتگو کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔

اماں جی کی باتوں اور ہارون کے طرزِ عمل سے واضح ہوتا تھا کہ موضوعِ گفتگو کوئی لڑ
تھی۔ وہی جس کی خاطر ہارون بھائی نے اب تک شادی نہیں کی اور جو گزشتہ چھ سالوں سے
کے دل کے تخت پر دھڑلے سے براجمان ہے۔

"تو گویا یہی وجہ ہے اُن کی کم آمیزی، سنجیدگی اور گم صم رہنے کی۔" وہ جیسے کسی نتیجے پر
چاہ رہی تھی۔

اماں جی کی مبہم باتوں سے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ "ناکامی" کا سبب لڑکی کی عدم دلچسپی
یعنی "اُدھر" سے انکار ہوا تھا مگر کیوں۔

اتنے ڈیسنٹ، اتنے قابل اور شاندار شخص کے لیے کون انکار کر سکتا ہے۔ لڑکیاں تو
بھرپور مردوں کے خواب دیکھا کرتی ہیں۔

اُسے اس نادیدہ لڑکی پر حیرت ہو رہی تھی۔ "آخر اس نے کس دل سے انکار کیا ہوگا یا
ہے کہ اُس کی دلچسپی کہیں اور ہو۔ وہ ہارون بھائی سے پہلے ہی اپنے دل کے آسمان کا چاند بنا
چکی ہو۔"

"دل کے معاملے میں دلیلیں کہاں چلا کرتی ہیں۔"

مگر میں کیوں خواہ مخواہ یہ سب کچھ سوچے چلی جا رہی ہوں۔ وہ عجیب سی غیر مطمئن کی
میں بستر سے اٹھ بیٹھی اور بے نتیجہ سوچوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے اپنے کپڑے نکا
نہانے کے لیے باتھ روم میں گھس گئی۔

فریش ہو کر ہال کمرے میں آئی تو وہاں امن ہی امن پایا جاتا تھا۔ اسما ٹی وی لگا
اسٹیج شو دیکھ رہی تھی۔

"باقی لوگ کدھر ہیں؟" وہ اُس کے برابر میں بیٹھتی ہوئی پوچھنے لگی۔

"باقی تو ابھی تک صغریٰ چاچی کی طرف ہیں۔ ہارون بھائی اور اماں جی ابھی تھوڑی د
باہر نکلے ہیں۔ امی شاید کچن میں ہیں۔"

"میرے ساتھ ذرا مٹر کے دانے تو نکلوا دو۔ گاجروں میں ڈالنے ہیں۔" اس لمحے میں صفیہ
پلاسٹک کی چنگیر میں مٹر لیے اندر آئی تھیں۔

"اچھا امی! ایک منٹ۔" اسما کی بے تاب نظریں اسکرین پر تھیں، جہاں ابھی ابھی فلم انڈسٹری
کی مشہور اداکارہ مینا کو اسٹیج پر آنے کی دعوت دی جا رہی تھی۔ ہال میں بیٹھے لوگ اپنی پسندیدہ اداکارہ
کی آمد کا تالیاں بجا کر پُرجوش خیر مقدم کر رہے تھے۔

"مینا آپ گزشتہ دس سال سے فلم انڈسٹری میں چھائی ہوئی ہیں۔ آپ نے پنجابی کے
ساتھ ساتھ کچھ اردو فلموں میں بھی کام کیا۔ اسٹیج ایکٹریس بھی رہیں۔ ان دس سالوں میں آپ نے
سینکڑوں رول کیے۔ ہیروئن کے طور پر بھی بے مثال کامیابی حاصل کی اور کیریکٹر رول بھی اپنی
جاندار اداکاری کی بدولت بہت ہی عمدہ طریقے سے کیے۔ آپ کو ورسٹائل ایکٹریس بھی کہا جا سکتا
ہے۔ یہ بتائیے، دس سال سے جو آپ مقبولیت اور پسندیدگی کا ریکارڈ برقرار رکھے ہوئے ہیں، اس
کے پیچھے کیا راز پوشیدہ ہے۔"

"اُف کتنی حسین، کتنی اسمارٹ اور کتنی طرح دار لیڈی ہے۔ مجھے اس کی فلمیں بے حد پسند
ہیں۔" اسما جو انتہائی شوق سے اسکرین کی طرف دیکھتے ہوئے جوش سے کہہ رہی تھی۔

"بند کرو یہ بکواس۔ کس فضول کام میں لگی ہوئی ہو۔" یکایک صفیہ نے اُس کے ہاتھ سے
ریموٹ کنٹرول چھین کر ٹی وی آف کر دیا۔ افراح نے تعجب سے اُن کی سمت دیکھا۔ ان کا چہرہ
لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ آنکھوں میں غصے کی سرخیاں چھلک رہی تھی۔

"کبھی کام کی طرف بھی دھیان دے لیا کرو۔ خبردار جو میں نے تمہیں آئندہ ایسے پروگرام
میں دلچسپی لیتے دیکھا۔" وہ افراح کی پرواہ کیے بغیر اسما کو پھٹکار کر باہر نکل گئی تھیں۔

"دراصل امی کو فلمی دنیا کے لوگ بالکل اچھے نہیں لگتے، اس لیے۔" اپنی جگہ حق دق بیٹھی اسما
خجالت چھپانے کے لیے پھیکی سی مسکراہٹ ہونٹوں پر لا کر افراح کو معذرت خواہانہ نظروں سے
دیکھنے لگی۔

"مجھے تو یوں لگا، جیسے انہیں یہی ایک فلمی چہرہ اچھا نہیں لگا۔ افراح دل میں سوچ رہی
تھی۔

"آخر اداکارہ مینا سے صفیہ ممانی کو کیا پرخاش ہو سکتی ہے؟"

☆☆☆

''بی بی جی۔ بی بی جی۔'' خیراں سر پر پاؤں رکھے گیٹ سے اندر کی طرف بھاگی چلی رہی تھی کہ معاً اس کا پاؤں رپٹا اور وہ کیاری میں جا پڑی۔''

''او فٹے منہ۔ اندھی گھوڑی کی طرح فراٹے بھرتی دوڑی چلی جا رہی ہے۔ لے کر میر ساری محنت برباد کر دی۔'' سرسبز گراؤنڈ کے ایک قطعے پر کھدائی کر کے مختلف پودوں اور پھولوں ک بیج اور کھاد ڈالتا ہوا رمضو بے لحاظ اُسے لتاڑنے لگا تھا۔

اس کا گہرا سانولا جفاکش چہرہ پسینے سے شرابور تھا اور وہ کمر پہ ہاتھ رکھے لال کرتے اور کا شلوار میں ملبوس بھرے بھرے جسم والی نک چڑھی سی خیراں کو کڑے تیوروں سے گھور رہا تھا۔

''نا' مینوں کی خبر سی کہ تو نے راہ میں بازار لگایا ہوا ہے۔'' خیراں کپڑے جھاڑتی ہوئی اُ اور شرمندہ ہوئے بغیر اس پر چڑھ دوڑی۔

''میں تو بی بی جی کو ایک خاص خبر دینے کے لیے لپکی جا رہی تھی۔'' اس نے مزید ناک بھ چڑھا کر رمضو کو دیکھا۔

''بی بی جی کہیں بھاگی تو نہیں جا رہی تھیں جو تو اندھوں کی طرح دوڑ پڑی۔'' رمضو نے اُ کی خبر لی۔

اس بچارے کی ساری محنت اکارت گئی تھی۔ کتنی دیر سے مٹی ہموار کر کے کیاریاں بنانے ا بیج بونے میں لگا ہوا تھا۔ ''میں تیری شکیت (شکایت) کروں گا بی بی جی سے۔''

''کر لے جتنی مرضی تو شکیتیں۔'' خیراں نے خاطر میں نہ لاتے ہوئے تنک کر کہا۔

''دفع ہو جا' یہاں سے اب تو۔ سخت بُری لگ رہی ہے مجھے۔'' رمضو نے دانت کچکچا کر خو نظروں سے اُسے گھورا۔

''او خانہ خراب کا باچہ! تم کیوں لڑائی کرتی ہے اس چوکری (چھوکری) سے۔'' ادھیڑ پٹھان چوکیدار گل خان انہیں بھڑتے دیکھ کر ادھر آیا تھا ''اور لڑکی' تم ادھر کیا کرتا ہے۔''

''کرتی تو یہ ہے خان چاچا۔ میں تو ''کرتا'' ہوں۔'' رمضو نے پٹھان کی پشتو نما اردو لطف لیا۔ پٹھان اردو بولتے ہوئے اسی طرح مذکر مونث میں گڑبڑ کر دیا کرتے ہیں۔

''یہ چھوٹا باچہ ادھر ادارہ کے گیٹ پر کپڑے میں لپٹا پڑا ملا ہے۔ اس کو بی بی جی کو خیراں۔'' گل خان نے جھولی میں سنبھالا نوزائیدہ بچہ خیراں کی طرف بڑھا دیا۔

''اسی کی خبر دینے تو میں بی بی جی کے پاس جا رہی تھی۔'' خیراں نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔

''اتنا نہیں ہوا' بے وقوف سے کہ پہلے بچہ اُٹھا لیتی۔'' رمضو نے اُسے شرمندہ کرنے کی کوشش کی۔

''ام سوچتا ہے کہ کیسا جگرا ہوتا ہو گا ایسی ماؤں کا۔ اپنی جان کا ٹکڑا یوں پھینک جاتا ہے۔ ایسا تو جناور (جانور) بھی نہیں کرتا۔'' گل خان کے لہجے میں افسوس' ملامت اور دکھ کی آمیزش تھی۔

بچے کی نرم گلابی جلد نیلی پڑنے کو تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں مگر وہ سانس لے رہا تھا۔ وہ ہلکے بھورے بدرنگے سے موٹے کھدر کے کپڑے میں لپٹا ہوا تھا۔ جسم پر کسی قسم کا سلا ہوا لباس نہیں تھا۔

''کالے کرتوتوں کی نشانی کو کون کلیجے سے لگاتا ہے خان چاچا۔'' خیراں نے بچے کے گال تھپتھپا کر گہری سانس لی۔

''لو بی بی جی خود ہی ادھر آ گئیں۔'' رمضو نے عمارت کی سیڑھیاں طے کر کے اس طرف آتی ایک خوش پوش اور خوش شکل لڑکی کو دیکھ کر خوش دلی سے اطلاع دی۔ لڑکی کی آنکھوں کا رنگ سنہرا تھا اور چہرے کی رنگت خوبانی سے ملتی جلتی تھی۔ اُجلی مگر چمکدار اور ہلکی سی زردی لیے ہوئے سیاہ گھنے بالوں کی موٹی سی خوب صورتی سے گندھی چٹیا اس کی کمر پر اِدھر اُدھر جھول رہی تھی۔ قد لمبا اور بدن چھریرا سا تھا۔

اس کے چہرے کے تاثرات میں بڑی ملاحت' نرمی اور اپنائیت کی جوت تھی۔ اس کی سنہری آنکھوں میں عجیب سی متاثر کن سوگواری تھی۔ جو بڑی جچتی تھی اُن آنکھوں میں۔

''اوہو۔ ہمارے ادارے میں ایک نیا مہمان آیا ہے۔'' بچے کو دیکھتے ہی اُس کی سنہری آنکھوں میں دلچسپ سی جھلملاہٹ جاگی تھی۔

''لاؤ اس ننھے فرشتے کو مجھے دو۔'' اُس نے لپک کر بھورے بدرنگ کھدر میں لپٹے اس بچے کو اپنی آغوش میں لے لیا اور نرمی سے اس کی ننھی مُنّی سی پیشانی پر بوسہ دیا۔

''آپ اسے فرشتہ کہہ رہی ہیں بی بی جی۔ نہ جانے کس کے کرموں کا پھل ہے۔ کن کالی گھڑیوں کا ثمر ہے۔'' خیراں کے جملوں میں بڑی معنویت' بڑی گہرائی تھی مگر اس نے چنداں توجہ نہ کی۔

''ایسا نہیں کہتے۔ خدا تو ہر بچے کو اپنی فطرت پر پیدا کرتا ہے۔ یہ بھی معصوم اور پاک ہے۔ جس نے اسے جنم دیا' اس کے دل اور مقدر کی سیاہی میں اس نیک روح کا کوئی حصہ نہیں رہا۔ جو

اُسے اس دنیا میں لانے کے ذمے دار ہیں وہ اپنی کرنی خود بھگتیں گے۔ اُن کی بد اعمالی کی سزا
بچے کو کیوں ملے۔ یہ تو بے گناہ ہے۔ گل خان! تم ڈاکٹر فرزانہ کے کلینک فون کرو۔ اُس سے
تفصیلی میڈیکل چیک اپ کروائیں گے اور خیراں! تم دودھ، شہد اور تھوڑا سا پانی لے کر بابا صاحب
کے کمرے میں آ جاؤ۔ میں اس بچے کو وہیں لے جا رہی ہوں۔ بابا صاحب اُس کے کان
اذان دیں گے۔" وہ بچے کو سینے سے لگائے کسی مقدس امانت کی طرح سنبھالے اندر عمارت
طرف بڑھ گئی۔

"کتنی نیک دل اور نرم خو خاتون ہے امارا بی بی۔ اللہ اُس کا نصیب اچھی کرے۔
ثواب کا کام کر رہا ہے۔ بے سہارا، لاوارث، یتیم اور گمنام بچوں کو پالنے پوسنے اور انہیں تعلیم د
کا واسطے انہوں نے یہ ادارہ بنایا ہے۔ یہ تو نیکی ہے، بہت بڑا نیکی۔" گل خان کے لہجے میں اپنی
بی جی کے لیے بہت احترام اور عقیدت رچی ہوئی تھی۔

"ہاں خان چاچا۔ بی بی جی بڑی ہی نیک ہیں۔ کردار کی بھی سونا ہیں۔ میں نے تو کبھی
کے سر سے دوپٹہ اُترا نہیں دیکھا۔ سفید دو گز کے بڑے سے دوپٹے کو سر پر اور پورے جسم پر ا
طرح لپیٹ کر رکھتی ہیں حالانکہ اتنی بڑی افسرنی ہیں۔ میں اُن کے دفتر گئی تھی ایک دفعہ۔ یہ بڑی
کپڑے تیار کرنے والی فیکٹری ہے اُن کی پنڈی میں۔ وہاں ساری عورتیں کام کرتی ہیں۔ م
بس گنے چنے ہی ہیں۔" خیراں بڑے فخر سے بتا رہی تھی۔

"میری دو بہنوں کو بھی اُنہوں نے اپنی فیکٹری میں ملازمت دلوائی ہے۔ رجی اور رانی
وہ تو یقین ہی نہیں کرتیں کہ بی بی جی فیکٹری کے ساتھ ساتھ بچوں کا ادارہ بھی چلا رہی ہیں۔ ک
ہیں بی بی جی انسان ہیں کہ جن۔"

"چل اب بک بک بند کر اور اندر جا کر اپنا کام کر۔ سنا نہیں، بی بی جی کیا کہہ کر گئی ہیں
رمضو کے جھاڑنے پر خیراں کو یاد آیا تو بگٹٹ اندر دوڑی۔ ٹرے میں دودھ سے بھرا فیڈر، پیالی
تھوڑا سا شہد اور چھوٹے سے کپ میں پانی ڈال کر ساتھ چمچ رکھ کر وہ بابا صاحب کے کمرے
طرف بڑھ گئی تھی۔

بابا صاحب کو اس ادارے میں مرکزی اہمیت حاصل تھی۔ جب نیا نیا ادارہ اطفال کھولا گیا
اسی دوران یہ اللہ لوگ بندہ بی بی جی سے کہیں ٹکرایا تھا۔ بی بی جی اُسے ادارے میں لے آئیں
مقصد یہ تھا کہ جو بچے ہوش سنبھال چکے ہوں اُنہیں قرآن پاک کی تعلیم دی جائے۔

کچھ ہی عرصے میں بابا صاحب ادارے کے لوگوں کے لیے وسیلۂ رحمت بن گئے۔ اُن کی
برکت سے بہت جلد ادارہ مضبوط بنیادوں پر کھڑا ہو گیا۔ اُن کی پرہیزگار، متقی اور عبادت گزار
شخصیت سے متاثر ہو کر اسٹاف نے اُنہیں ایک پیر جیسی حیثیت دے دی تھی۔ باہر سے بھی کئی لوگ
اُن کی شہرت سن کر دعاؤں اور وظیفے کے لیے اُن کے پاس آتے تھے۔ اُن کی گفتگو میں بڑا حلم،
انکساری اور پاکیزگی تھی۔ ایک ایک لفظ دل میں اُترتا محسوس ہوتا۔

جب بی بی جی نے اُنہیں قدر و منزلت کے اعلیٰ ترین مسند پر بٹھا دیا تو باقی اسٹاف نے تو خود
بخود اُن کی طرف مائل ہونا ہی تھا حالانکہ وہ اکثر بی بی جی سے کہتے تھے۔ "بچی! میں خدا کا گناہ گار
بندہ ہوں۔ ایک بے مایہ، بے وقعت سی حقیر ہستی۔ تم نے قدموں کی خاک کو تاج پر موتیوں کی جگہ جا
دیا ہے۔"

"اذان دے دی بابا صاحب۔" خیراں ٹرے اُن کے پاس رکھتے ہوئے اشتیاق آمیز
مؤدب لہجے میں دریافت کرنے لگی۔

"ہاں بچے۔ لاؤ! مجھے تھوڑا سا شہد دو۔" سفید براق شلوار کُرتے میں ملبوس نورانی چہرے پر
گھنے بالوں کی لمبی سی داڑھی سجائے بابا صاحب کی آنکھوں میں اس بچے کے لیے بڑی شفقت
تھی۔ عمر کے اعتبار سے بابا صاحب بہ مشکل پچاس پچپن کے درمیان ہوں گے۔ اب بھی اُن کے
سر اور داڑھی کے کچھ بال سیاہ تھے۔ اُن کی صحت بہت اچھی تھی۔ اس عمر میں بھی وہ بہت فٹ اور
تندرست تھے۔

"بابا صاحب۔" بی بی جی نے آہستگی سے پکارا۔ خیراں کو اُن کے لہجے کی نغمگی اور آواز کا
سریلا پن بہت اچھا لگتا تھا۔

"اس کا نام میں خالد تجویز کیا ہے، کیا خیال ہے آپ کا؟"

"بہت خوب صورت نام ہے۔ اللہ اس کا نصیب اس کے ماں باپ کی سیاہ بختی سے محفوظ
فرمائے اور اسے با مقصد زندگی بسر کرنے کی توفیق دے۔"

"بابا صاحب۔" وہ عجیب کھوئی کھوئی سی لگی تھی خیراں کو۔

"عورت کیا ہے بابا صاحب۔ اُس کی کیا حقیقت ہے۔ کیا فقط یہی۔" اس نے یاسیت سے
گود میں پڑے بچے کی طرف اشارہ کیا۔ "نفس پرست، کمزور دین ایمان والی، سنگ دل اور بے
رحم!"

"نہیں، میری بچی! خدا نے بڑا اعلیٰ مرتبہ عطا کیا ہے عورت کو۔ تم بھی تو عورت کا روپ ہو
مہربان، مقدس اور نیک نفس۔" بابا صاحب کے لہجے کی نرمی پھوار کی طرح سننے والوں کے دل
برستی تھی۔

"میں؟ میں تو خود اپنی جگہ ایک معما ہوں۔ ایک سوالیہ نشان۔ اپنی ذات کی گھاٹیوں م
اترنے کی شائق۔ میری کیا حیثیت و حقیقت ہے بابا صاحب۔" اس کی آواز بھرّانے لگی۔

"یہی عجز و انکسار بلند مرتبے اور بڑی منزلوں تک رسائی بخشتا ہے بیٹی! دو انتہاؤں میں نہ
نہیں کرنا چاہیے۔ انتہائی سوچ، انتہائی دکھ اور ندامت کا سبب بن جاتی ہے۔ کوئی بھی شخص مکمل ط
پر اچھا یا بُرا نہیں ہوتا۔ بدی کرنے والے بھی کبھی نہ کبھی، کہیں نہ کہیں تو اچھائی برتنے کی خواہش پر عم
کرتے ہوں گے اور اسی طرح بہت اچھا انسان بھی ماضی میں نیک و بد کی کشمکش یا کسی خطا کے سرز
ہونے کے بعد شدید احساس جرم کے بعد نیکی کی طرف لوٹ سکتا ہے لہٰذا یہ سوچنا کہ بُرا ابتدا
انتہا تک بُرا ہے اور نیک اول سے آخر تک نیک ہی رہتا ہے، قطعی غیر حقیقی رویہ ہے۔ غلط
تقاضائے بشریت ہے اور غلطی کے بعد توبہ کرنا انسانیت کے درجے پر نئے سرے سے فائز ہو
کے مترادف ہوتا ہے۔"

"بابا صاحب! آپ کی ذات میں اتنا سکون کیسے جمع ہو جاتا ہے۔ جو آپ کی صحبت م
بیٹھتا ہے، اُس کے دل و دماغ پر جمی ساری کائی چھٹ جاتی ہے۔ کیا سحر ہے بابا صاحب، آپ ک
پاس۔" اُس کے لہجے میں پگھلتی عقیدت و تقدس خیراں کو بہت پیاری لگی۔

"اچھائی دیکھنے والی آنکھ اور سننے والے کان میں ہوا کرتی ہے بیٹی! کتنے لوگ اس فضا م
سانس لے رہے ہیں۔ سورج کی روشنی اور ہوا کی تازگی کو اپنے اندر اُتارتے ہیں مگر ہر ایک ک
فطرت، مزاج، سوچ اور شخصیت دوسرے سے مختلف ہے۔ بس یہ تو خدا کی عنایت ہے، وہ جس ک
چاہے ہدایت دے، مرتبہ دے اور جسے چاہے ذلت و خواری کی دلدل میں دھکیل دے۔ سب ا
ذات باری تعالیٰ کی دین ہے۔ میں کیا تھا اور مجھے کیا بنا دیا، میرے مولا نے۔ دنیاوی آسائشو
سے دل پھیر کر آخرت کی طرف دھیان لگا دیا۔ سب اُسی کی ذات کے کرشمے ہیں۔" جب ب
ذکر الٰہی بابا صاحب کے لبوں پر آتا تھا، ان پر رقت طاری ہو جاتی تھی۔

"نماز کا ٹائم ہو گیا ہے۔ میں اپنے آقا و داتا سے ملاقات کر لوں۔ جو دن میں پانچ مرتبہ
اپنے بندوں کو ملاقات کا یہ اعزاز بخشتا ہے۔ فلاح کی طرف بلاتا ہے۔" بابا صاحب نماز کے لیے

کھڑے ہو گئے تو خیراں بھی بی بی جی کے ساتھ باہر نکل آئی۔ بی بی جی تو وضو کر کے نماز کے لیے
مختص کی گئی جگہ پر نماز پڑھنے لگیں اور خیراں چپکے سے رمضو کے پاس کھسک گئی۔ "کس
سوچ میں ڈوبی ہوئی ہے تو؟" رمضو ہاتھ منہ دھو کر سودا سلف لا کر کچن میں رکھ رہا تھا۔ گم صم سی
خیراں کو دیکھ کر پلٹ کر پوچھ بیٹھا۔

"بی بی جی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔"

"اوہو! مجھے یاد ہی نہیں رہا۔ ماسی برکتے نے مجھے پیغام دیا تھا کہ بی بی جی کی کوٹھی میں آنا
وقت نکال کے۔ کچھ سودا سلف لانا ہے۔ اُن کا نوکر بابا بخشو پانچ دن کی چھٹی پر گیا ہوا ہے۔"

"چل فیر اکٹھے ہی چلتے ہیں۔ میں نے وہیں جانا ہے، اُدھر کی صفائی کرنے۔" رمضو احاطے
میں آ کر اپنی سائیکل پر بیٹھنے لگا تو خیراں بھی لپک کر پیچھے بیٹھ گئی۔

خیراں ادارے کے علاوہ بی بی جی کے گھر پر بھی کام کرتی تھی جس کی علیحدہ سے تنخواہ ملتی
تھی۔ کوٹھی ادارہ سے دس پندرہ منٹ کی ڈرائیو پر تھی۔

"کل تنخواہ ملے گی تو میں سینما جاؤں گا۔ مینا کی بڑی زبردست فلم آئی ہے۔ تو چلے گی
میرے ساتھ۔"

"لے میں بھلا تیرے ساتھ کیسے جا سکتی ہوں۔ دماغ خراب ہوا ہے کیا۔" کوٹھی کے آگے
سائیکل روکتے ہوئے رمضو نے شوق بھرے لہجے میں پوچھا تو وہ گھور کر اُسے دیکھنے لگی۔

"کیوں، فلم دیکھنے والوں کا دماغ خراب ہونا ضروری ہوتا ہے کیا۔" رمضو سادگی سے
پوچھنے لگا۔ انداز میں شرارت تھی۔ "اور پھر مینا کی فلمیں تو تجھے بھی پسند ہیں۔"

"اے سن رمضو۔ مجھے اک گل یاد آئی ہے۔" اچانک ہی خیراں رازدارانہ انداز لیے رمضو
کے کان کے قریب بولی۔ "تجھے پتا ہے، میں نے ایک دو دفعہ فلم اسٹار مینا کو بی بی جی کی کوٹھی پر دیکھا
ہے۔"

"چل بکواس نہ کر۔ گھاس چر گئی ہے تو بھلا بی بی جی کا فلمی لوگوں سے کیا واسطہ۔" رمضو نے
اُس کی اطلاع پر چنداں کان نہیں دھرے۔

"مجھے کیا جرورت ہے جوٹھ (جھوٹ) بولنے کی۔" خیراں بگڑنے لگی۔

"تیرا تو بات بات پر میٹر گھوم جاتا ہے۔" رمضو منانے والے انداز میں کہنے لگا۔ "چل چھوڑ
ان باتوں کو۔ یہ بتا چلے گی میرے ساتھ۔"

"بے بے ہڈی پسلی ایک کردے گی۔" اس نے صاف جواب دے دیا۔

"او ماسی برکتے سے میں خود بات کر لیتا ہوں۔" خیراں کی ماں بی بی جی کی کوٹھی کی مست
ملازمہ تھی۔

"تو نے نشہ تو نہیں کیا ہوا؟" خیراں نے ناک چڑھا کر اسے دیکھا۔ "وہ تیرے دونو
دے گی اور میری بھی چٹنی بنادے گی۔"

"او پاغلے۔ میں اُس سے تیری بات کروں گا۔" وہ جذبوں بھری نظروں سے اسے د
لگا۔

"میری کیا گل کرے گا۔ دماغ پھر گیا ہے کیا۔" خیراں نے ٹیڑھی نظر سے گھورا۔

"چل جا' جان چھڈ۔ ایویں تیرے ساتھ مغز کھپاتا رہتا ہوں۔ نہیں تو نا سہی۔" رمض
سارا موڈ چوپٹ ہو گیا۔ وہ جھلا کر کوٹھی کے کھلے گیٹ سے اپنی سائیکل اندر لے گیا۔

"میری بات سن رمضو۔" خیراں اُس کے پیچھے پیچھے چلتی ہوئی کسی گہری سوچ میں تھی جس کا
آواز میں بھی اتر آیا تھا۔

"اب کیا قیامت آ گئی۔" وہ جھلایا۔

"یہ جو ہماری بی بی جی ہیں نا۔ کتنی کھوب صورت ہیں۔" وہ کھوئی کھوئی سی بولی۔

"ہاں تو فیر۔" رمضو اُس کے چُپ ہو جانے پر برسنے والے انداز میں بولا۔

"فیر یہ کہ اُن کی آنکھوں کا رنگ بالکل فلم اسٹار مینا کی طرح کا ہے اور بال بھی اُسی جیسے
موٹے موٹے کالے ریشمی اور لمبے۔ دونوں کو ایک جگہ کھڑا کیا جائے تو ایک دوسرے کی بہ
لگتیں۔ سچی سے۔"

"تیرے دماغ میں تو بھس بھرا ہے۔ جو تھوڑی بہت جگہ بچ رہی تھی اس میں فضول اور ا
سیدھی سوچیں جمع ہو گئی ہیں۔ چل اندر' اپنی بے بے سے کہہ' چوکیدار سے چیزوں کی پرچی
دے۔ میں بازار سے لے آتا ہوں اور تو بھی صفائی ستھرائی شروع کر دے۔ اتنا کام پڑا ہے
تجھے انکھیلیاں سوجھ رہی ہیں۔"

☆☆☆

رات پڑنے کو تھی۔ دو کمروں کے اس بوسیدہ گھر کے صحن میں ملگجے پیلے بلب سے مدقوق
روشنی جا گی تھی۔ یوں بھی غریبوں کے گھر کے اندھیرے بجلی کے قمقموں سے کہاں دور ہو پا

صحن کے ساتھ ہی چھوٹا سا باورچی خانہ تھا' جہاں دو چار پیتل اور سلور اسٹیل کے برتن پڑے
ے۔ تین چھوٹے سے ڈبے تھے۔ ایک میں نمک' دوسرے میں مرچ اور تیسرے میں
لدی۔ چولہے کے پاس ڈالڈا گھی کا ایک چھوٹا ڈبا بھی پڑا تھا مگر تقریباً خالی تھا۔ آٹے کا بدرنگ سا
ے کا کنستر خالی پڑا تھا۔ سالن کی سیاہ پتیلی بھی بالکل صاف پڑی تھی۔

"ابا' کھانا بنانے کو کچھ بھی نہیں ہے۔ نہ آٹا' نہ تیل' اور نہ کوئی دال۔" تیرہ چودہ برس کی کمزور
امت اور زرد ویران سے چہرے والی لڑکی اپنی پیوند لگی اُڑے رنگ کی نیلی سی اوڑھنی اوڑھے
تی کانپتی باپ کے پاس آ کر ڈرتے ڈرتے انداز میں مخاطب ہوئی تھی۔

"تو میں کیا کروں۔ جا اپنی ماں سے دُکھڑا رو۔ وہی ذمے دار ہے ان حالات کی۔ پوچھ اس
ے' کیوں میرا کہا نہیں مانتی یہ کمینی عورت۔" چیچک زدہ چہرے اور گٹھے ہوئے بدن والا ادھیڑ عمر
دکھاٹ پر لیٹے لیٹے دہاڑا تھا۔

لڑکی بُری طرح بدک کر پیچھے ہٹی تھی۔

"پوچھ اُس سے۔ کیوں نہیں جاتی دھندے پر۔" وہ چرس بھرے سگریٹ کا سوٹا لگاتے
ئے بے حسی سے بولا۔

"لعنت بھیجتی ہوں میں اس "دھندے" پر۔" اسی لمحے وہ عورت چار سالہ بچہ کندھے سے
ئے صحن میں آ کر دہاڑی تھی۔

"تو پھر رکھ بھوکا اپنے پانچ بچوں کو۔" مرد اپنے کیڑا لگے دانت کریدنے لگا۔

"خدا کا خوف کرو کچھ۔ یہ تمہارا بھی خون ہیں۔ تمہاری اولاد ہیں۔"

"خدا معلوم ان میں سے کتنے میرے ہیں اور......"

"بکواس بند کر کمینے آدمی۔" عورت طیش میں آ کر دہاڑی تھی۔

"میرے آگے بولتی ہے حرام زادی۔" مرد نے عورت کی چٹیا پکڑ کر کھینچی اور کس کر دو
پٹر لگا دیے۔ ایسے کرارے تھپڑ کھا کر عورت خود بخود ٹھنڈی پڑ گئی اور ہائے ہائے کرتے ہوئے
مین پر بیٹھ گئی۔

"پھینک آئی ہوں اُسے جو تیرا نہیں تھا۔ میں کہتی ہوں کرم داد کچھ خدا کا خوف کر لے۔
یوں میرے اور اپنے لیے جہنم کی آگ کا سودا کر رہا ہے۔ تجھے رب کا واسطہ ہے۔"

"اری جہنم کی آگ سے بعد کو ڈر لیں گے' پہلے پیٹ کی آگ کا تو کچھ خیال کر لیں
جا میری شہزادی۔ اپنا لال جوڑا پہن لے' نہا دھو کے تیار ہو جا۔ بابو عبدالحی آتا ہی ہوگا۔ بڑا ما
اُس کے پاس۔ ایک بار اُس کو خوش کر دے تو وارے نیارے ہو جائیں گے اپن کے۔ ج
میری رانی۔" کرم داد پینترا بدل کر بیوی کے پاس آ کر اُسے چمکارنے لگا۔

"مجھ سے نہیں ہوتا اب یہ کام۔ تو خود کیوں نہیں کماتا۔ ہٹا کٹا مگر نہیں' تجھے تو م
نشے سے غرض ہے۔ تجھے چرس کی سگریٹ اور ٹھرا ملتا رہے تو تو خوش ہے۔ کوئی پروا نہیں کہ
کی بھی ہزار ضرورتیں ہیں۔ انہیں رہنے کے لیے پکی چھت' اچھا کھانا اور تعلیم چاہیے۔ جو
نشے میں اُڑا دیتے ہو۔" عورت دُکھے دل سے اپنے مرد کو احساس دلا رہی تھی۔

"او زرینہ' چل چھوڑ بھی اب پُرانے قصے۔ میں تیرے سے اوکھا نہیں بولنا چاہ
اب۔"

"نہیں ہوتی اب یہ "مزدوری" مجھ سے۔" زرینہ نے بھی صاف جواب دے دیا۔

"اماں اماں' مجھے بھوک لگی ہے۔" چار سالہ بچہ ماں کے کندھوں سے لٹک کر بسور

"اے شادو' کھانا نہیں پکا ابھی تک؟" دس سالہ پپو گلی میں گلی ڈنڈا کھیل کر تھک گ
نے گھر کی راہ لی تھی اور اب بڑی بدتمیزی سے اُس لڑکی سے مخاطب تھا۔

"لے اب بتا۔ کہاں سے کھلائے گی اپنے بچوں کو۔ اُٹھ جا سیدھی طرح سے۔"
نے فاتحانہ نظروں سے زرینہ کی طرف دیکھا۔

چپ چاپ ایک طرف بت بنی کھڑی شادو کا دل چاہا' اس منظر سے کہیں د
جائے۔ دور بہت دور۔

یہاں بچپن سے یہی کھیل دیکھنے میں آیا تھا۔ رنگ برنگے ہٹے کٹے مردوں کو کرم دا
بلا لیتا اور زرینہ خوب سا ہار سنگار کر کے اُن کی میزبانی کرتی۔ ناز نخرے اُٹھاتی۔ پانچ بچوا
ہونے کے باوجود زرینہ کا بدن اسی طرح شاداب اور بھرپور تھا۔ کچھ رنگ روپ بھی قد
دے رکھا تھا۔ سو سدا کا نکما' نکھٹو اور خود غرض کرم داد بیوی کی جوانی کو خوب خوب کیش کرد
وہ اُن مردوں میں سے تھا جن کے لیے عزت' شرافت' غیرت اور ضمیر جیسی باتیں مکمل طو
ہوتی ہیں۔ اُسے غرض تھی تو صرف اپنے حقے پانی اور پیٹ سے۔ ٹھاٹ سے بیوی کی "کم

شادی کے شروع شروع میں زرینہ نے بہت مزاحمت کی تھی۔ اُسے عزت و عصمت اور
حیا کا احساس دلایا تھا مگر جواب میں چار چوٹ کی مار' طلاق کی دھمکی اور اپنے میکے کی غربت
اُس کے حوصلوں کے علم گرا دیے تھے۔ سو وہ ضمیر کی آواز اَن سنی کر کے شوہر کے بتائے ہوئے
ے پر چل پڑی پھر بچے ہوئے تو اُن کی ضرورتوں کے لیے یہ دھندا مجبوری بنتا چلا گیا۔

شادو کو اپنے گھر کے ماحول سے' اپنے باپ اور ماں سے سخت نفرت تھی۔ وہ بہت حساس بچی
۔ اب اچھی خاصی سمجھدار ہو گئی تھی۔ گھر میں جو کھچڑی پکتی تھی' وہ اُس سے بے خبر نہیں رہتی تھی
اپ کے خوف سے زبان و کان سے اندھی گونگی بنی چپ چاپ کام میں لگی رہتی تھی۔ ورنہ دل
ت چاہتا تھا کہ باپ کو جھنجوڑ کر بولے۔

"بند کرو ابا' یہ کھیل۔ آج کمائی کے لیے بیوی کی عزت بیچی ہے۔ کل کو وہ بڑھی ہو گئی تو
واستہ کیا بیٹی کو دوکان پر بٹھاؤ گے؟" مگر وہ بے بس اور مجبور تھی۔

ادھر گھر میں کچھ اور ہی نقشہ بنتا جا رہا تھا۔ "تو نہیں مانے گی؟"

زرینہ کی مسلسل نہ نہ نے کرم داد کا پارہ چڑھا دیا۔ وہ مارنے کی نیت سے آگے بڑھا تو
نہ نے بھی جواب میں پرے ہو کر کپڑے دھونے والا ڈنڈا اُٹھا لیا۔

"بس بہت ہو گئی۔ نہیں جاؤں گی میں تیرے یار کے پاس۔" زرینہ کے تیور جارحانہ تھے۔

"میں تو تیری ہڈی پسلی ایک کر دوں گا۔ سمجھا کیا ہے تو نے۔" کرم داد دانت پیس کر اُس کی
بڑھا اور موقع پا کر اس کی چوٹی پکڑ لی۔

"چھوڑ دے مجھے۔" بلآخر ناکام ہو کر زرینہ نے ڈنڈا کرم داد کے ہاتھ پر دے مارا۔ وہ
ر پیچھے ہٹا اور پھر خونی تیوروں سمیت دوبارہ حملے کے لیے پر تولنے لگا۔

بچے ماں باپ کی آنکھوں میں خون اُترا دیکھ کر سہم کر رونے لگے تھے۔ ایک ہنگامہ سا بپا ہو
ا۔ چار سالہ گڈو ڈر کر درمیان میں آیا تو کرم داد نے بے دردی سے اُسے جھٹکا دے کر پرے
یا۔

"ابا کیا کرتے ہو؟" دس سالہ پپو چھوٹے بھائی کو اُٹھانے کے لیے آگے بڑھا تو کرم داد
نے بھی دو چار ہاتھ جڑ دیے۔ وہ تیورا کر بچے سمیت دوسری طرف پلٹ گیا۔

"کیا کرتے ہو ظالم۔" زرینہ تڑپ کر اُٹھی تھی۔

"میں آج تجھے بھی نہیں چھوڑوں گا اور تیرے بچوں کو بھی قتل کر ڈالوں گا۔" کرم داد پر گویا

خون سوار ہو گیا تھا۔

ایک کونے میں کھڑی ہوئی تھر تھر کانپتی شادو یہ سب کچھ دیکھ کر بے اوسان ہوئی جا رہی
معاً کرم داد کی نظر اُس پر پڑی۔ زرینہ کو تکلیف دے کر "سیدھے" راستے پر لانے
وہ بے دریغ بچوں کو پیٹ رہا تھا تاکہ ممتا سے ہار کر وہ اُس کی بات مان جائے۔

"تو کیا کر رہی ہے مرن جوگیے۔ تماشا دیکھ رہی ہے کیا ہے؟" اسی لمحے کرم داد
برساتی آنکھوں سے کف اُڑاتا ہوا ڈرپوک اور کمزور دل کی مالک شادو کی طرف بڑھا۔
خوف، وحشت اور بے کلی کا وہ کون سا احساس تھا جس نے حد درجہ بزدل اور دبو سی شادو کے
بجلی سی بھر دی۔

اُسے لگا اگر وہ یہاں سے نہ کھسکی تو آج کے بعد زندہ نہ بچے گی۔

جان بچانے کے جبلی تقاضے نے اُسے سرپٹ بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ وہ گھر کے
دروازے سے باہر نکلی اور بگٹٹ بھاگ پڑی۔ بھاگتی چلی گئی۔ پیچھے پلٹ کر نہیں دیکھا۔

کرم داد نے یہی خیال کیا تھا کہ وہ ڈر کر باہر کے دروازے کے آس پاس چھپ گئی
ہو گی اس لیے پیچھے جانے کی زحمت نہیں کی اور نئے سرے سے زرینہ سے محاذ آرائی میں
ہو گیا۔

وہ سڑک پر بھاگتے ہوئے جانے کتنا راستہ طے کر گئی تھی۔ ٹریفک اتنی زیادہ نہیں تھی۔
گاڑیاں آجا رہی تھیں۔

پندرہ بیس منٹ تک وہ بغیر رُکے بھاگتی رہی پھر اُس کی سانسیں پھولنے لگیں۔ حل
کانٹے اُگنے لگے۔ قدم بے جان ہونے لگے۔ اس سے پہلے کی حواس سنبھالتی، اچانک
کے کنارے پر پارک کی ہوئی گاڑی کے بونٹ سے ٹکرا کر اوندھی ہو گئی۔

"کون ہو تم اور اس طرح کیوں بھاگ رہی تھیں؟" سفید ایف ایکس سے ایک نوجوا
برآمد ہوئی تھی اور اب تشویش سے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھے پوچھ رہی تھی۔

"وہ...... میں...... بی بی جی......" اُس کے حواس بکھرنے لگے۔ "اللہ کے واسطے
لیں بی بی جی۔ وہ میرا ابا میری جان لے لے گا۔" وہ خوف کی کہر میں لپٹی اچانک اس لڑکی
چمٹ گئی۔ اُس کی خوف زدہ نظریں مسلسل اپنے پیچھے راستے پر لگی ہوئی تھیں۔

"تمہارا ابا تمہیں کیوں مارے گا؟" لڑکی کا لہجہ تحیر سے ڈول گیا۔

"بی بی جی۔ مجھے یہاں سے لے چلیں۔ تھوڑی دور جا کر بھلے سے اُتار دیجئے گا۔ قسم سے ابا
بوٹی بوٹی کر دے گا۔ وہ سب کو مار ڈالے گا۔ اماں کو بھی، کاکو، گڈو اور پپو کو بھی اور نگینہ کو بھی۔"

لڑکی اس کی مبہم اور وحشت بھری باتوں سے اُلجھن میں پڑ گئی تھی۔ تاہم اُسے تسلی سے گاڑی
ھا کر گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ ایک کولڈ اسٹاپ پر رُک کر ٹھنڈی پیپسی اسے پلائی۔

اس کے کچھ اوسان درست ہوئے تو لڑکی نے اُسے کھل کر ساری بات بتانے کو کہا۔ وہ
وں سے لرزتے ڈرے ڈرے بھیگے بھیگے لہجے میں سب کچھ بتاتی چلی گئی۔

"میں گھر واپس نہیں جاؤں گی بی بی جی۔ وہاں رہی تو کسی دن خوف اور گھٹن کا شکار ہو کر مر
گی یا میرے ابا اماں مجھے مار ڈالیں گے۔ مجھے اس گھر کی دیواروں سے وحشت ہوتی ہے۔
جی، میرا دم گھٹتا ہے وہاں۔ بی بی جی آپ مجھے کسی ایسی جگہ چھوڑ دیں جہاں وہ لڑکیاں رہتی ہیں
کا کوئی نہیں ہوتا۔"

لڑکی شادو کی کم سنی کی باتوں پر مسکرا رہی تھی۔

"اس کے بارے میں بعد میں سوچیں گے۔ فی الحال تم میرے ساتھ میرے گھر چلو۔ فکر
کرو۔ میں تمہیں تمہارے گھر نہیں لے جاؤں گی۔ یوں بھی مجھے تمہارا ایڈریس نہیں معلوم اور
خود تم بھی مکمل پتا نہیں جانتی ہو گی۔ میرا خیال ہے، تم پہلی دفعہ گھر سے باہر نکلی ہو۔" لڑکی کی
یں بڑی پہنچی ہوئی تھیں۔

"جی بس گھر سے اگلی گلی میں پرائمری اسکول میں پڑھنے کے لیے جاتی ہوں۔" وہ سادگی
بولی۔

"پرائمری پاس ہو۔" لڑکی نے دلچسپی سے پوچھا۔

"نہیں جی۔ چوتھی جماعت کا امتحان دینے کے بعد ابا نے اسکول نے اُٹھوالیا تھا کہ ہم سے
بوں اور یونیفارم کا خرچہ نہیں اُٹھایا جاتا۔"

"خیر کوئی بات نہیں۔ میں تمہیں پانچویں میں داخل کرا دوں گی۔"

"آ...... آپ......" شادو نے حیرت اور بے یقینی سے پلکیں جھپکائیں۔

"ہاں میں۔ تم میرے ساتھ رہو گی نا؟" وہ نرمی سے مسکرائی۔

"خیر پہلے میں تمہیں اپنا تعارف کرا دیتی ہوں۔ میرا نام مشعل ہے۔ میں کپڑوں کی
ائننگ کی تیاری کے کاموں میں ماہر ہوں۔ میری اپنی ایک فیکٹری ہے جہاں خواتین ڈریسز

تیاری کرتی ہیں۔ کپڑے کی پرنٹنگ' پینٹنگ' کشیدہ کاری' اور سلائی وغیرہ ان سب مرا
گزرنے کے بعد تیار مال مارکیٹ میں سپلائی کیا جاتا ہے اور اس سلسلے میں ہماری فیکٹری کو
ملکی کنٹریکٹ بھی ملے ہیں۔ خیر تمہیں ان باریکیوں میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ مختصر یہ کہ
بچوں کے لیے ایک ادارہ بھی کھولا ہوا ہے جہاں بہت اچھے اچھے لوگ کام کرتے ہیں۔ تم
جایا کرنا اور واپس آ کر ادارے میں بچوں کی دیکھ بھال کرنا۔ ٹھیک۔"

"مگر بی بی جی۔"

"یہ بی بی جی کیا ہوتا ہے؟ کہنا ضروری ہے تو مشعل باجی کہہ لیا کرو۔" اس کے
مرعوب زاویے شادو کے حواس اُڑائے دے رہے تھے۔

"تم نے اپنا نام تو بتایا نہیں۔" معاً مشعل چونکی۔

"دلشاد ہے باجی۔ ویسے سب شادو شادو کہتے ہیں۔"

"بھئی' میں تو دلشاد ہی کہوں گی۔ اتنے خوب صورت نام کا ستیاناس کیوں کیا جا
اب اُترو۔ میرا گھر آ گیا ہے۔" ایک پُرشکوہ سی سفید کوٹھی کے آگے گاڑی روک کر مشعل ا
مخاطب ہوئی۔

دلشاد جھجکتے ہوئے نیچے اُتر آئی اور گھبرائے ہوئے انداز میں اس کے پیچھے چلنے لگی۔

"ماسی' جلدی سے کھانا لگاؤ اور ہاں' آپا اماں کہاں ہیں۔ اُنہیں بلالو۔ مجھے خبر ہے'
میرے انتظار میں بھوکی بیٹھی ہوں گی۔ کتنی بار کہا ہے کہ مجھے محبت کی ان کڑی زنجیروں
باندھا کریں۔" مشعل تھکے تھکے انداز میں صوفے پر گر گئی۔

"ارے تم کھڑی کیوں ہو۔ بیٹھو ناں دلشاد۔" اچانک ہی اُس کی نظر آنکھیں پھاڑ
دلشاد پر پڑی تھی۔

"ماسی' میری وارڈروب سے کوئی سوٹ نکال دو' اس بچی کے لیے اور ہاں' اس کے لیے
ساتھ والا کمرا سیٹ کر دو۔ جاؤ دلشاد ماسی کے ساتھ۔ نہا کر کپڑے بدل لو پھر ہم مل کر کھانا کھا
اتنے میں لیا اماں کو تمہارے بارے میں بتا دوں۔" وہ صوفے سے اُٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

☆☆☆

خود پھول کی طرح مجھے کھلنے کا شوق تھا
اب تیز ہے ہوا تو ہوا کا قصور کیا

انتہائی عالی شان اور پُرتعیش محل نما اس کوٹھی میں کون سی جدید ترین سہولت نہ تھی۔ سب کچھ
ی مٹھی میں تھا' اُس کی دسترس میں تھا۔

دولت۔

شہرت۔

حسن۔

پروانہ وار فدا ہونے والے پرستار۔

ہر من پسند شے کا حصول اس کے لیے ہر لحاظ سے ممکن تھا مگر اس کے باوجود کوئی کمی تھی جو کچھ
ے سے بہت زیادہ محسوس ہونے لگی تھی۔

ہواؤں پر حکومت کرنے والی بے تاج ملکہ تھی۔ "جو چاہا" وہ پا لیا تو پھر یہ بے کلی سی کیا
"

شب کی پچھلے پہر کی گھڑیوں میں جب نفس سو جاتا اور ضمیر کی آواز صاف سنائی دینے لگتی تو
ثر خود سے پوچھا کرتی تھی۔

"یہ اضطراب' یہ بے سکونی' یہ تشنگی کیوں ہے؟" تنہائیوں میں یہ کون ہے جو میرے اندر کی
ہوئی ہینا گل کو جھنجوڑ کر جگانے کی سعی کرتا ہے؟

میں تو وہ ہوں کہ بڑے بڑے رؤسا اُمرا کے دل جس کے قدموں میں پڑے رہتے ہیں۔
ے بڑے حاکموں اور تاجروں کو مٹھی میں لے کر خوب خراج وصولا۔ چٹان کا دل رکھنے والوں کو
ہی جلوے میں ریزہ ریزہ کر ڈالا اور میڈم بانو کی سونپی ہوئی "ڈیوٹی" کو بہ احسن طریقے سے
ام دیا۔

کون ہے جو آج تک میرے حسن بلاخیز کی تجلیوں کے آگے ٹھہر سکا ہے۔ سب کو ایک ہی
ے بھسم کر دیتی ہوں۔

جس کی طرف میڈم بانو اشارہ کر دیں' اسے کاٹھ کا اُلو بنا کر میڈم کی دلچسپی کے راز اُگلوا لیتی
۔ میں ہر فن مولا ہوں مگر پھر بھی کوئی کمی تو ہے۔ ایک خلش تو ہے۔

دو ننھے منے ہاتھ رات کی تاریکی میں بھی مجھے اپنے گریبان کی طرف بڑھتے دکھائی دیتے
۔ وہ معصوم سی چیخ آج بھی سماعتوں میں سیسہ پگھلانے لگتی ہے۔
بھی مچی سی آنکھیں۔

بسورتا نرم گلابی چہرہ۔
پیاز کے چھلکے کی رنگت والا متناسب گل گوتھنا جسم۔
جو دونوں پاؤں کی ایڑیاں ایک دوسرے سے رگڑتا' بے ساختہ اور فطری انداز میں
تھا۔

''اوہ خدایا۔ مجھے لگتا ہے' میں پاگل ہو جاؤں گی۔'' مینا نے اچانک راکنگ چیئر چھوڑ
اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''عذرا......عذرا......'' اس نے اپنی خاص ملازمہ کو تیز آواز میں بلایا۔

''جی میڈم۔'' عذرا جیسے اُڑتی ہوئی اندر آئی تھی۔

''سیکریٹری کو بلاؤ اور وہاں کوئی ملاقاتی تو نہیں آیا تھا۔''

''میڈم' ایک صاحب آئے تھے۔ اپنا کارڈ دے گئے ہیں۔ کہہ رہے تھے کل دوبار
گا۔'' عذرا نے ادب سے کارڈ اُس کو پکڑا دیا۔

''اوہ خدایا۔ یہ شخص میرے پیچھے کیوں پڑ گیا ہے۔ مجھے لگا ہے' اس کا تند و تیز او
انداز گفتگو مجھے ٹینس کرتا ہے۔ تین ماہ سے کسی سائے کی طرح پیچھے لگا ہوا ہے۔ جب بھی
اعصاب پر نوبت بجا دیتا ہے۔'' مینا نے پریشان کن انداز میں کارڈ دوبارہ سائیڈ ٹیبل پر ڈا

''تم واش روم میں جا کر چیزیں سیٹ کرو۔ میں باتھ لوں گی۔'' اُس نے عذرا کو مخاطب کیا۔

''جی میڈم' آپ نے بلایا تھا۔'' عذرا کے جاتے ہی اُس کا سیکرٹری حیات خواجہ دروا
دستک دے کر اجازت ملنے پر اندر آ گیا۔ وہ اُدھیڑ عمر کا بجھی بجھی رنگت والا شخص تھا
سر درمیان سے گنجا تھا۔ بس سائیڈوں پر بالوں کی جھالریں سی لٹک رہی تھیں۔ اُس کا چہرہ
کہ وہ ایک منجھا ہوا' ہوشیار اور کاروباری آدمی ہے۔

''کیا رپورٹ ہے آج کی؟'' مینا نے بے تاثر نظروں سے اُسے دیکھا۔

''میڈم' آج تین پروڈیوسرز آئے تھے۔ دو کی فلموں میں آپ کو سائن کر لیا ہے۔ تیس
میں نے جواب دے دیا ہے۔ وہ ایڈوانس دینے میں ٹال مٹول کر رہا تھا۔ دوسرا ابھی فلم انڈسٹری
نیا وارد ہوا ہے۔ اُس نے ابھی تک دو فلمیں بنائی ہیں اور دونوں ہی فلاپ ہوئی ہیں۔ ڈسٹر
بھی اُس کے ساتھ بزنس کرنے میں دلچسپی نہیں لے رہے اس لیے میں نے اُسے ٹال دیا۔''

''اچھا کیا۔'' مینا کو اپنے سیکریٹری پر اعتماد تھا' اسی پر سب کچھ چھوڑا ہوا تھا۔ وہ پچھ

سال سے اُس کے ساتھ تھا۔ میڈم بانو نے ہی اُسے اپوائنٹ کیا تھا۔ بقول ان کے چھانٹی کا بندہ
ہے اور حیات خواجہ نے اپنی معاملہ فہمی اور ذہانت سے یہ ثابت بھی کر دیا تھا۔

''شیخ صاحب ملے تھے آج اسٹوڈیو میں۔'' مینا اب اپنے سیاہ بالوں کے بل کھولتے ہوئے
سرسری سے انداز میں حیات خواجہ سے مخاطب ہوئی۔ ''اپنی فلم میں کیریکٹر رول کے لیے آفر کی ہے'
کیا خیال ہے تمہارا؟''

''شیخ صاحب بڑے منجھے ہوئے ڈائریکٹر ہیں لیکن آپ پہلے رول کی نوعیت پوچھ لیجئے گا۔
ابھی سے اگر ڈائریکٹ کیریکٹر رول کرنا شروع ہو گئیں تو آپ پر بڑھاپے کی چھاپ لگ جائے گی'
جب کہ آپ تو ابھی اگلے چار سالوں تک ہیروئن کے رول میں آ سکتی ہیں۔''

''میڈم بانو کی طرف سے تو کوئی میسج نہیں آیا؟'' بالوں میں برش کرتے ہوئے وہ مڑی۔

''نہیں۔ ویسے مجھے دو تین دن پہلے کسی فنکشن میں ملی تھیں۔ کہہ رہی تھیں' جلد ہی آپ کے
لیے ''بلاوا'' بھیجیں گی۔ کسی مضبوط پارٹی سے بات چل رہی ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ سودا طے ہو گیا تو میں نئی کوٹھی اور نئے ماڈل کی کار کی ڈیمانڈ کروں گی۔ چھ ماہ
ہو گئے ہیں' اس بنگلے میں رہتے ہوئے۔ اب بوریت فیل کرنے لگی ہوں۔ کوئی چینج ہونا چاہیے۔''
چھ ماہ قبل اُس کے پرستار وڈیرے حق نواز نے یہ کوٹھی خرید کر دی تھی۔ گھر اور گاڑیوں سے اُس کا جی
بہت جلدی بھر جاتا تھا۔ ایک ہی چیز کو وہ مسلسل برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

حیات خواجہ اجازت لے کر باہر نکل گیا۔

باتھ روم کی طرف جانے کے لیے مڑتے ہوئے اُس نے دوبارہ وہ کارڈ اُٹھا لیا۔

''ہارون احمد۔'' اس نے بے خیالی میں بلند آواز میں نام پڑھا۔ وہ کسی نیوز ایجنسی کا نمائندہ
تھا۔

مینا کی صحافیوں سے جان جاتی تھی۔ خصوصاً ''تیز و طرار'' اور طرح طرح سے ہر بات کی جڑ
معلوم کرنے والے صحافیوں سے وہ بہت بدکتی تھی۔

''کون ہے' یہ شخص اور کیوں میرے پیچھے پڑ گیا ہے۔'' وہ اُس سے کچھ کچھ خائف ہونے

لگی تھی۔ حیرت تو اُسے یہ تھی کہ وہ اُس سے متاثر بھی نہیں تھا۔ جھوٹے منہ سے بھی کبھی تعریف
نہیں کی تھی۔ ایک کے بعد دوسری نظر ڈالنے کا مجاز نہیں ہوتا تھا۔ بس چبھتے ہوئے بظاہر عام۔
سادہ سے جملوں کی کاٹ سے اُسے بوکھلا دیتا تھا۔

''کل پھر آئے گا؟'' وہ سچ مچ خوف زدہ سی ہوگئی تھی۔

❤❤❤

دلشاد کے لیے یہ سفید کوٹھی حیرت کدہ بنی ہوئی تھی۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ایک ایک چیز کو
تی رہتی تھی۔ ذہن استعجاب کے سمندر سے نکل کے ہی نہ دیتا تھا۔ آیا اماں اور گھر میں ماسی
یتے کے سوا اُسے کوئی مستقبل مکین نظر نہیں آیا تھا۔ ماسی کی دو لڑکیوں کی شادی ہو چکی تھی۔ صرف
اں ساتھ رہتی تھی۔ وہ بھی صبح کی گئی شام کو ادارۂ اطفال سے واپس لوٹتی تھی۔ خود مشعل کا بیشتر
ت گھر سے باہر گزرتا تھا۔ اتنا بڑا گھر بھائیں بھائیں کرتا تھا۔

ادارہ۔

فیکٹری۔

اور گھر۔

تینوں چیزوں کو وہ تن تنہا لڑکی سنبھال رہی تھی۔

''آیا اماں، کیا بی بی جی کے آگے پیچھے کوئی نہیں ہے؟''

ایک دن یونہی حیرت سے اُلجھتے ہوئے دلشاد نے آیا اماں سے پوچھ ڈالا۔

آیا اماں کے بوڑھے جھریوں زدہ چہرے پر شکستگی کی کائی جمنے لگی۔ ''یہی سمجھ لو بیٹی۔'' وہ
ڑی سانس بھر کر تسبیح کی طرف متوجہ ہوگئیں۔ ''میں اُس کی ماں نہیں ہوں مگر ماں بن کے پالا ہے
ے۔ وہ بھی جان چھڑکتی ہے مجھ پر۔ میرے بغیر تو نوالہ نہیں توڑتی۔'' آیا اماں کے چہرے پر
بت کی آبشار بہنے لگی۔

دلشاد کو آیا اماں بہت اچھی لگی تھیں۔ محبت کرنے والی۔ خیال رکھنے والی اور کشادہ دل۔

''کیا آپ کے ماں باپ وفات پا چکے ہیں؟'' ڈرتے ڈرتے ہمت کر کے ایک دن اس
شعل سے براہِ راست پوچھ لیا۔

مشعل کو جیسے کسی نے اُلٹی چھری سے ذبح کر ڈالا۔ وہ ایک جھٹکے سے اُس کی طرف مڑی

تھی۔ اُس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر دلشاد جھرجھری لے کر رہ گئی۔ زردی مائل اُجلی
رنگت تانبے کی طرح تپنے لگی تھی۔ آنکھیں لہو ٹپکانے کو تھیں۔ تنفس بُری طرح اُلجھ گیا تھا
ایک دم بھنچ گئی تھیں۔

دلشاد کے اوسان خطا ہونے لگے۔ وہ ویسے بھی مشعل کی پر تمکنت اور مرعوب کن شخص
بُری طرح خائف رہتی تھی۔ مشعل کے ہزار اپنائیت بھرے انداز کے باوجود وہ اس سے بے
نہ ہو پائی تھی۔

''میں معافی چاہتی ہوں' بی بی جی۔'' وہ تھرتھراتی آواز میں بہ مشکل تمام تھوک نگل کر بو

''ہوں۔'' مشعل کے تنے ہوئے اعصاب رفتہ رفتہ ڈھیلے پڑنے لگے۔ شاید اسے خو
اپنے تیوروں کی جنون خیزی کا ادراک ہو گیا تھا۔

''معاف کرنا بی بی۔ میں...... دراصل......'' تھکے تھکے انداز میں پیشانی کو دباتے ہو
یکلخت ایزی چیئر پر دراز ہو گئی۔ اس کا لہجہ بے ربط اور کھویا کھویا سا تھا۔ اس نے جملہ ادھورا چ
تھا مگر اس بات کا اسے خود بھی شاید اندازہ نہیں ہوا کہ کبھی کبھی زندگی میں ایسے لمحے آتے ہیں
انسان وقت کی گھڑیوں سے کٹ سا جاتا ہے۔

''اسکول میں تمہارا دل لگ گیا ہے؟'' معاً وہ سابقہ جذباتی کیفیت کے حصار سے ن
بڑے نارمل انداز میں سر اُٹھا کر اس سے دریافت کرنے لگی۔ اس نے اتنی تیزی سے خود پر ق
تھا کہ دلشاد متحیر رہ گئی تھی۔

''کتنی پُر اسرار اور عجب سی عورت ہیں بی بی جی۔'' وہ دل میں سوچے بغیر نہ رہ سکی تھی۔

''جی بی بی جی۔''

''یہ بی بی جی کیا ہوتا ہے۔ باجی کہا کرو۔'' وہ ہلکا سا مسکرائی۔ وہی مبہم اور مضط
مسکراہٹ۔ سنہری آنکھوں کی جھلملاہٹوں میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔

''میرا خیال ہے' ان کی آنکھوں کا سکوت ہی اُن کی نرم و سادہ شخصیت کو پراسراریت کا
دیتا ہے۔'' دلشاد کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔

''اور وہ تمہیں بچوں کا ادارہ کیسا لگا؟'' وہ گردن کے پٹھوں کو اپنی نفیس لانبی اجلی ا
سے دباتی ہوئی ہموار انداز میں پوچھ رہی تھی۔

''بہت اچھا۔'' دلشاد بچوں کی سی بے ساختگی سے بولی۔ ''باجی' کیا یہاں صرف انہی

ا جاتا ہے جن کا کوئی والی وارث نہیں ہوتا یا جن کو کوڑے کی طرح گھر کی چار دیواری سے باہر
ینک دیا جاتا ہے۔'' معاً دلشاد کچھ سوچ کر مشعل کی شکل دیکھنے لگی۔

''ہاں۔ باقی بچوں کو رکھنے کی ضرورت نہیں ہے کہ اُن کے لیے ماں کی آغوش میں بہت جگہ
تی ہے۔'' وہ ہونٹ بھینچ کر جواباً گویا ہوئی۔

''تو کیا۔'' اچانک دلشاد کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ ''ماں نے جو کچھ عرصے پہلے بچہ
ر چھوڑا تھا' وہ بھی اُن میں شامل ہوا؟'' اس کے اندر عجیب سے بے چینی سر اُٹھانے لگی۔ اک
طراب سارگ و پے میں ہلچل مچانے لگا۔ ''مائیں اپنے جسم کے ٹکڑوں کو اس طرح کیوں پھینک
تی ہیں باجی؟'' وہ معصومیت سے پوچھنے لگی۔

مشعل کے چہرے پر زہریلی مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔ وہ ایزی چیئر چھوڑ کر دریچے کے
س آ کھڑی ہوئی۔ ''ماں ایسا کب کرتی ہے بے بی۔ ماں کا اعزاز تو شرعی و قانونی اور اخلاقی
وابط سے گزر کر نصیب ہوتا ہے۔ ایسا صرف وہ کرتی ہے جو داشتہ ہوتی ہے۔ بد چلن' بے ضمیر اور
دین ہوتی ہے۔ وہ ماں نہیں ہوتی۔ مجسم نفس ہوتی ہے۔'' مشعل کی آنکھوں میں تنفر ٹھاٹھیں مار رہا
ا۔ ''اور نفس پرست عورت کالی گھڑیوں کے ثمر سینے سے لگا کر نہیں رکھ سکتی۔ اسی لیے اسے کوڑے
کے ڈھیر پر پھینک دیتی ہے۔ اپنے گناہ کو چھپانے کے لیے۔'' وہ کتنی ہی دیر باہر کھڑکی کی طرف
یکھتی رہی۔ دلشاد بھی اپنی سوچوں میں گم خاموش کھڑی تھی۔ ''خیر' تم جاؤ' جا کر اسکول کا کام کرو اور
سنو۔ تھوڑی دیر بعد خیراں آتی ہو گی اُس کے ساتھ ادارے میں پہنچو۔ تین دن بعد یوم دفاع ہے
جسے ہم نے بھرپور طریقے سے منانا ہے۔ تم چل کر بچوں کو قومی نغموں کی ریہرسل کرواؤ۔ ہری
پ۔''

☆☆☆

''کیا چاہتے ہو تم مجھ سے؟'' مینا بالآخر جھلا کر اس پر تقریباً برس پڑی تھی۔

''کم از کم ''وہ'' نہیں جو لوگ آپ سے طلب کرتے ہیں۔'' وہ زہر خند انداز میں مسکرایا۔

سیاہ سلیولیس ساڑی کا پلو شانوں پر ٹکاتے ہوئے مینا نے دانت پیس کر اُس کی طرف
دیکھا۔

''لیمن کلر کی شرٹ اور گرے پینٹ میں اس کی گندمی سرخی مائل رنگت بڑی نکھری لگ
رہی تھی۔ ہمیشہ کی طرح وہ اب بھی اسی بے نیازی' بے پروائی' اعتماد اور تمکنت کے ساتھ اُس پر طنز و

تمسخر کے لطیف جملے کررہا تھا۔ اسے چڑا رہا تھا۔ ذہنی طور پر زچ کر کے لطف لے رہا تھا اور
بااختیار ہونے کے باوجود اس عام سے صحافی کے سامنے بے بس ہوئی جارہی تھی۔ پیسہ، حسن
سب کچھ اُسے رام کرنے میں ناکام رہے تھے۔

''گھر ایک مقدس مقام کی حیثیت رکھتا ہے میڈم لیکن اگر کوئی اس گھر کی دیواروں کو
کررہا ہو' اُس کی بنیادیں کمزور کررہا ہو تو دیکھنے والے کو کیا کرنا چاہیے۔ آپ خود ہی جواب
پھر آپ کی سمجھ میں آجائے گا کہ میں کیا چاہتا ہوں اور کس لیے آپ کے پیچھے خوار ہو رہا ہوں
بڑے مطمئن انداز میں صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر بولا۔

''کیا بکواس کررہے ہو؟'' مینا یہ حملہ نہ سہہ سکی۔ وہ کڑے تیوروں سے اُسے گھورنے لگی

''میں جو کچھ کہہ رہا ہوں' آپ بخوبی سمجھ رہی ہیں۔'' وہ معنی خیز انداز میں مسکرا
اضطراری انداز میں اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''میں کچھ نہیں جانتی۔ تم جاؤ یہاں سے۔ اب میں تمہیں مزید ٹائم نہیں دے سکتی
شوٹنگ پر جانا ہے۔'' وہ اپنے ہونٹ چباتے ہوئے شکن آلود پیشانی لیے کہہ رہی تھی۔

ہارون نے بغور اُس کے قیامت خیز شعلہ فشاں سراپے کا جائزہ لیا۔ ''اداکارائیں اپنے
وجوانی کے خزانے کو فراخ دلی سے اپنے گاہکوں پر لٹاتی رہتی ہیں۔ اس میں تعجب کی بات نہیں
لیکن جو تیرہ میڈم بانو کے توسط سے آپ نے اپنایا ہے وہ......''

''شٹ اپ۔'' مینا حلق کے بل دہاڑی تھی۔

''شور مچانے سے حقائق نہیں دبا کرتے۔'' وہ پُرسکون انداز میں گویا ہوا۔

''کس ثبوت کی بنا پر تم مجھ پر الزامات لگارہے ہو۔ یو فراڈ۔''

''اسی کی جستجو میں تو لگا ہوا ہوں۔''

''کیا نام ہے' ایڈیٹرز کونسل کے ہیڈ کا۔ میں اُس سے بات کر کے تمہاری زبان بند
کرواتی ہوں۔'' وہ شعلہ بار نظروں سے اُسے گھورنے لگی۔

ہارون ہنس پڑا ''جس کے دل میں چور ہو وہ کبھی پُراعتماد ہو کر حالات کا سامنا نہیں کرتا
آپ نے ایسا کرنا ہوتا تو بہت پہلے کرچکی ہوتیں۔''

''میں تمہارا لحاظ کرتی جاتی ہوں۔ خدا جانے کیوں۔'' مینا نے جھنجلا کر اپنے بالوں کو مٹھی
جکڑ لیا ''مگر ہر لحاظ کی ایک حد ہوتی ہے۔'' پھر وہ تیور بگاڑ کر تندی سے گویا ہوئی۔ ''اب تم

سے چلتے پھرتے نظر آؤ اور دوبارہ مجھے اپنی شکل نہ دکھانا۔''

''سوچ لیں میڈم۔'' وہ نپی تلی پُرمعنی نگاہ اس پر ڈال کر کھڑا ہو گیا۔ ''جن حقائق تک میں
نے رسائی پائی ہے۔ وہ اگلے دن کے اخبار میں منظر عام پر بھی آسکتے ہیں۔''

مینا دم بخود رہ گئی۔ کتنی ہی دیر چپ کھڑی رہی۔ ''تم مجھے بلیک میل کررہے ہو؟'' اس نے
ڈپٹنے والا بارعب انداز اپنانا چاہا مگر اُس کی آواز کی کمزوری اور لہجے کا کھوکھلا پن اس کا ساتھ نہ
دے سکا۔

''بلیک میلنگ کا حربہ بزدل اور جلد باز لوگ اپناتے ہیں۔ جنہیں اپنی صلاحیتوں پر بھروسا
نہیں ہوتا۔ میرے ساتھ ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'' وہ ٹھوس اور مضبوط لہجے میں گویا ہوا تو مینا لب
کاٹنے لگی۔ ''بہرحال' میں پھر آؤں گا۔'' وہ ایک ٹٹولتی ہوئی نگاہ اُس پر ڈال کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا
ہوا ڈرائنگ روم سے نکل گیا۔

''یاخدا...... 'پھر'......'' وہ صوفے پر ڈھے گئی۔ ''یہ شخص مجھے پاگل کردے گا۔ کیوں اُلٹے
سیدھے حوالے سے مجھے ہراساں کرنے کی کوشش کررہا ہے۔ اُس کا کیا خیال ہے کہ......'' پھر وہ
کچھ سوچتے سوچتے اٹک سی گئی۔ ''وہ کبھی بھی ثبوت فراہم نہیں کرسکتا اور بے پر کی پر عوام کہاں کان
دھرتے ہیں۔'' وہ خود کو مطمئن اور پُرسکون رکھنے کی سعی کررہی تھی۔ ''میڈم بانو نے کچی گولیاں نہیں
کھیلیں۔ وہ بڑی شاطر کھلاڑی ہیں۔ بساط پر اپنی مرضی کے مہرے چلانا جانتی ہیں۔ ایک معمولی
سا عام سا صحافی اُن کی 'جڑ' کو نہیں پاسکتا۔'' وہ کافی حد تک ریلکس ہو گئی۔

ذہنی پراگندگی مٹتے ہی اسے کام یاد آ گیا۔ وہ اُٹھی۔ سائیڈ کیبنٹ سے ایک نمبر نکالا اور کارڈ
لیس پر ملانے لگی۔

''ہوں راشدہ۔ یہ میں ہوں مینا۔'' رابطہ ملنے پر وہ سپاٹ لہجے میں گویا ہوئی۔ ''میں نے
پانچ لاکھ کا چیک جمع کروایا تھا بے بی کے اکاؤنٹ میں مل گیا ہے کیا؟''

پھر اُدھر سے جواب سن کر ایک لمحے کو اُس کے چہرے پر دل گرفتگی نمودار ہوئی۔ ''وہ ذرا
جذباتی ہے۔ اسی لیے کہہ رہی ہے کہ اسے ضرورت نہیں ہے۔ بھلا پیسے کی کسے ضرورت نہیں
ہوتی۔ بہرحال میں چند دنوں میں گھر کا چکر لگاؤں گی۔ بے بی کی صحت تو ٹھیک ہے ناں۔ آج کل
اُس کی کیا مصروفیات ہیں؟'' حالانکہ کمرے میں کوئی نہیں تھا اور نہ ہی اُس کی اجازت کے بغیر آ
سکتا تھا مگر اس کے باوجود مینا کا لہجہ دھیما اور سرگوشیانہ تھا۔

دلشاد اب یہاں مکمل طور پر ایڈجسٹ ہو چکی تھی۔ مشعل نے اُس سے کہا تھا کہ اگر وہ چاہے
اس کے والدین کا سراغ لگایا جاسکتا ہے مگر دلشاد نے خود ہی منع کر دیا۔

"جن دروازوں کو بند کر آئی ہوں اُنہیں کھولنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا باجی۔ مجھے جینے
نئی راہ مل گئی ہے۔ اب تو روشنی کی کرن جاگی ہے۔ میں اُن اندھیروں میں واپس جا کر کیا کرو
گی۔ میرا نصیب بھی اباجی کی قسم کے مرد سے جوڑ دیا جائے گا۔ میں دوسری زرینہ نہیں بننا چاہتی۔"

"کیا تمہیں اپنی ماں اور بہن بھائی یاد نہیں آتے؟" دلشاد کے چہرے پر تکلیف دہ تاثرا
کے بادل منڈلانے لگے تھے۔

"یاد تو اُنہیں کیا جاتا ہے جن کے ساتھ کچھ گھڑیاں اچھی بیتی ہوں۔ میرے پاس اُنہیں
کرنے کے لیے کوئی خوش گوار حوالہ نہیں ہے۔" دلشاد نے اپنا دل پتھر کر لیا تھا۔ کبھی کبھی کاکو گڈو
اور نگینہ کے لیے دل میں ہوک اُٹھتی مگر وہ سختی سے ان آہوں کو دبا لیتی۔ پیچھے کیا بچا تھا۔ کیا رہا
اس بساندزدہ ماضی میں۔ دلشاد نے مشعل کی سوچ سے بھی کہیں جلدی خود کو ماحول سے ہم آہنگ
کر لیا تھا۔

اب وہ اس سفید کوٹھی کی ایک مستقل مکین بن چکی تھی۔ اسی فضا کا جزو محسوس ہوتی تھی۔

"باجی! ایک بات پوچھوں۔" اُس دن مشعل کے ہمراہ فیکٹری سے واپس لوٹتے ہو
اچانک ہی وہ مشعل کی طرف دیکھنے لگی۔

"پوچھو بھئی! ویسے تمہاری اس عادت نے مجھے اچھا خاصا ڈرا دیا ہے۔" نیلے سوٹ میں ملبو
کار ڈرائیو کرتی ہوئی مشعل نے ہلکے پھلکے انداز میں جواب دیا تھا۔

"آپ نے اب تک شادی کیوں نہیں کی؟" دلشاد اُس کا دلفریب چہرہ نظروں سے ٹٹول
رہی تھی۔

"کیوں کیا بوڑھی نظر آنے لگی ہوں؟ اور "اب تک" سے تمہاری کیا مراد ہے؟" وہ سابقہ
انداز میں رسانیت سے بولی۔ لہجے میں خوش گواریت کی رمق تھی۔

"میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" دلشاد نے فوری تردید ضروری سمجھی۔ "آپ بھلے سے دس سال
مزید نہ کریں۔ ایسی ہی بھرپور نظر آئیں گی۔ میں ویسے ہی پوچھ رہی تھی۔ عموماً اس عمر کی لڑکیاں
شادی شدہ یا منگنی شدہ ہو جاتی ہیں۔"

"مجھے شادی سے دلچسپی نہیں ہے۔" وہ دوٹوک بولی۔

"دلچسپی ہو نہ ہو کرنی تو پڑتی ہے باجی۔" دلشاد ہنس پڑی۔

"کیوں زبردستی ہے کیا۔ شادی زندگی کا ایک حصہ ضرور ہوتی ہے مگر زندگی کا حاصل ہرگز
قرار دی جاسکتی۔ جس طرح اور بہت سے کام انسان کرتا ہے اسی طرح شادی کرنا بھی ایک
ہے مگر ایسا کام نہیں ہے جسے سرانجام دینا سب پر لازم ہو، کچھ کر لیتے ہیں۔ کچھ نہیں کرتے۔ تم
سمجھ لو کہ میں بھی انہی لوگوں میں شامل ہوں جو اس "کام" کی اہلیت نہیں رکھتے۔" وہ بڑی توجہ
ڈرائیونگ کرتے ہوئے اس کے سوالوں کے جواب دے رہی تھی۔

"باجی! ایک اور سوال پوچھوں۔ آپ ناراض تو نہیں ہوں گی؟" دلشاد چوری سے اُس پر
نگاہ ڈال کر ہچکچاتے ہوئے گویا ہوئی۔

"جب پوچھے بنا چارہ نہ ہو تو بس پوچھ لیا کرتے ہیں۔ توجیہیں نہیں ڈھونڈتے۔ کہو۔" وہ
موڑ کاٹ کر مبہم سے انداز میں بولی۔

"بعض اوقات بندہ اس لیے بھی شادی نہیں کرتا کہ اسے اپنی سوچ کا محور نہیں ملتا یا جس سے
کرنا چاہتا ہے، حالات اس تک پہنچنے کی صورت پیدا نہیں کرتے۔ تو میرا مطلب یہ ہے کہ......"

"تمہارا مطلب میں سمجھ گئی ہوں۔" مشعل نے اُس کی بات کاٹ کر اُس کی مشکل آسان
کردی۔ "یاد رکھو، کچھ سوال ایسے ہوتے ہیں جن کا جواب صرف ہاں یا ناں میں نہیں دیا جاسکتا۔ ان
کے لیے ایک عمر درکار ہوتی ہے۔ مختصراً تم یوں سمجھ لو کہ میں نے شادی اس لیے نہیں کی کہ میری
شادی نہیں ہوسکتی تھی۔" وہ ونڈ اسکرین کے پار دیکھ رہی تھی۔

"مگر کیوں؟" معاً اس کے لبوں پر پھسل پڑا۔

"میرا خیال ہے اب ہمیں خاموش ہو جانا چاہیے۔" مشعل کے لہجے میں برفابی اُتر آئی۔

دلشاد نے ایک دم ہونٹ بھینچ لیے۔ خود پر لعنت ملامت بھیجنے لگی کہ میں نے کیا بے وقوفی کر
ڈالی۔ اس نے ایک دزدیدہ نگاہ برابر کی سیٹ پر ڈالی۔ مشعل کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ آنکھوں میں
ایک منجمد سا ٹھہراؤ تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ٹیپ آن کر دیا تھا۔ دلشاد خفیف سی ہو کر باہر دیکھ رہی
تھی۔

گاڑی میں گیت کے بول گونج رہے تھے۔

دنیا کرے سوال تو ہم کیا جواب دیں
تم کون ہو خیال تو ہم کیا جواب دیں

دلشاد ایک دم چونک کر مڑی۔

گیت کے بول اُسے معنی خیز سے لگے۔

پوچھے کوئی کہ دل کو کہاں چھوڑ آئے ہو
کس کس سے رشتۂ جاں توڑ آئے ہو
مشکل ہو عرض حال تو ہم کیا جواب دیں۔

''باجی نے کچھ سوچ کر ہی یہ کیسٹ خریدی ہوگی۔ کچھ نہ کچھ وجہ تو ہوگی' ایسے گیت کیا کوئی چور دروازہ ان کے دل کی طرف کھلتا ہے؟ دلشاد کے اندر خیالات کی ہبڑ دبڑ مچی۔

پوچھے کوئی کہ درد وفا کون دے گیا
راتوں کو جاگنے کی سزا کون دے گیا
کہنے سے ہو ملال تو ہم کیا جواب دیں

سفید کوٹھی آ چکی تھی۔ گاڑی پورچ میں کھڑی کر کے مشعل اپنی طرف کا دروازہ کھو جا چکی تھی۔

''کیا حال ہیں شادو رانی؟'' خیراں کھلے گیٹ سے اندر آتے ہوئے اسے پورچ میں دیکھ کر اُس کے قریب آ گئی۔ دلشاد اس ہنستی' مسکراتی' چہچہاتی' زندہ دل بے فکری لڑکی سے دنوں میں بے تکلف ہو چکی تھی۔ عمروں کا فرق بھی کہیں دور رہ گیا تھا۔

''خیراں' ایک بات تو بتاؤ''۔ دلشاد کے ذہن کی گرہ کھل کے نہ دے رہی تھی ''کیا میں کوئی مرد بی بی جی سے ملنے آیا ہے کبھی۔''

''نہیں جی نہیں۔'' بی بی جی ہور طرح کی عورت ہیں۔ کسی مرد کو کیا جرأت کہ ان کی آئے۔'' خیراں نے ایک دم مضبوط دوٹوک انداز میں جواباً کہا ''بی بی جی کو مردوں سے پسند نہیں ہے۔ یوں سمجھ لو انہیں مردوں سے ایک طرح کی چڑ سی ہے۔ بخشو بابا' چوکیدار کے علاوہ کوئی اس گھر کی چاردیواری کے اندر نہیں آیا۔''

دلشاد سوچ میں پڑ گئی۔ ''کیا کبھی فیکٹری یا ادارے میں بھی کوئی مرد نہیں آیا اُن سے'' وہ جانے کس بات کی سوچ میں ایسے سوال کر رہی تھی۔

''میرا تو خیال ہے کہ نہیں۔'' خیراں کنپٹی پر انگلی بجا کر بولی پھر یکلخت جیسے اسے کچھ
''آہاں۔ ہاں جی۔ ایک صاحب آتے تو ہیں ادارے میں کبھی کبھار مگر وہ بابا صاحب کو

لیے آتے ہیں۔ پہلے تو کبھی بی بی جی سے بھی سلام دعا ہو جاتی تھی مگر وہ اندر آنے سے پہلے خان چاچا سے پوچھ لیتے ہیں کہ بی بی اندر ہیں یا نہیں۔ اگر نہ ہوں تو آ جاتے ہیں ورنہ واپس چلے جاتے ہیں۔''

''او...... اچھا......'' دلشاد نے گہری سانس لی۔

''ویسے بڑا ایبا بندہ ہے وہ۔ ادارے کے فنڈ میں بڑی دفعہ خوشی سے رقم جمع کرائی ہے۔ کبھی بچوں کے لیے کھلونے' کتابیں اور پھل فروٹ بھی لے آتا ہے۔''

''مشعل باجی کو پتا ہے' ان کے آنے جانے کا؟''

''خبر نہیں۔'' خیراں نے بے خبری کا اعلان کیا ''ویسے ان صاحب کی کوشش بھی یہی ہوتی ہے کہ بی بی جی کو پتا نہیں لگے۔''

''مگر کیوں؟'' دلشاد نے اندر سے اُبھرتے اس فطری سے ''کیوں'' کا گلا نہ گھونٹ سکی۔

''رب دیاں' رب جانے شادو رانی۔ تم اندر تو آؤ۔''

''سنو خیراں۔'' وہ خیراں کے ساتھ اندر قدم بڑھاتے ہوئے معاً سرگوشی میں گویا ہوئی۔

''اب کے وہ صاحب آئیں تو مجھے ضرور بتانا۔ میں ان کو دیکھنے کے لیے بے چین ہوں۔''

''اچھا۔'' خیراں نے ہامی تو بھر لی مگر وہ بڑے اُلجھن بھرے انداز میں اُسے دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

''یہ مناسب نہیں لگتا' بڑی دلھن کہ تم رضوانہ کے بھائی کی شادی میں شرکت نہ کرو۔ چھوٹی دلھن کیا سوچے گی کہ جٹھانی میری خوشیوں سے جلتی ہے۔ دکھ سکھ سب کے ساجھے ہوتے ہیں بیٹی۔ چلو اٹھ کر چلنے کی تیاری کرو۔ کم از کم تین دن پہلے ہمیں پہنچ جانا چاہیے۔ آخر کو سمدھی ہیں۔'' اماں جی بڑے تدبر سے صفیہ کو جانے کے لیے آمادہ کر رہی تھیں۔

''مجھے مجبور نہ کریں اماں جی۔ میرا دل نہیں مانتا۔'' صفیہ تھکے تھکے رنجور انداز میں گویا ہوئیں۔

''دل کو مناؤ بیٹی۔ رضوانہ کے باپ سے تمہاری کوئی ان بن ہے۔ ٹھیک ہے' اس بارے میں ہم تم پر صلح صفائی کے لیے دباؤ نہیں ڈالتے۔ تم دونوں کی آپس کی بات ہے مگر رضوانہ کے ساتھ تو تمہاری کوئی دشمنی نہیں ہے۔ اُس کے بھائی عاصم سے بھی تمہارا جھگڑا نہیں ہے پھر اُس کی شادی میں شرکت نہ کرنے کا کیا جواز؟'' اماں جی ماہر وکیل کی طرح صفیہ کا گھیراؤ کر رہی تھیں۔ ''بلوکسر

کے ساتھ ہی تمہارا اپنا گاؤں ہے۔ تمہارا میکہ ہے۔"

"وہاں کون میرا منتظر ہے' ماسوائے ویرانی کے۔ وہ گھر تو کب کا کھنڈر ہو چکا۔" صفیہ کو
کے باوجود پلکوں کے ساحلوں پر اُمنڈتے آنسوؤں پر قابو نہ پا سکیں۔ لبوں سے بے ساختہ ایک
نکل گئی تھی۔

اماں جی تسلی دینے کے سے انداز میں اُن کی کمر سہلانے لگیں۔ "ایسا نہ کہو ماں باپ مٹی
مل گئے تو کیا ہوا' اللہ رکھے بھائی تو سلامت ہے۔"

"خدا جانے زندہ بھی ہے یا......" وہ ہتھیلیوں میں چہرہ چھپا کر سسک پڑیں۔

"برا سوچ کر دل برا نہیں کرتے۔ اللہ نے چاہا تو وہ حیات ہوگا اور دیکھنا' ایک دن پلٹ
واپس آ جائے گا۔"

"پچیس برس گزر گئے ہیں اُس کے انتظار میں۔ ماں اس کی یاد میں رو رو کر جھلی ہو گئی
ایک دن دنیا سے اُٹھ گئی۔ مراد بھیا تو جانے کس دیس کے باسی ہو گئے ہیں۔ کن راہوں میں گم
گئے ہیں۔"

"نہ جانے کیوں مجھے پختہ یقین ہے کہ علی مراد زندہ ہے۔ اسی دنیا میں ہے اور وہ ایک
ایک دن تم سے ضرور ملے گا۔ تسلی رکھو دلہن۔" اور کسی طرح سمجھا بجھا کر اماں جی نے انہیں راضی
ہی لیا۔

اگلے روز روانگی تھی۔

رات کو سب نے ایک ہنگامہ کھڑا کر رکھا تھا۔

اپنے جوتے کپڑے سنبھالنے کی فکر میں ہر کوئی ہلکان ہوا جا رہا تھا' خاص طور پر لڑکیوں کا
زیادہ ہی دھیان تھا۔ کہیں مہندی' بارات اور ولیمے کے سوٹوں میں سے کوئی مس نہ ہو جائے۔

ہارون نے البتہ سب کے ہزار اصرار کے باوجود جانے سے انکار کر دیا تھا۔

"میں آج کل بہت اہم کیس پر کام کر رہا ہوں اماں جی۔ کسی صورت فراغت کا متحمل نہیں
ہو سکتا۔" اس کے حتمی جواب پر اماں جی خاموش ہو گئیں۔

نہ جانے کیوں افراح کو اُس کا نہ جانا بہت محسوس ہوا جیسے ست رنگی دھنک کا کوئی رنگ پھیکا
پڑ گیا ہو۔ جیسے ماحول کی خوب صورتی اچانک دھندلانے لگی ہو۔ جیسے بادِ صبا جسم جاں کو چھو
چھوتے رخ پلٹ گئی ہو۔

"اے بیٹی۔ ذرا یہ چائے تو دے آنا ہارون کو۔ کب کا بچے نے کہا ہوا ہے۔ یہاں کسی کو
ہوش ہو تو اس غریب کا بھی خیال کرے۔ سب کو اپنی اپنی پڑی ہوئی ہے۔" کھانے کے بعد صفیہ
ممانی نے کچن میں پانی پینے کی غرض سے آئی افراح کو رک کر مصروفیت کے عالم میں چائے ہاتھ
میں تھمائی تھی۔ افراح پانی پی کر کپ تھامے ہارون کے کمرے میں آ گئی۔

"وہ غالباً باتھ روم میں تھا۔ ٹیبل پر کپ رکھتے ہوئے اُس کی نظر اِدھر اُدھر بکھرے کاغذات
اور کتابوں پر پڑی۔ انہی کے بیچ ایک ادھ کھلی ڈائری بھی تھی۔ وہ یونہی ہاتھ بڑھا کر کھول کر دیکھنے
لگی۔

"واؤ شاعری۔ اتنے خشک اور سنجیدہ بندے کو بھلا شاعری سے کیا لگاؤ ہو سکتا ہے۔" وہ
حیرانی سے ڈائری کے اوراق پلٹ کر دیکھ رہی تھی۔

ایک صفحے پر اس کی نگاہ جم سی گئی۔ فرحت عباس شاہ کی بڑی بڑی خوب صورت غزل کے
اوپر لکھا تھا۔

"میم کے نام۔"

افراح بے اختیار غزل کے مصرعوں میں گم ہوتی گئی۔

تمہارا پیار چھپ چھپ کے کئی چہرے بدلتا ہے' مجھے تم یاد آتے ہو
تمہارا ہجر شدت سے مرے دل کو مسلتا ہے مجھے تم یاد آتے ہو

"یہ میم کون ہے؟" وہ اضطراب کے عالم میں سوچ رہی تھی۔

سمندر آشنا آنکھوں میں صحرا آن بستے ہیں تمہیں جب بھول جاتا ہوں
پھر ان صحراؤں میں اک خواب کا چشمہ نکلتا ہے مجھے تم یاد آتے ہو

"وہ کون خوش نصیب شہزادی ہے۔ جس کے لیے ان سیاہ دلکش بوجھل آنکھوں سے خوابوں
کے چشمے پھوٹتے ہیں۔" افراح کا دل جیسے کسی پاتال میں اُترنے لگا تھا۔

تری پرچھائیاں ہر سو مرے تنہائیوں کا رقص کرتی ہیں۔ اداسی پر مرے سینے میں اک بے
چین سا پچھلتا ہے' مجھے تم یاد آتے ہو کسی فٹ پاتھ پر' بازار میں' باغات میں' یا پھر دریا کنارے پر
بہت خوش ہو کے جب کوئی کسی کے ساتھ چلتا ہے مجھے تم یاد آتے ہو۔

افراح دم بخود غزل میں چھپی محبتوں کی شدتیں محسوس کر رہی تھی۔

میں سارا دن کوئی سنگی مجسمہ بن کر رہتا ہوں مگر جب شام ڈھلتی ہے

میرے دل کی جگہ پر کوئی پتھر سا پگھلتا ہے' مجھے تم یاد آتے ہو
کبھی کوئی ستارہ آنکھ سے ہوتا ہوا' بجھتا ہوا آئے گود میں گر کر
کبھی کوئی بہت ہی دور اُبھرتا اور ڈھلتا ہے مجھے تم یاد آتے ہو

افراح نے دل میں گہری کسک لیے ڈائری بند کر دی۔ اسے اپنے احساسات خود بھی بج
آ رہے تھے۔ ایک دم جیسے اندر کچھ ٹوٹنے کی صدا اُبھری تھی۔ وہ اس واردات قلب پر حی
پریشان بلکہ ہراساں کھڑی رہ گئی تھی۔

معاً اس کی نگاہ ٹیبل پر رکھے کارڈ پر پڑی "ہارون احمد۔ نیوز رپورٹر۔" اور نیچے نیوا
نام بھی تحریر تھا......

"ہارون بھائی تو آئی بی میں ملازم ہیں۔ ایک انتہائی حساس ادارے سے منسلک ہیں
جعلی کارڈ کس غرض سے بنوایا ہے؟" اُسے حیرت نے گھیر لیا تھا پھر خیال آیا' سیکرٹ ایجنسی
آفیسر کو معاملات کی تفتیش کے لیے بعض اوقات اس قسم کی تراکیب سے بھی کام چلانا پڑتا ہے
سکتا ہے' یہ پریس کارڈ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہو۔

کارڈ کے ساتھ ہی ایک بلیو سادہ سی فائل تھی جس سے کچھ کاغذات جھانک رہے تھے۔
ہارون ابھی اسی فائل پر کام کر رہا تھا۔ اسی لیے فائل کا ہک بند کیے بغیر یونہی اُٹھ گیا تھا۔ فائل
ہارون کے ہاتھ سے لکھے کچھ کاغذات نتھی کیے ہوئے تھے۔ باہر جھانکتے ہوئے کاغذ کی پیش
انگریزی حروف میں لکھا ہوا "مینا گل" اچانک ہی افراح کی نظر کی گرفت میں آیا تھا۔

"مینا گل؟" وہ بھونچکی رہ گئی۔

"اس کا ہارون بھائی سے کیا تعلق......؟" پھر اُس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔

"میم کے لیے۔" "اُمیں بھی کتنی بے وقوف ہوں۔ میم سے مینا ہی تو بنتا ہے۔ اب سمجھ آ
وہ مینا گل کے لیے برباد ہوئے ہیں!
تو کہیں اسی لیے صفیہ ممانی مینا سے نفرت کرتی ہیں؟
وہ ایک فلم ایکٹرس کو بہو کے طور پر قبول نہیں کر سکتی تھیں' شاید اسی لیے۔ ویسے مینا گل عم
ہارون بھائی سے کچھ بڑی ہی ہو گی۔ خیر عشق نہ پچھے ذات۔

باتھ روم کا دروازہ کھلنے کی آہٹ سنتے ہی وہ ٹیبل سے دور ہو گئی تھی۔ ہارون تولیے
رگڑتا ہوا باہر آیا تھا۔

"ہارون بھائی۔ یہ آپ کی چائے۔" وہ اپنے حواس پر قابو پا کر جلدی سے اپنی موجود

ں کرنے لگی۔
"شکریہ۔ تم نے کیوں تکلیف کی۔ اسماء لے آتی۔" وہ حسب معمول نہایت تکلف اور
سے مخاطب تھا۔

"کوئی بات نہیں۔" افراح ہولے سے کہہ کر اُس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ یوں جیسے چھ سال پہلے
داستان کے عکس پڑھنا چاہتی ہو۔ تو کیا مینا گل کی ذات اتنی طاقت ور تھی کہ ایک باہوش'
اور باوقار مرد کو صحرا کی خاک چھاننے پر مجبور کر دیا؟ غالباً پریس کارڈ بھی تقریب بہر ملاقات
لے میں بنوایا گیا تھا۔ ہارون مکمل طور پر اس کی موجودگی کو فراموش کیے چائے کی طرف متوجہ
تھا۔ افراح تھکے تھکے بوجھل قدموں سے واپس لوٹ آئی۔ دل کے طاق میں سجا آس کا
یکلخت بجھ گیا تھا۔ اب وادی دل میں بڑا اندھیرا تھا۔

☆☆☆

"خاتون' آپ کو شاید ایک بار کے کہے کی سمجھ نہیں آتی۔ میں پہلے بھی کئی بار کہہ چکی ہوں
نے وجود کی قیمت میرے کھاتے میں ڈال کر مجھے "حصے دار" نہ بنایا کریں اور براہ کرم یہاں
نہ لایا کریں۔ ابھی کچھ عرصے زندہ رہ لینے دیں۔ کچھ اچھے کام کر لینے دیں۔ سیاہیاں تو
ندر بن ہی چکی ہیں۔ بالآخر مگر میں ابھی زندگی سے کچھ مہلت چاہتی ہوں۔ مت احساس
یں مجھے بے چارگی کا۔" دلشاد ڈرائنگ روم کے پاس سے گزرتے ہوئے اچانک ہی ٹھٹک
گئی تھی۔ مشعل کی سرد مہر' زہریلی اور ترش آواز نے اسے ششدر کر دیا تھا۔ وہ تو بڑی نرم رو
ے لب و لہجے کی مالک تھی۔

"خفا نہ ہو مشعل بیٹی۔ یہ تو مجھ سے ملنے آئی تھیں۔ ادھر سے گزر رہی تھیں تو۔" آپا اماں کی
بھری آواز نے اُن کی موجودگی کا یقین دلایا تھا۔

"آخر کون آیا ہے۔" دلشاد کی تجسس کی رگ پھڑک اُٹھی۔ اس نے دبے پاؤں کھڑکی کے
سرکتے ہوئے آہستگی سے پردہ اُٹھایا اور دوسرے لمحے زمین و آسمان اُس کی نظروں میں
ر رہ گئے۔

اُسے جیسے اپنی بینائی پر شبہ ہونے لگا تھا۔ یہ چہرہ تو وہ باہر آتے جاتے بارہا دیکھ چکی تھی۔ کبھی
ال کے آگے لگے بڑے سے بورڈ پر' کبھی کسی بک اسٹال پر لٹکے رسالوں کے ٹائٹل پر۔
ت اور ٹی وی کے مختلف چینلز پر۔ وہ بھلا کیسے نہ پہچانتی۔ وہ آج کل کی سب سے کامیاب اور

مقبول اداکارہ تھی۔

میناگل۔

جس کو حقیقت میں دیکھنے کا وہ خواب میں بھی نہ سوچ سکتی تھی۔ سنہری آنکھوں، سیاہ گھ
جیسے آبشار بالوں اور قیامت خیز سراپے کی مالک لاکھوں دلوں کی دھڑکن، وہ پریوں کی
رانی آج اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اُسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔

''آپ سامنے آتی ہیں تو میری تنکا تنکا جوڑ کر تعمیر کی ہوئی ذات بھربھری مٹی کی طر
جاتی ہے۔ بے چہرہ اور بے شناخت ہونے کی ذلت سوا تر ہو جاتی ہے۔ کیوں مجھے کا
گھسیٹتی ہیں۔'' مشعل کا لہجہ چیخ رہا تھا۔

''راشدہ سے میرے خصوصی و قریبی مراسم رہے ہیں۔ اسی سبب مجھے تم پر بے اختیار
ہے۔ میں اگر تمہارے لیے کچھ کرتی ہوں تو اپنی خوشی سے کرتی ہوں۔ اسے ٹھکرایا نہ کرو۔''
میناگل بے حد نرم اور میٹھے رسیلے لہجے میں مخاطب تھی۔

''جو خود زمانے بھر کے ٹھکرائے ہوئے ملعون و معطون لوگ ہوں، وہ کچھ بھی کر سکتے
ابھی تو آپ کو زبان سے کہہ رہی ہوں، ایسا نہ ہو کسی دن ضبط کا پیالہ لبریز ہو جائے اور مجھے عم
آپ کے قدم واپس موڑنے کے لیے کوئی اقدام کرنا پڑے۔'' مشعل نے بڑے کھرد
سفاک و سرد انداز میں کہا تھا۔

میناگل لب کاٹتی ہوئی بغور اُس کی طرف دیکھنے لگی پھر مشعل کے قریب آ کر اس کے
پر ہاتھ رکھا۔ ''تم مجھ سے اتنا خار کیوں کھاتی ہو بے بی حالانکہ......'' وہ اسے اپنے سینے
پیار کرنا چاہتی تھی مگر مشعل نے اس کا جملہ اور عمل پورا ہونے سے پہلے ہی اس بے دردی
کے ہاتھ جھٹکے تھے، جیسے لمس نہ ہو، سانپ بچھو کا ڈنک ہو۔

''میرے قریب نہ آئیں۔ مجھے آپ کے وجود سے بساند آتی ہے۔ اس گلے سڑ
زدہ جسم کو مجھ سے دور رکھیں۔''

''بس کرو بیٹی، گھر آئے مہمان کو ایسے نہیں کہتے۔'' آپا اماں نے غیظ سے کانپتی ہوئی
کی کمر تھپتھپائی۔ اُن کا لہجہ شکست خوردہ اور مایوس کن تھا۔

''یہ مہمان نہیں بلائے جان ہیں۔ نہ صرف میرے لیے بلکہ پورے معاشرے کے
میں ان کے غلاظت بھرے قدم اس گھر میں برداشت نہیں کر سکتی آپا اماں۔'' وہ شرر بار نظر

گل کو دیکھ رہی تھی اور غم و غصے سے نڈھال ہو رہی تھی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ مشعل کے اتنے
ین آمیز سلوک کے باوجود وہ جوابی کارروائی نہیں کر رہی تھی۔ اس کی بے رحم اور سخت ترین باتیں
بت کے گھونٹ سمجھ کے پی رہی تھی۔

''میرا خیال ہے، تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میں چلتی ہوں۔'' وہ گہری سانس لے کر
یک ہی کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔

اب ڈرائنگ روم میں صحرائی سکوت طاری ہو چکا تھا۔

''آپا اماں، کیوں امتحان لیتی ہیں یہ میرا؟ کس لیے آتی ہیں یہاں؟ ان کا یہاں کون دفن
ہے؟'' وہ دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر بے جان انداز میں کارپٹ پر گر گئی تھی۔ لہجہ درد کی شدت
سے پھٹا جا رہا تھا۔

''مشعل، میری جان۔ کیوں اپنے آپ کو ہلکان کرتی ہو بیٹا۔ وہ تو میرے حوالے سے آتی
ہے۔ مجھ سے کئی سال پہلے دوستی کا بندھن استوار ہوا تھا اسی وجہ سے تم کو عزیز رکھتی ہیں۔'' آپا اماں
وں کا رٹا رٹایا کمزور سا جواز پیش کر رہی تھیں۔ مشعل کے لبوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ پھوٹنے
لگی۔

''مت بہلائیں ان بے سروپا بہانوں سے آپا اماں۔ میں جانتی ہوں، یہ کس قماش کی عورت
ہے، بلکہ میں تو وہ سب کچھ بھی جانتی ہوں جسے چھپانے کے لیے آپ تاویلیں دیا کرتی ہیں۔'' وہ
ب سے انداز میں مسکرائی

''کیا کہہ رہی ہو بیٹے۔'' آپا اماں ٹپٹا کر اُسے دیکھنے لگیں۔

''چھوڑیں آپا اماں۔ جلے ہوئے خیموں کی راکھ کریدنے سے کیا حاصل۔ اب تو کچھ بھی
ہیں ہو سکتا۔ بہرحال آپ اُس سے کہہ دیں کہ یہ نقابیں پہن کر یہاں نہ آیا کرے۔ میں بے
ف نہیں ہوں آپا اماں۔ سب سمجھتی ہوں، جانتی ہوں اس عورت کی ''جڑ'' کو۔'' وہ غضب سے
نکار رہی تھی۔

''بیٹے، میری مانو تو تم گھر بسا لو۔'' آپا اماں نے اپنی طرف سے جیسے بڑا صائب مشورہ دیا
ا۔

وہ استہزائیہ انداز میں انہیں دیکھنے لگی۔ ''بے شناخت لاشوں کا کوئی وارث نہیں ہوا کرتا آپا
اں۔'' وہ بے رحمی سے مسکرائی۔

"ایسا نہ کہو میرے چاند۔" آپا اماں نے بے ساختہ اس کو سینے سے لگالیا۔ ان کی آنکھیں
آئی تھیں۔

"میں بے حس ہو چکی ہوں آپا اماں۔ ہر خوشی اور ہر غم سے ذہن کو آزاد کرلیا ہے۔ میں
اپنے وجود کو اس دنیا میں لانے کے ذمے دار شخص کو دیکھنے کی مہلت چاہتی ہوں۔" اس کے ل
پُراسراریت دلشاد کی سمجھ سے باہر تھی۔

"پیدا کرنے والا تو خدا ہے بیٹا۔"

"مگر وہ یہ کام بھی کسی وسیلے سے ہی کرتا ہے میں اس "وسیلے" کی کھوج میں ہوں۔
کارپٹ سے اُٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ "میں نے خود کو ہمیشہ با مقصد اور باعمل زندگی گزارنے کا عاد
ہے۔ قطع نظر اپنے ماضی کے خود کو یہی باور کرایا ہے کہ۔

ضرور کچھ تو ہے اپنی حیات کا مقصد
سنا ہے چیز کوئی دہر میں فضول نہیں

مگر آپا اماں پانی پر بنائے ہوئے مکان لاکھ پُرشکوہ سہی پائیدار تو نہیں ہو سکتے ناں۔
اپنی ذات پر فخر کرنا چاہتی ہوں۔ اپنے ہونے کو مکمل طور پر محسوس کرنا چاہتی ہوں مگر کسی نکتے پر پہنچ
پھر سے اتھاہ گہرائیوں میں پستیوں میں خود کو دھنسا ہوا پاتی ہوں۔ شاید یہ جنگ ہمیشہ جاری ر
گی۔"

"وہ لوگ کبھی نہیں ہارا کرتے جن کا عزم اور پختہ ارادے ان کے سفر کا زادِ راہ بن جا
ہیں۔ میری جان میں ہوں ناں تمہارے ساتھ۔" آپا اماں کا ممتا کے نور سے دمکتا چہرہ مشعل کے
کی تاریکیاں دور کر رہا تھا۔

کیا کروں میں
آسمان کو اپنی مٹھی میں پکڑلوں
یا سمندر پر چلوں
پیڑ کے پتے گنوں
یا ٹہنیوں میں جذب ہوتے اوس کے قطرے چنوں
ڈوبتے سورج کو انگلی کے اشارے سے بلاؤں
رات میں سایہ بنوں

خالی آنکھوں میں تجیلے رنگ ڈھونڈوں
صاف چہرے پر سیاہی سے کوئی قصہ لکھوں
کیا کروں میں
اپنے ہی پیروں سے اُلجھوں اور گروں
پھر اپنی آنکھوں سے چھپوں
اور اپنی خواہش پر ہنسوں
کیا کروں
لاحاصلی کی سرد چادر اوڑھ لوں
اور چپ رہوں
یا سوسوں کے برف زاروں سے
تمہیں آواز دوں؟

☆☆☆

رات کے تین بج رہے تھے۔

"ہالی ڈے ان۔" کے سیکنڈ فلور کے ہال میں "عالیشان" شخصیات کا جھرمٹ تھا۔ رقص و
موسیقی کا فنکشن تھا اور وہ بھی صرف "کلاس" کے لوگوں کے لیے۔ سیاسی و سماجی اور کاروباری
حلقوں کی نامی گرامی شخصیات کے علاوہ شوبز کے نامور لوگ بھی مدعو تھے۔

شباب کے جلوؤں کے ساتھ شراب و کباب کا دور بھی چل رہا تھا۔ بڑے لوگوں کے فنکشن
میں ساغر و مینا کی شمولیت عام سی بات ہے۔

مینا حسب معمول صحافیوں مداحوں اور فلم پروڈیوسرز کے نرغے میں تھی۔ بہ مشکل میڈم بانو
اُسے یہاں سے نکالنے میں کامیاب ہوئی تھیں۔ ایک نسبتاً پُرسکون گوشے کا انتخاب کر کے وہ مینا کو
لے کر بیٹھ گئیں۔ ویٹر انہیں بیٹھتا دیکھ کر لپک کر قریب آیا تھا۔

"مارٹینی لے آؤ۔ میرے لیے نیٹ میں لانا اور مینا چندا تم کیا لوگی۔"

"شمپین اور ذرا جلدی۔ پیاس سے حلق میں کانٹے اگ رہے ہیں۔"

ویٹر آرڈر لے کر برق کی تیزی سے پلٹا تھا۔ تقریباً سب مہمان اس وقت پینے پلانے سے
شغل فرما رہے تھے۔

"تمہاری مون گروپ آف انڈسٹریز کے مالک سے ملاقات ہوئی؟" میڈم بانو نے
کا آغاز کیا۔ اسی اثنا میں ویٹر ٹرے تھامے ٹیبل کے پاس آ گیا تھا۔

"وہی جو مِلَینیر (Millioneer) ہے! ملک کا سب سے دولت مند صنعت کار
نے پیگ بناتے ہوئے دریافت کیا۔

"ہاں۔ بڑا مالدار شخص ہے اور بڑا نخریلا۔ کسی کسی کو ہی لفٹ کراتا ہے۔ تمہارے ساتھ
ہی اداکارائیں اُس سے ایک ملاقات کو ترستی ہیں۔ وہ جس عورت کے ساتھ چند گھنٹے گزار
پھر ساری زندگی بھی ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر بیٹھی رہے تو اُس کو روپے پیسے کی حاجت نہیں رہ
ہاتھ کا کھلا ہے۔ لاکھ دو لاکھ کی گڈی تو ہاتھ سے گر جانے پر فرش سے دوبارہ اُٹھانے کی بھی ز
نہیں کرتا' بے پروائی سے آگے بڑھ جاتا ہے۔" میڈم بانو کی یہ خوبی تھی کہ موٹی آسامی کے
تمام تر معلومات کا ریکارڈ رکھتی تھیں۔ "امریکا' جاپان وغیرہ تو یوں آنا جانا لگا رہتا ہے' جیسے
اورنگی چورنگی تک جائے۔" وہ بتا رہی تھی۔ "صبح سنگاپور تو شام کو نیویارک' آج اس خطے میں
اُس میں۔ ہر ملک میں اُس کی برانچ موجود ہے۔"

تفصیل سن کر مینا کی آنکھوں میں دلچسپی جاگنے لگی۔ تو وہ مزید بولی۔ "میں آج کل
کوشش کر رہی ہوں تمہارے لیے ٹائم لینے کی۔ تمہیں ایک گھنٹا بھی دے دے تو سمجھو قسمت
گئی۔"

"اچھا' کب تک متوقع ہے یہ ملاقات؟" اپنے حسن و جوانی کی داد اور دولت دونوں
کی کمزوری تھے۔

"شاید اگلے ہفتے تک بات بن جائے۔ بس تم موقع پاتے ہی اُسے اپنی مٹھی میں کر لینا
تم سے خوش ہو گیا تو لازماً دوبارہ بھی طلب کرے گا۔ کوئی کسر نہ چھوڑنا۔ میری بات سمجھ رہی ہو

وہ میڈم بانو کی نظر کی زبان سمجھ کر معنی خیز انداز میں مسکرائی۔ "فکر ہی نہ کریں آپ۔
جانتی ہوں کہ حسن و شباب کا چارا ڈال کر کس طرح سخت چٹانوں کو موم بنایا جاتا ہے۔" وہ نخ
سے سر جھٹک کر بولی۔

"خیر اس میں تو کوئی شک نہیں۔" میڈم بانو نے فراخ دلی سے اُس کی تعریف کی' "تم
اس وفاقی وزیر کو جس طرح اُلو بنا کر راز اگلوائے تھے' وہ تمہارا ہی کام تھا۔ اس سے پہلے کتنی
لڑکیوں کو آزما چکی تھی مگر کسی کو خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ یہ کامیابی تمہارے حصے میں ت

تھی۔ بگ باس بڑے خوش ہوئے۔ وہ بھی تمہاری صلاحیتوں کے دل سے معترف ہو چکے ہیں۔ تم
نے بڑے بڑے پیچیدہ بلکہ ناممکن پراجیکٹس کو کامیابی سے ہمکنار کیا ہے۔ بڑی بڑی سرکردہ ذمے
دار شخصیات کو اپنے شباب کی آنچ سے پگھلا کر قیمتی راز حاصل کیے ہیں۔ اب تو میں بجا طور پر یہ کہہ
سکتی ہوں کہ میرے بعد تم میری جانشین ثابت ہو گی۔" میڈم بانو کی نظروں میں ستائش اور اطمینان
کی جھلک تھی۔

"آپ تو خواہ مخواہ مجھے شرمندہ کر رہی ہیں میڈم۔" مینا اپنی تعریفیں سن سن کر کھلی پڑ رہی تھی۔
بڑی بات تھی جو میڈم بانو اس کے کام کو سراہ رہی تھیں ورنہ اُن کے معیار پر پورا اترنا ہر کسی کے بس
کی بات نہ تھی۔

"تم کل رات کہیں "بک" ہو؟" میڈم نے برسبیل تذکرہ پوچھ ڈالا۔

"ہاں۔" مینا کے چہرے پر بے باک مسکراہٹ آ گئی۔ "اب تو ایسی عادت پڑ گئی ہے کہ
ایک رات بھی اپنے گھر پر گزاروں تو در و دیوار سے وحشت ہونے لگتی ہے۔"

"تمہارا سیزن ہے جانو۔ اچھا ہے' دونوں ہاتھوں سے کماؤ۔ یہی تو وقت ہوتا ہے' اپنے آپ
کو کیش کرانے کا۔ بڑھاپے کے لیے جمع کرنے کا' میڈم اُس کی کارکردگی پر خوش ہو کر سر ہلانے
لگیں۔ "خیر پرسوں کے لیے تم کچھ فراغت پا کر میرے ہاں آنا۔ میں تمہیں ایک نیا "ٹارگٹ"
دوں گی۔"

"تھوڑا بہت حدود اربعہ بتا دیں تا کہ آسانی رہے۔" مینا شوخی سے بولی۔

"اسٹیبلشمنٹ کا ایک بندہ ہے' خاصا چلتا پرزہ ہے۔ میں چاہتی ہوں' تم اسے قابو کر لو۔ بگ
باس کو اُس سے کچھ خفیہ کاغذات کے بارے میں پتا کروانا ہے۔ کوشش کرو کہ کسی طرح اُسے دو چار
دنوں کے لیے کسی ہوٹل میں یا ہل اسٹیشن لے جاؤ۔ سیر و تفریح کے دوران میں سلیقے طریقے سے
پوچھ لینا۔ ویسے بھی کوئی جلدی نہیں ہے۔"

"میڈم آپ کچھ اور تو پسند کریں گی؟" اس سے پہلے کہ وہ اس آدمی کا نام پتا بتائیں' تھوڑی
دور آڑ میں کھڑے ویٹر نے دوبارہ پاس آ کر مؤدبانہ دریافت کیا۔

"نہیں بھئی۔ جب چاہیے ہو گا' بلوا لیں گے۔ تم کیا سر پر کھڑے ہو۔ جاؤ یہاں سے۔" وہ
جھلا کر اس پر برس پڑیں۔

وہ میڈم بانو کے تیور دیکھ کر فوراً وہاں سے چھوٹ لیا پھر محتاط قدموں سے لفٹ کے ذریعے

نیچے ہوٹل کے لان میں آیا۔ ایک نسبتاً سنسان جگہ نیم تاریکی میں کھڑے ہو کر اس نے جیب
ہارون کا دیا ہوا موبائل فون نکالا اور کوئی نمبر ملانے لگا۔

''ہاں بھئی' کیا رپورٹ ہے؟'' ہارون کی نیند بھری مگر چوکس آواز سن کر وہ تفصیلاً بتانا ش
ہو گیا۔

''سر' کافی سریس معاملہ ہے۔'' پھر وہ میڈم بانو اور مینا کے درمیان ہونے والی ساری گ
دُہرانے لگا۔

''اس کا مطلب ہے' میرا شبہ درست ثابت ہوا ہے۔'' ہارون نے گہری سانس لے کر ک
''بڑی مدت سے ہمارا محکمہ اس کھوج میں لگا ہوا تھا کہ سرکاری راز لیک آؤٹ کرنے وا
غیر ملکی جاسوس گروہ کی نشاندہی کی جا سکے۔ سر کھپانے کے باوجود کوئی سراغ نہ ملا اور اب تک ای
بہت سے قیمتی راز دشمن ایجنٹ تک بحفاظت پہنچنے کا سلسلہ جاری ہے۔ مجھے چار ماہ قبل اس مش
رپورٹ تیار کرنے کا فریضہ سونپا گیا تھا اور میں نے ابتدائی کارروائی کے دوران میں ہی محسوس
تھا کہ ہو نہ ہو اس معاملے میں کچھ بااثر خواتین ملوث ہیں جو بظاہر شوبز سے تعلق رکھتی ہیں مگر بز
طور پر جسم فروشی کے پیشے سے منسلک ہیں۔ خیر یہ بتاؤ' تم نے مذکورہ افسر کا نام سن لیا تھا!'' ہا
نے اسسٹنٹ طاہر سے دریافت کیا۔

ہارون نے ایک پلاننگ کے تحت اسے ''ہالی ڈے ان'' میں ایک ماہ قبل ویٹر کی نوکری دلا
تھی۔ یہ ہوٹل میڈم بانو اور مینا گل کی پسندیدہ جگہوں میں شامل تھا۔ دونوں کسی تقریب کے ب
میں یا فراغت کے اوقات میں اکثر یہیں پائی جاتی تھیں۔ طاہر درحقیقت آئی بی کا ملازم تھا
ہارون کے انڈر تھا۔

''جی ہاں سر۔'' وہ پُراعتماد انداز میں مسکرایا۔ ''ان پر میں نے یہی ظاہر کیا تھا کہ اُن کی ڈا
سن کر میں فوراً فو چکر ہو رہا ہوں مگر آرڈر لے کر جاتے جاتے اس افسر کا نام سن چکا تھا۔ اس کا تعل
مرکزی پی آر او محکمے سے ہے۔ مسٹر تنویر جمال۔''

''ہوں۔'' ہارون نے پُرسوچ انداز میں ہنکارا بھرا پھر اچانک ایک خیال اس کے ذہن م
لپکا۔ ''تم ایسا کرو۔ ویٹر کا ڈھونگ ختم کر کے تنویر جمال کی خفیہ نگرانی کا کام شروع کر دو۔''

''سر اگر ویٹر کی جاب چھوڑنے کے بجائے منیجر سے کچھ دنوں کی چھٹی لوں تو کیسا رہے گا؟
ہو سکتا ہے' ہمیں دوبارہ معلومات حاصل کرنے کی غرض سے ہوٹل کے اندر اپنے بندے ک

رورت پڑے۔'' طاہر نے تجویز دینے کے لیے شائستہ انداز میں کہا۔

''بالکل ٹھیک۔'' ہارون مناسب رائے فوراً قبول کر لینے کا عادی تھا۔ ''دوسرا کام یہ ہے کہ
فید لباس میں کچھ بندوں کو ایف سیون میں موجود ایک کوٹھی پر نگرانی کے لیے مقرر کرنا ہے۔ کوٹھی کا
ہر اور اسٹریٹ نمبر نوٹ کر لو۔'' ہارون نمبر بتا کر مزید تفصیلات سے آگاہ کرنے لگا۔ ''یہاں میڈم
نو نے کال گرلز کے لیے ایک اڈہ بنایا ہوا ہے۔ مینا گل بھی میڈم بانو کے بلاوے پر اس کوٹھی میں
تی جاتی رہتی ہے۔ ویسے تو میڈم بانو نے شہر کے تقریباً ہر پوش سیکٹر کی کوٹھیوں میں عیاشی کے خفیہ
ے کھول رکھے ہیں لیکن ایف سیون والی اس لال کوٹھی کی حیثیت ''مرکزی پلیٹ فارم'' کی سی
ہے۔ اُمرا اور رؤسا اور عیاش طبع لوگوں کے لیے میڈم بانو کی کوٹھیوں کے راستے جانے پہچانے ہیں۔
لاہر یہ گیسٹ ہاؤس ہیں مگر درپردہ پُرسکون اور پُرتعیش خلوت گاہیں ہیں جہاں حرص و ہوس کے
ے اپنی پیاس بجھانے کے لیے کشاں کشاں چلے آتے ہیں۔''

''سر آپ کی کارکردگی سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ دن رات ایک کر کے کیس کے سلسلے میں
یادہ سے زیادہ معلومات اور تفصیلات جمع کرنے میں بزی ہیں۔'' طاہر کے لہجے میں توصیف
ی۔

''میرے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ ہے طاہر۔ میں ہر قیمت پر ان بدنما اور کریہہ چہروں کو
بے نقاب کرنا چاہتا ہوں جو ہماری جڑوں کو کھوکھلا کر رہے ہیں۔'' ہارون کا لہجہ بہت ٹھوس اور
عزم تھا۔ ''پہلے میرا خیال تھا' میڈم بانو طوائف ہے اور اب بڑھاپے میں ''اماں بی'' بن کر
لوائفوں کی سرپرستی کر رہی ہے مگر اب مجھے یقین ہوتا جا رہا ہے کہ یہ حسین ناگن اصل میں غیر ملکی
یجنٹ ہے یا کم از کم اُس کے دشمنوں سے روابط ضرور ہیں جن کے ذریعے قیمتی راز ادھر سے اُدھر
بھیجے جا رہے ہیں اور مینا گل اس سلسلے میں میڈم بانو کی معتمد ساتھی ہے۔ خدا جانے دونوں کا تعلق
یر ملکی جاسوسوں سے ہے یا اُن کی آلہ کار بن کر کام کر رہی ہیں؟''

''سر' میرا خیال ہے' یہ ایک پورا گروہ ہے اور کال گرلز کے روپ میں میڈم بانو لڑکیوں کو
ارالحکومت کے سرکردہ افسران کے پیچھے لگا کر اُن کو جال میں پھنسا کر اپنی مرضی کی معلومات
عاصل کرتی ہے۔ گویا ایک منظم سازش کے تحت سب کچھ عمل میں آ رہا ہے؟'' طاہر نے اپنا نقطہ نظر
یش کیا۔

''ہوں مگر یہ سب مفروضات اور شبہات ہیں اور ہمیں انہیں حقائق کے روپ میں سامنے

لانا ہے اور حقائق کو منوانے کے لیے ثبوت کا ہونا بہت ضروری ہے۔ خیر ہم مل کے لگے ہوئے
کچھ نہ کچھ سامنے آ جائے گا۔ اچھا' یہ بتاؤ۔ ایف ایٹ میں کسی شراب خانے کا پتا جانتے ہو؟''
ہارون نے بات پلٹی۔

''وہاں ایک نہیں' بہت سی شراب کی دکانیں کھل گئی ہیں۔''

''ہاں' میں جانتا ہوں مگر اُن میں سے کچھ خفیہ ہیں البتہ چند نڈر اور بارسوخ مالکان
عام شراب فروشی کی دکانیں کھول رکھی ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ پولیس ان پر ہاتھ نہیں ڈال
خیر۔ آمدم برسر مطلب۔ مجھے حال ہی میں خفیہ اطلاع کے ذریعے علم ہوا ہے کہ ایف ایٹ میں
شراب خانہ میڈم بانو کی سرپرستی میں چل رہا ہے۔ بلکہ ایف ٹین میں بھی اس مقصد کے لیے
کے خاص آدمیوں نے ایک شاپ خرید لی ہے جسے جلد ہی بار میں تبدیل کر دیا جائے گا۔ تمہا
پاس وقت ہو تو ایک چکر ان شاپس کا بھی لگا لینا اور کوئی غیر معمولی بات محسوس کرو تو مجھے مطلع
اوکے......'' طاہر نے بھی خدا حافظ کہہ کر موبائل آف کر دیا۔

☆☆☆

''رمضو۔ اے رمضو۔ اوئے بہرا ہو گیا ہے کیا تو؟''

حسب معمول وہ کیاریوں میں لگے پودوں کی دیکھ بھال میں لگا ہوا تھا' جب سرخ او
چنری پرنٹ کے کپڑوں میں ملبوس الھڑ سی خیراں اپنی گندمی رنگت پر جوش کی سرخی لیے اس کے
آئی تھی۔ چال میں تیزی اور بے تابی تھی۔

''کیا ہو گیا ہے۔ کیا پھر کوئی خناس سما گیا تیری کھوپڑی میں۔'' رمضو نے بظاہر بیزار
دکھائی سے پلٹ کر اسے مخاطب کیا تھا مگر اس کی نظریں بھی خیراں کے لشکتے ہوئے شاداب
پر جم کر رہ گئی تھیں۔

''اب کیا دکھائی بھی نہیں دے رہا تجھے؟'' خیراں اس کے پٹ پٹ آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے پر چڑ

''تو سامنے آتی ہے تو اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ ہر شے تیرے سامنے پس منظر میں چلی
ہے۔'' رمضو کے دھیمے لہجے میں کھویا کھویا سا خوشبو بھرا خمار تھا۔

''چل چھڈ۔ جھلا نہ ہو تو.........'' خیراں اُس کی نظر میں چھپی شوق آمیز گرمی محسوس کر
ذرا سا جھینپی۔ ''یہ کپڑے تو بی بی جی نے مجھے دیے تھے۔ وہ ناں' ایک دن پہن کر لان میں
تھیں۔ میں نے دیکھ کر ان کی بہت تعریف کی کہ بڑے پیارے کپڑے پہنے ہیں جی آپ نے۔

جی نے کہا' تمہیں پسند ہیں تو چلو تم لے لو پھر اگلے دن دھلوا کر مجھے دے دیے۔''

''تجھے شرم نہ آئی اپنے ندیدے پن پر۔'' رمضو خفگی سے ٹوک گیا' ''جہاں اچھی چیز دیکھی'
ی رال ٹپکنے لگی۔''

''چل چل...... جھوٹا کہیں کا۔'' خیراں تپ کر بولی' ''میں نے ان سے مانگے تھوڑا تھے۔
نے تو اتنا انکار کیا تھا کہ میں نہیں لوں گی۔ وہ کہنے لگیں' اپنی خوشی سے دے رہی ہوں۔ اگر نہیں
وگی تو مجھے دکھ ہو گا۔''

''اچھا اب زیادہ صفائیاں نہ دے۔'' وہ اُکتا کر بولا۔ ''یہ بتا کس لیے تو نے آسمان پر سر پر
ایا ہوا تھا' '' وہ پانی کا پائپ کیاری میں ڈال کر درخت کے سائے میں بیٹھ گیا تھا۔

''بتا تو دوں مگر تو مانے گا نہیں۔'' وہ بھی رمضو سے کچھ فاصلے پر پھسکڑا مار کر بیٹھ گئی۔

''چل بتا تو سہی۔'' رمضو کو بھی دراصل تجسس گھیرنے لگا تھا۔ خیراں اُس کے قریب کھسک آئی۔

''میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کل۔'' خیراں کا لہجہ غیر محسوس طور پر رازدارانہ ہو گیا تھا۔

''کیا؟'' رمضو کے حواس مکمل طور پر بیدار ہو چکے تھے۔

''مینا گل کو۔'' خیراں نے سرگوشی میں بتایا۔

''مینا گل کو؟'' رمضو' خیراں کو یوں گھورنے لگا' جیسے اُس کے سر پر سینگ نکل آئے ہوں۔

''میں جھوٹ نہیں کہہ رہی رمضو۔'' وہ جلدی سے صفائی میں بول پڑی۔ ''چاہے تو کسی بہانے
ے شادو رانی سے بھی تصدیق کرا لینا۔ مینا گل بی بی جی کوٹھی میں آئی تھی۔ آپا اماں بھی اُس سے ملی
یں مگر وہ جلدی ہی لوٹ گئی تھی۔ سنا ہے بی بی جی نے اسے گھر میں بٹھانے سے منع کر دیا تھا۔
ید بی بی جی اسے پسند نہیں کرتیں۔'' خیراں کی سنجیدہ اور متفکر صورت دیکھ کر رمضو لامحالہ یقین
رنے پر مجبور ہو گیا۔

''مگر اس کا بی بی جی سے کیا میل؟'' وہ اُلجھ سا گیا۔

''شادو رانی نے باتوں باتوں میں ہلکا سا بتایا تھا کہ مینا گل' آپا اماں کے جاننے والوں میں
ے ہیں۔ ہو سکتا ہے' ان کی کوئی پرانی سہیلی ہوں۔'' رمضو کے یقین کر لینے پر خیراں کو دلی خوشی ہوئی
ی۔ اب وہ نسبتاً زیادہ اعتماد سے جواب دے رہی تھی۔

''آپا اماں کی سہیلی! گھاس تو نہیں کھا گئی تو۔ کہاں آپا اماں جیسی سیدھی سادی گھریلو عورت اور
کہاں وہ چلتر باز' چالاک اور بے شرم ہیروئن۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' وہ پھر سے اُکھڑنے لگا۔

"دوستی کے لیے مزاج اور کام کا ایک ہونا ضروری نہیں ہوتا۔" خیراں نے جھنجلا
عالم میں فلسفہ جھاڑا۔

"اچھا بابا۔ اب بحث کر کے میرا دماغ نہ چاٹ کوئی اور بات کر۔"

"او......رمجو......" "چلو تم کو میڈم بلاتا ہے۔ خیراں تم بھی آ جاؤ۔" گل خان اچا
وارد ہوا تھا۔

وہ دونوں اُٹھ کھڑے ہوئے اور ادارے کے مرکزی آفس میں آ گئے۔ مشعل لا
کھلنے والی کھڑکی کے سامنے کھڑی باہر جھانک رہی تھی۔

"آؤ بھئی۔" آہٹ پر وہ واپس پلٹی اور اپنی کرسی پر براجمان ہو گئی۔

"رمضو' تم یہ کار کی چابی لو اور گھر جاؤ۔ دلشاد کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ اسے ڈاک
کے کلینک لے جانا' ساتھ میں ماسی برکتے کو لے لینا۔" پھر اچانک اُس نے کچھ سوچ کر خی
طرف دیکھا۔ "ایسا کرو خیراں' تم بھی رمضو کے ساتھ چلی جاؤ۔"

"جی بی بی جی۔" خیراں کی جیسے دلی مراد بر آئی تھی۔ دونوں سلام کر کے کمرے سے نکلنے

"رمضو' کتنا مزہ آئے گا۔ گاڑی پہ بیٹھ کے سیر کریں گے۔" خیراں کے لہجے میں
خوشیوں کی جھانجھن بج رہی تھی۔

"تو تو ہے ہی سدا کی لالچن۔" رمضو نے بُرا سا منہ بنا کر خفگی سے اسے دیکھا۔ "کیا
کبھی نہیں دیکھی۔"

"تیرے ساتھ تو پہلی دفعہ بیٹھوں گی ناں۔" خیراں کے لہجے میں رچا ہوا معصومانہ
اپنائیت رمضو کی ساری خفگی بہا لے گیا۔

"دونوں آپس میں مگن باہر گیٹ کی طرف جا رہے تھے۔ اس بات سے انجان کہ
ساعتیں ان کے سادہ و معصوم چاہت و اپنائیت کے بے ساختہ اظہار کو جذب کر رہی ہیں۔
بڑی دیر سے کھڑکی میں کھڑی دونوں کو درخت کے نیچے بیٹھے لڑتے جھگڑتے اور باتیں کر
رہی تھی۔ اسے نہ جانے کیا کچھ یاد آنے لگا تھا۔ سختی سے مقفل یادوں کے بوسیدہ مکان م
جیسے کوئی دریچہ سا کھلا تھا۔

وہ بھی تو ایسا ہی تھی۔

سادہ مخلص اور پُر جوش۔

جی بھر کر ستاتا' خفا کرتا اور پھر اتنی ہی شدتوں سے منا بھی لیتا تھا۔

اُسے رُوٹھنے ہی کہاں دیتا تھا۔ بات بات پر شعروں کی پٹاری کھول کر بیٹھ جاتا۔ خصوصاً اس
خفا ہونے پر خوب شاعری سے شغل فرماتا' اکثر یہ شعر سنا کر اسے ہنسنے پر مجبور کر دیتا۔

غصے میں جو نکھرا ہے' اس حسن کا کیا کہنا
کچھ دیر ابھی مجھ سے تم یونہی خفا رہنا

اس کے تنگ آ جانے پر بڑی شرارت بھری معصومیت سے یہ شعر پڑھتا۔

ہر آن ایک تازہ شکایت ہے آپ کو
واللہ مجھ سے کتنی محبت ہے آپ کو

اور کتنا باتونی تھا۔ بولتا تو پھر بولتا ہی چلا جاتا۔ شرارت تو جیسے اُس کی رگ رگ میں بھری
تھی۔ نچلا بیٹھنا آتا ہی نہ تھا۔ انداز میں بچوں کی سی معصومیت ہوتی تھی۔ ہر ساعت سرگرم عمل'
م اور پُر اعتماد نظر آتا تھا۔

"یہ تو تمہارے سامنے آ کر بچہ بن جاتا ہوں' ورنہ جناب' ہم بھی آدمی ہیں کام کے۔" اس
گفتگو بڑی شگفتہ اور نفیس ہوتی تھی۔ اپنے جذبات کے اظہار کے لیے کبھی بازاری' عامیانہ اور
اسب لب و لہجے سے کام نہیں لیا تھا۔ شرارت اپنی جگہ مگر وہ اُس کا بڑا احترام کرتا تھا۔ ہمیشہ
گی' سادگی اور شگفتگی کے دائرے میں رہ کر بات کرتا تھا۔

"مگر اب سب کچھ بدل گیا ہے۔" وہ گہری سانس لے کر حال میں لوٹ آئی اور کرسی کی
سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔

کہانیاں اب بدل گئی ہیں
نہ اب وہ آنکھیں ہیں
جن میں خوابوں کے سارے موسم
گلاب موسم بنے ہوئے ہیں
نہ اب وہ شامیں ہیں
جن میں تیری حسین باتیں
رفیق لگتی تھیں ذہن و دل کو
وہ سارا منظر بدل گیا ہے
نہ وصل کا کوئی خواب باقی

نہ اب وہ حرفِ سخن رہا ہے
کہانیاں اب بدل گئی ہیں
تمہارے جانے کے بعد یوں بھی
جو خواب آنکھوں میں چاہتوں کا یقین بن کر ٹھہر گئے تھے
وہ خواب سارے بکھر گئے ہیں
ملال دل میں اُتر گئے ہیں
نہ زندگی ہے نہ زندگی میں وصال موسم کی چاہ کوئی
نہ شاعری ہے نہ شاعری میں جو دکھ ہے اس سے پناہ کوئی
جو سچ تھا اب جھوٹ ہو گیا ہے
جو دن میں سورج بنا ہوا تھا
وہ شب کی تاریک وادیوں میں اُتر گیا ہے
کہانیاں اب بدل گئی ہیں۔

☆☆☆

"جی فرمائیے' آپ کو کس سے ملنا ہے؟" دلشاد سوالیہ نظروں سے ادارے کا گ
کے اندر آنے والے شخص کو دیکھ رہی تھی۔

"مس مشعل سے۔" آنے والے کا لہجہ اُس کی شخصیت کی بردباری' وقار اور تمکن
کر رہا تھا۔ وہ ہلکے نیلے شلوار کرتے میں ملبوس تھا۔ پاؤں میں پشاوری چپل تھی۔ ا
آنکھوں میں ذہانت اور تدبر کی چمک تھی۔ چہرے پر گہری سنجیدگی' تکلف اور کسی قدر
کے تاثرات نمایاں تھے جو مقابل کی کم گوئی' خشک مزاجی اور دوٹوک انداز کی پیش گو
تھے۔ اس کا انداز بے نیازی اور شانِ استغنائی یہ ظاہر کرتے تھے کہ اسے خود پر بہت اعتما

"آپ کا تعارف؟"

"ہارون احمد۔ میرا تعلق پریس سے ہے۔" اُس نے مشینی انداز میں کارڈ ہاتھ

"مجھے مینا گل کے بارے میں اُن سے کچھ معلومات درکار ہیں۔ آپ انہیں باہر بلواد
خود آفس میں جاؤں!"

"جی ایک منٹ۔ میں بات کرتی ہوں۔" موصوف کے تیور دیکھ کر وہ قدر۔

ے انداز میں اندر کی سمت بڑھی تھی۔

"مشعل باجی۔ باہر کوئی صاحب آئے ہیں' آپ سے ملنے۔" اُس نے کارڈ اس کی ٹیبل پر
دیا۔

مشعل نے کارڈ پر سرسری نظر دوڑائی پھر اُس کی پیشانی پر ناگواری کی لکیریں بچھنے لگیں۔
سے کہہ دو بی بی آفس میں نہیں ہیں۔"

مشعل کے جواب پر وہ ہکا بکا رہ گئی۔ "مم...... مگر میں تو انہیں بتا چکی ہوں کہ میں اندر آپ
بات کر کے آتی ہوں۔" دلشاد اُفتاں وخیزاں اس کی شکل دیکھنے لگی۔

"یہ کیا حماقت کی۔ اچھا اُن سے کہہ دو' بی بی فارغ نہیں ہیں۔"

"مجھے بھی آپ کے پیچھے خوار ہونے کا قطعی شوق نہیں ہے۔ محترمہ' میں اپنے فرض کے
ں مجبور ہو کر یہاں تک آیا ہوں۔" اسی لمحے وہ کھلے دروازے سے اندر داخل ہو چکا تھا۔ اس کا
پتھریلا اور بے مہر تھا۔ مشعل نے ایک نظر اُسے دیکھ کر رخ موڑ لیا تھا۔ "دو دن پہلے اداکارہ مینا گل
پ کی کوٹھی سے نکلتے دیکھی گئی ہیں۔ وہ کس سلسلے میں تشریف لائی تھیں اور آپ کی کیا لگتی ہیں؟
اس بات کی وضاحت درکار ہے۔" وہ برہم اور جارحانہ تیور لیے کہہ رہا تھا۔ انداز قطعی اور اٹل تھا۔

"یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔" وہ ناگواری سے ہونٹ چبانے لگی۔

"جب معاملے کے اثرات ملک وقوم کی سلامتی تک جا پہنچیں تو پھر فردِ واحد کی ذاتیات کی
ہ اہمیت نہیں رہتی۔ آپ کے ہاں اُن کا آنا جانا کب شروع ہوا؟" وہ مشعل کی ناگواری خاطر
نہ لاتے ہوئے دوٹوک بولا۔

"وہ جی...... وہ آپا اماں کی پرانی سہیلی ہیں۔ اُنہی سے ملنے آتی تھیں۔ مشعل باجی کی اُن
کوئی دوستی نہیں ہے۔" دلشاد سے رہا نہ گیا تو فوراً بیچ میں بول پڑی۔

ہارون نے تیز نظروں سے چودہ پندرہ سالہ نوخیز سی دبلی پتلی لڑکی کا گھبرایا ہوا پُرکشش چہرہ ٹٹولا۔
دلشاد کے اوسان خطا ہونے لگے۔ مقابل کا انداز ہی کچھ ایسا تھا' جیسے وہ اُن سے پوچھ گچھ کا
ل استحقاق رکھتا ہو یا جیسے وہ جواب دینے کی ہر صورت پابند ہوں۔

"محترمہ' میں آپ سے ہی مخاطب ہوں۔" مشعل کے رسپانس نہ دینے پر وہ سخت بھنائے
ے طنزیہ انداز میں مخاطب ہوا تھا۔

"جو یہ بچی آپ کو بتا چکی ہے۔ یہی کافی ہے۔ اب آپ تشریف لے جائیں۔" وہ یکلخت

اُس کی طرف پلٹ کر پھٹ پڑی۔

اب دونوں براہ راست ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھ رہے تھے۔ دونوں کی نظ
میں بے گانگی' غیظ و غضب اور سرد مہری تھی۔

"آخر ایسا کیا رشتہ ہے' آپ کا مینا گل سے جسے چھپانا چاہ رہی ہیں؟" اس کا تمسخر
آمیز لہجہ تیر کی طرح مشعل کے سینے میں پیوست ہو گیا۔

اسے یوں لگا جیسے کسی نے بھرے بازار میں عریاں کر دیا ہو۔ "جو بھی ہو۔ آپ کو
ضرورت نہیں۔" وہ خشک لہجے میں گویا ہوئی۔

"میں ایرے غیرے لوگوں کے لیے خود کو تکلیف میں ڈالنے کا شائق نہیں ہوں مح
اُس کا لہجہ مشعل کو توہین آمیز سا لگا۔

"آپ کا کیا تعلق ہے اس اداکارہ سے؟ کس ناتے مجھ سے تفتیش کر رہے ہیں؟" وہ چیخ

"اس اسٹائل میں عموماً بیویاں پوچھ گچھ کیا کرتی ہیں۔ آپ سے میرا ایسا کوئی رشتہ نہ
اس لیے جواب نہیں دے سکتا۔" اُف اُس کا مذاق اُڑاتا' سلگتا ہوا طنزیہ انداز۔

اس کا ضبط جواب دینے لگا۔ "آپ کے حق میں یہی بہتر کہ جلد از جلد یہاں سے تش
لے جائیں۔" وہ پیچ و تاب کھاتے ہوئے سُلگ کر بولی۔

"میرے حق میں کیا اچھا ہے کیا برا' یہ میں آپ سے کہیں زیادہ اچھی طرح جانتا ہوں
برفیلے لہجے میں گویا ہوا۔

دلشاد حیرانی سے کبھی ایک کو دیکھ رہی تھی تو کبھی دوسرے کو۔ آفس گویا میدان جنگ بنا ہوا
معاملہ کیا ہے۔ مشعل باجی کا مینا گل سے کیا رشتہ ہے؟ وہ دل ہی دل میں پریشان ہوئی جا رہی تھی
صاحب کو مینا گل اور باجی کے میل ملاپ پر کیا اعتراض ہے؟ کہیں یہ مینا گل کے شوہر تو نہیں؟
افوہ میں بھی کتنی بے وقوف ہوں۔ فلمی ہیروئنیں اگر شوہر کی علت پالنے لگ جائیں
کے کیریئر کا ہی ستیاناس ہو جائے پھر ہو سکتا ہے' مینا کے چاہنے والے ہوں۔ اس نے تیز
سوچا۔ ان کے عاشق' دیوانے ٹائپ چیز ہوں۔ مینا سے محبت کرتے ہوں۔

کچھ تو تھا مگر کیا تھا؟

♥♥♥

"مینا گل میرے گھر کیوں اور کس رشتے کی بنا پر آئی تھیں' بہتر ہو گا" اس کا جواب مینا گل
سے دریافت کریں۔ میرا بہرحال اُن سے یا اُن کی دلچسپیوں سے کوئی واسطہ نہیں ہے اور براہ
م آئندہ یہاں تشریف لانے کی زحمت نہ کریں۔" وہ سرد و سپاٹ اور حتمی انداز میں کہہ کر
ے سے باہر نکلنے کے لیے قدم بڑھانے لگی۔ "دلشاد' یہ صاحب چلے جائیں تو دروازہ لاک کر
"

یہ ادا اس بات کی علامت تھی کہ ٹھیک ہے' تم نہیں جاتے تو پھر میں ہی یہاں سے پھوٹ لیتی
۔

ہارون نادان نہیں تھا۔ بات سمجھ کر اس سے پیشتر ہی ہوا کے جھونکے کی طرح تیزی سے
رے سے باہر نکل گیا تھا۔

مشعل تھکے تھکے قدموں سے واپس سیٹ پر آ گئی......

"باجی' یہ شخص کون تھا؟" دلشاد الجھی ہوئی استفہامیہ نظروں سے اُسے دیکھنے لگی...... وہ ڈری
اور ہراساں تھی۔

"میرا ماضی......" اُس نے بالوں میں انگلیاں پھنسا کر سر ہاتھوں میں تھام لیا اور میز پر
گئی۔ "ایک اذیت ناک حوالہ' ایک تکلیف دہ یاد' میرے دل کا ناسور۔" وہ ٹھنڈی سانس لے
یدہ سی ہو گئی تھی۔

دلشاد نے دیکھا' اس کی سنہری آنکھوں کے پُرسکون آئینے دھندلا رہے تھے۔ ان میں پانی
ہو رہا تھا۔ ہونٹوں کے گوشوں پر مضطربانہ کپکپاہٹ رقصاں تھی۔

دلشاد استعجابیہ نظروں سے دیکھتی رہ گئی۔

میڈم مینا گل۔

پریس رپورٹر ہارون احمد

اور باجی مشعل

تعلق کی اس تکون میں کیا قدر مشترک ہے۔

تینوں سرے کس حقیقت سے جا ملتے ہیں؟

ان کا آپس میں کیا رشتہ ہے؟

دلشاد چاہنے کے باوجود براہ راست مشعل سے پوچھنے کی ہمت نہ کر سکی تھی۔

☆☆☆

وہ ابھی ابھی ایک وڈیرے کے ہاں سے مجرا کر کے لوٹی تھی۔ جسم کا انگ انگ د
تھا۔ بہت تھکی ہوئی تھی۔

"عذرا' باتھ کے لیے چیزیں سیٹ کرو فوراً۔" آتے ہی اس نے ڈریسنگ روم جا
کے سامنے کھڑی ہو کر جیولری اُتارنا شروع کر دی۔

"اُف توبہ' یہ وڈیرے کتنے وحشی اور جنگلی ہوتے ہیں؟"

بے ترتیب جوڑے کی پنیں اتار کر وہ ایک ہاتھ سے اپنا بازو دباتے ہوئے کوفت
میں سوچ رہی تھی۔ ایک ایک عضو میں تکلیف کی لہریں اُٹھ رہی تھیں۔ "عورت پر یوں ٹو
جیسے بھیڑیے اپنے شکار پر جھپٹتے ہیں اور بوٹی بوٹی نوچ ڈالتے ہیں۔"

وہ جھرجھری لے کر رہ گئی۔

عذرا نے باتھ ٹب میں نیم گرم پانی بھر دیا تھا۔ وہ رقص کا مختصر سا لباس تبدیل کر
ہلکے باتھ گاؤن میں ملبوس باہر آئی اور سیدھی باتھ روم کی طرف بڑھ گئی۔ کتنی ہی دیر نیم گرم
مل مل کر بدن دھوتی رہی۔ اتنی تھکاوٹ کے بعد یہ خوش گوار پھوار بڑا سکون بخش رہی تھی۔

"آج آپ کہاں تھیں میڈم؟ میں صبح سے آپ کو ٹریس کر رہا تھا۔ موبائل فون بنا
صاحب کے ساتھ آپ کی شوٹنگ تھی۔ اُنہیں دو بجے کا ٹائم دیا ہوا تھا۔" وہ نائٹ گاؤن کی
کستی ہوئی باہر آئی تو اُس کا گنجا سیکرٹری مودبانہ انداز میں اس کے کمرے میں کھڑا اس کا

"اوہ مجھے بتانا یاد نہیں رہا۔" مینا نے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے سر کو دو انگلیوں سے خفیف سا

"میڈم نے مجھے اسلام آباد طلب کیا تھا' صبح صبح۔ اس لیے ایمرجنسی فلائٹ پکڑ کر روانہ ہ
صاحب تو خاصے ناخوش ہوں گے؟" مینا نے کچھ سوچتی ہوئی نظروں سے سیکرٹری کو دیکھا۔

"ظاہر ہے' میڈم۔ اس سیٹ کی تیاری کے لیے اُنہوں نے دو لاکھ کا خرچہ کیا تھا۔ میڈم بانو
نے کس سلسلے میں بلایا تھا؟"

"وہی تنویر جمال والا کیس تھا۔" مینا بے نیازی سے کندھے اُچکا کر ناخن فائل کرنے لگی۔

"میڈم نے لنچ کے لیے 'ہالی ڈے ان' میں ملاقات کا ٹائم سیٹ کیا تھا!"

میڈم بانو کے "ضروری سلسلے" کی نوعیت جان کر وہ مطمئن ہو کر سر ہلانے لگا کہ وہ بھی اس
کام میں پوری طرح ملوث تھا۔ سب جانتا تھا بلکہ "شکار" کی تلاش کے لیے میڈم بانو اکثر اُسے
ڈیوٹی سونپا کرتی تھیں۔ جوان اور حسین لڑکیوں کو ٹریپ کر کے اڈے تک پہنچانے کے لیے اُن کا
گروہ بڑے منظم طریقے سے کام کر رہا تھا۔ میڈم نے جگہ جگہ ہر بڑے شہر میں اپنے آدمی پھیلائے
ہوئے تھے جو موقع دیکھ کر ہوشیاری سے لڑکی کو ورغلا کر ٹھکانے پر لے آتے تھے۔ اہم جگہوں میں
تفریحی پارک' معروف کیفے' ہوٹل' بازار اور دیگر اہم پبلک پلیس شامل تھیں۔ اس کے علاوہ بعض
اوقات خواتین کے لیے رفاہی اداروں اور پناہ گاہوں کی سربراہ خواتین سے ساز باز کر کے کچھ پیسے
دے کر میڈم بانو اپنے مطلب کا "مال" چھانٹ کر لیتی تھیں۔

"میں نے شیخ صاحب کو اب کل دس بجے کا ٹائم دے دیا ہے۔ آپ کو دوبارہ تو اسلام آباد
نہیں جانا؟"

"نہیں۔ کم از کم صبح تو نہیں۔ میڈم بانو نے مجھے ایک اور کام بھی سونپا ہے۔" وہ فائلز رکھ کر
اُس کی سمت دیکھنے لگی۔

"کون سا کام؟"

"وہ بتا رہی تھیں' یہاں کے اڈے پر کل کراچی سے "نیا مال" پہنچا ہے۔" اُس کا لہجہ معنی خیز
تھا "چونکہ وہ مجھے اپنی نائب تصور کرتی ہیں اس لیے انہوں نے مجھے اڈے کا چکر لگا کر "دانے" کو
پرکھنے اور اُس کی دیکھ ریکھ کی ہدایت کی ہے۔"

یہاں لاہور کی ہیرا منڈی میں میڈم بانو کا کوٹھا عرفِ عام میں اڈہ سب سے زیادہ مقبول تھا
اور زبردست بزنس کر رہا تھا۔ مینا نے بھی یہاں بہت عرصہ گزارا تھا۔ فلموں میں آمد سے پہلے یہیں
تربیت حاصل کی تھی۔ نئی لڑکیوں کو ایڈجسٹ کرنے میں وہ میڈم بانو کی خاصی مدد کرتی تھی کہ وہ ہر
گر سے واقف تھی۔

"میں چلتا ہوں۔"

سیکرٹری کے جانے کے بعد اُس نے عذرا کو اندر بلایا۔ ذرا ریک سے میری تازہ
سپرہٹ فلم ''شعلہ بدن'' کی کیسٹ نکال کر وڈیو پر لگانا۔ وہ مسہری پر نیم دراز ہو کر بولی۔
عذرا فلم لگا کر دروازہ بند کر کے چلی گئی۔ ریموٹ کنٹرول مینا کو تھما گئی تھی۔
وہ انہماک سے اپنی فلم دیکھنے لگی۔ اس کے تمام مناظر یورپ میں فلمائے گئے ت
موضوع کے مطابق خاصے رنگین اور ہوشربا سین شامل کیے گئے تھے۔ مینا نے اپنی ت
صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ اپنے قیامت خیز جسمانی زاویوں کی بھرپور نمائش میں بھی ہر حد پا
تھی۔ پتھر کے کلیجے کو پانی کر ڈالنے والے ایسے ایسے کلوز پوز تھے کہ دیکھنے والا ہیجان کی شدت
پاگل ہو اُٹھتا۔
اس فلم میں ایک نیا ہیرو ارباب آزمائش کے طور پر سامنے لایا گیا تھا۔ ارباب کی خوش
کہ پہلی ہی فلم سپرہٹ ثابت ہو گئی تھی۔ عوام نے مینا اور ارباب کی دلکش جوڑی کی بڑا پسند کیا
مینا ایک سین اسٹل کر کے بغور اسکرین کی سمت دیکھنے لگی۔ پوری اسکرین پر ارباب
مسکراتا شوخ وجیہہ خوبرو چہرہ نمایاں تھا۔
اس نئے لڑکے کے ساتھ شوٹ کرتے ہوئے اُسے بڑا لطف آیا تھا۔
ارباب کی شکل وصورت اور عادات چاکلیٹی ہیرو کا تصور اُبھارتی تھیں۔ مینا اپنے تجر
بدولت جانتی تھی کہ یہ لڑکا اپنی شخصیت کی کشش اور فنی صلاحیتوں کے سبب بہت جلد سپر اسٹا
شمار ہونے لگے گا اور ہیروئنیں اس کے دو گھڑی کے قرب کے لیے فلم ڈائریکٹرز سے اُ
مقابل ہیرو بنانے کے لیے جھگڑا کریں گی۔
ابھی تو وہ جونیئر ہونے کی وجہ سے مینا کا بے دام غلام بنا دیوانوں کی طرح پیچھے پیچھے
تھا۔ اس کی نشیلی اداؤں پر دل تھام کے رہ جاتا تھا۔ اس کے اشارۂ ابرو کا منتظر رہتا تھا۔
جاتے ہیں، جب پر پُرزے نکالنے کے بعد پھر سے اُڑ جائے گا کہ یہی فلم انڈسٹری کی ریت
جونیئرز سینئرز کے کندھوں پر پاؤں رکھ کر آگے نکلتے چلے جاتے ہیں۔
عمروں کے نمایاں فرق کے باوجود مینا اس نوجوان کے لیے اپنے دل میں کشش مح
رہی تھی۔ اس کا دل ارباب کے مضبوط فولادی بازوؤں میں سمٹ کر اُس کے پُرجوش والہانہ ج
کی پھوار میں بھیگتے ہوئے مدہوش ہو جانے کی خواہش کر رہا تھا۔
''کمال ہے۔ روز نت نئے مردوں کے قرب سے آشنا ہوتی ہوں، کبھی دل کی یہ کیفیہ

ئی۔ بس معمول کے سے انداز میں دی ہوئی نوٹوں کی گڈی کی قیمت چکا کر لوٹ آتی ہوں۔ آج
ا انوکھے انداز میں دھڑک رہا ہے۔ اسی طرح جیسے برسوں پہلے ایک مرتبہ دھڑکا تھا۔''
وہ بے اختیار دل پہ ہاتھ رکھ کر بستر سے اُٹھ بیٹھی۔
کچھ دیر بے قراری کے عالم میں اِدھر اُدھر ٹہلتی رہی۔
سوچتی رہی۔
پھر معاً بیڈ کے ساتھ سائیڈ ٹیبل پر پڑے فون کے پاس آئی اور پاس رکھے ہینڈ بیگ سے
ری نکال کر کوئی نمبر ڈھونڈنے لگی۔
''ہیلو۔'' رابطہ ملنے پر اُدھر سے ارباب کی سوئی ہوئی خواب ناک بوجھل آواز کانوں میں
گھولنے لگی۔
مینا اُس کی آواز کے زیر و بم میں اپنا دل ڈوبتا محسوس کرنے لگی۔ ''میں مینا بات کر رہی
ں۔''
''او...... مینا جی۔ زہے نصیب۔'' ارباب اُس کی آواز سن کر پھڑک اُٹھا تھا۔
اُس کے انداز پذیرائی نے مینا کو عجب طرح کی مسرت بخشی۔
''کیسے یاد کیا اس خادم کو؟'' انگ انگ سے مسرت آمیز شرارت ٹپک رہی تھی۔
''بس ایسے ہی۔'' وہ فوری طور پر کچھ نہ کہہ سکی۔ ''تمہاری کیا مصروفیات ہیں آج کل؟''
''آپ کی نظر کرم کے منتظر بیٹھے ہیں ملکہ عالیہ!'' ارباب کے لب و لہجے کی شوخ جسارت مینا
کے گالوں پر پھول کھلانے لگی۔
''اچھا سنو۔'' اچانک مینا کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ ''بشیر صاحب کوئی نئی فلم بنا رہے
ں۔ مجھے پہلے سے ہیروئن کے لیے بک کر لیا ہے۔ میں اُن سے تمہارے لیے سفارش کروں گی
کہ وہ تمہیں بطور ہیرو سائن کر لیں۔ ویسے بھی ''شعلہ بدن'' میں تمہاری کارکردگی سب کے سامنے
چکی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اُنہیں کوئی تامل نہیں ہوگا۔''
ارباب کے دل کی کلی کھل گئی۔
''بھلا آپ کے کہنے پر کس کافر کو تامل ہو سکتا ہے۔'' وہ ویسے بھی کسی اچھی آفر کا منتظر تھا۔
شیر صاحب جیسے بڑے ڈائریکٹر مینا گل جیسی مشہور و معروف ہیروئن کے ساتھ کام کر کے وہ راتوں
رات شہرت و دولت حاصل کر سکتا تھا۔

"کیا آپ کل کوئی ٹائم دے سکتی ہیں اپنے اس پروانے کو؟" میں اُسے خوش کرنے کے لیے بڑے سلیقے سے عشق و عاشقی جھاڑ رہا تھا۔

"نہیں بھئی۔ بڑا ٹائٹ شیڈول ہے۔ ایسا کرو کل رات مجھے کال کر کے کنفرم کر لینا پرسوں کوئی گنجائش ہوئی تو میں بتا دوں گی۔" وہ بادل نخواستہ بولی۔ جی تو یہی چاہ رہا تھا کہ مصروفیات بھلا کر اس کے سنگ ہو لے۔

"بسرو چشم۔ اپنا تو رُواں رُواں آپ کی دید کو ترس رہا ہے۔ آپ موقع تو عنایت کیجیے" ارباب والہانہ پن سے بولا۔ وہ سُریلے انداز میں ہنس دی۔

دو چار باتوں کے بعد جب اس نے ریسور رکھا تو بڑی مطمئن تھی۔ خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔

عورت جب ادھیڑ عمری کو چھونے لگتی ہے تو کم عمر اور نوجوان لڑکوں کی توجہ اور تحسین ا مغرور بنا دیتی ہے۔

"بھلے سے تھوڑی دیر کے لیے سہی۔ میں پرسوں اس کے لیے ضرور ٹائم نکالوں گی۔" دل دل میں مصمم ارادہ کر لیا تھا۔

"یوں بھی جب فلم کی شوٹنگ کے سلسلے میں مشترکہ کام کریں گے تو درمیان میں ہزار ہوں گے۔ تنہائی کی ملاقاتوں کے۔ کسی بہانے سیٹ سے تھوڑی دیر کے لیے غائب ہو کر انجوا کر سکتے ہیں۔"

وہ ارباب کے سنگ تصور میں ہی ڈوبی جانے کیا کیا سوچنے لگی۔

اس کے دل میں ارمان جاگ رہے تھے۔

تمنائیں مہک رہی تھیں۔

خواہشات کی ڈال آسودگی کے پھولوں سے بھر جانا چاہتی تھی۔

دل میلہ جو یکجائی کے نئے نئے بہانے کھوج رہا تھا۔ جذبات کی دنیا میں ارتعاش پیدا ہو تھا اور وہ تشنگی کے سمندر میں تسکین کی ناؤ کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی تھی۔

☆☆☆

طاہر کل کے لنچ کے متعلق مکمل رپورٹ دے چکا تھا۔ ہارون گہری سوچ میں گم تھا۔

"سمجھ نہیں آتا یہ عورتیں ہیں یا بلائیں۔ پچھلی رات لاہور میں کسی سیٹھ کے بنگلے میں گزا

تھی۔ صبح اسلام آباد آ گئی۔ دوپہر تنویر جمال کے ساتھ لنچ کیا اور رات لاہور کے کسی وڈیرے کے ہاں مجرا کرنے پہنچ گئی۔" وہ کنپٹی کے پاس انگلی سے دباؤ ڈالتا ہوا اُلجھے ہوئے انداز میں کہہ رہا تھا۔

"اور وہ میڈم بانو وہ تو جیسے چھلاوا ہے۔ ہر بڑے شہر میں اُس نے عیاشی کے اڈے قائم کر رکھے ہیں۔ لاہور کے بازارِ حسن میں بھی چلتا ہوا کوٹھا ہے۔ یہاں اسلام آباد میں مرکزی اڈہ بنایا ہوا ہے۔ کراچی میں بھی اسی طرح کوٹھیاں خرید کر کال گرلز کا کاروبار چمکا رہی ہے۔ پھرکی کی طرح کبھی لاہور کراچی تو کبھی اسلام آباد گھومتی رہتی ہے۔ ہر اڈے کی کارکردگی پر نظر رکھتی ہے۔ کچھ کو فلمی لائن میں لگا دیا ہے کچھ کو کلبوں میں عریاں ڈانس کروا کے دونوں ہاتھوں سے مال کماتی ہے اور باقیوں کو کوٹھے پر سجا رکھا ہے۔ کتنی مکار اور چالاک عورت ہے یہ۔"

"جی ہاں سر۔" طاہر تائیدی انداز میں گویا ہوا۔ "مسئلہ یہ ہے کہ ان پر کوئی ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔ بڑے بڑے وزیروں مشیروں کو حسن و شباب کا دانہ ڈال کر اپنے قابو میں کیا ہوا ہے۔ پولیس کی باقاعدگی سے بھتہ مل جاتا ہے۔ وہ کیوں کارروائی کرے گی۔" طاہر کے لب و لہجے کی مایوسی محسوس کرتے ہوئے ہارون نے پُرجوش انداز میں اُس کا کندھا دبایا اور بولا۔

"منفی سوچ کو ذہن میں جگہ نہ دو پارٹنر۔ یاد رکھو خدا نے ہر فرعون کے لیے ایک موسیٰ زمین پر اُتارا ہے۔ کبھی نہ کبھی تو ان حرص و ہوس کے متوالوں کا یوم حساب آئے گا۔ ان پر ثبوت کے ہمراہ ہاتھ ڈالنا ناممکن نہیں ہے۔ بس صبر آزما مشکلات کا سامنا اور دوڑ دھوپ کرنا پڑے گی۔ میں اللہ کی ذات سے مایوس نہیں ہوں اور مجھے یقین ہے کہ معاشرے کے ان غلیظ اور بدبودار ناسوروں کو ایک دن ضرور بے نقاب کر کے رہوں گا۔"

"جی سر۔" طاہر اپنے افسر کی جرأت مندانہ باتوں سے یکلخت پُرامید ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں چمک دوڑنے لگی تھی۔

"تم فی الحال یہیں ہوٹل میں اپنے فرائض سرانجام دیتے رہو۔ ہو سکتا ہے مینا گل تنویر جمال سے ملنے کے لیے دوبارہ یہاں آئے۔ اُس کے نام سے ایک سویٹ اس ہوٹل میں ہمیشہ ریزروڈ رہتا ہے۔ قوی اُمید ہے داد عیش دینے کے لیے یہی مقام منتخب کریں گے۔ اس بار جو بھی "ڈیل" ہو اس سے باخبر رہنا بہت ضروری ہے۔" پھر وہ اُٹھ کھڑا ہوا "احتیاطاً تم ایک بندہ میریٹ ہوٹل کے آس پاس بھی نگرانی کے لیے چھوڑ دو۔"

"اوکے سر۔ آپ لاہور کب جا رہے ہیں؟"

"شام کی فلائٹ مل گئی تو آج ہی ورنہ کل علی الصباح۔ مینا گل شوٹنگ کے سلسلے میں ، روز اپنی لاہور والی کوٹھی میں ہی قیام کرے گی۔ اس لیے میرا لاہور میں موجود رہنا لازمی دوسرے گھر والے بھی انتظار میں ہوں گے۔ وہ بلوکسر سے شادی اٹینڈ کرنے کے بعد واپس آ ہیں۔"

"ہارون' طاہر سے سلام دعا کے بعد 'ہالی ڈے ان' سے باہر آ گیا۔ اپنی سفید ایف ایک تلاش میں پارکنگ لاٹ میں نظریں دوڑاتے ہوئے اچانک ہی ہوٹل کی بلند و بالا عمارت کے م حصے میں لگے سفید بینر کی عبارت پر نگاہ پڑی۔

بسرخ روشنائی میں موٹے موٹے حروف میں لکھا ہوا تھا۔

ادارۂ اطفال کے زیراہتمام ایک خصوصی سیمینار۔

مہمان خصوصی وزیر برائے بہبود آبادی

چیف آرگنائزر مس مشعل۔

اوقات۔ دوپہر دو بجے۔

اس کے قدم جم کر رہ گئے۔

اس نے غیر ارادی طور پر گھڑی پر نگاہ ڈالی۔

ساڑھے تین ہو رہے تھے۔

"یقیناً سیمینار ختم ہونے والا ہوگا" اُس نے سوچا۔ "بڑی اور اہم شخصیات مصروفیت سبب زیادہ ٹائم نہیں دے سکتیں۔"

کچھ سوچ کر وہ ہوٹل کے بائیں طرف۔ مرکزی عمارت سے قدرے ہٹ کر بنے ہو ہوٹل کے کیفے میں چلا گیا اور کافی کا آرڈر دے کر شیشے کے پار منتظر نظروں سے دیکھنے لگا۔

مس مشعل۔ دو تین دفعہ اُس کی نظریں بینر پر لکھے نام سے ٹکرا کر واپس آئیں۔

"مشعل۔" اس کے لب بے اختیاری کے عالم میں وا ہوئے۔ وہ دھیمے سے بڑبڑایا۔ ا سر کرسی کی پشت سے ٹک گیا تھا۔

اُس نے محسوس کیا کہ اس نام کو لبوں سے آزاد کرتے ہی ایک عجیب سی کسک دل میں جا لگی تھی۔ مدتوں سے خوابیدہ برف کی سل میں دبے چور جذبے جیسے حرارت پکڑنے کو تھے۔ وہ ا دم سر جھٹک کر سیدھا ہو گیا۔ یادوں کی گلی میں یکلخت ایک بھگدڑ سے مچ گئی تھی۔

بیس منٹ کے صبر آزما انتظار کے بعد وزیر برائے بہبود آبادی اپنے ساتھیوں کے جلو میں مشعل کے ہمراہ باہر آئے۔ چند رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد وہ اپنی ٹیوٹا میں سوار ہو کر روانہ ہو گئے۔ ہارون نے دیکھا۔

مشعل سیاہ چیک کی سفید لائنوں والی قمیض اور بلیک شلوار دوپٹے میں ملبوس تھی۔ اس کے سیاہ گھنے موٹے بالوں کی چوٹی سر پہ لیے دوپٹے کے پلو سے باہر لٹکتی ہوئی صاف نظر آ رہی تھی۔ سنہری خواب ناک آنکھیں سیاہ پلکوں کی باڑھ تلے مزید دلکش لگ رہی تھیں۔ اُجلی چمکدار رنگت دھوپ کے عکس سے گلگوں ہو رہی تھی۔

وہی حسن کی تابانی۔

وہی انداز کی معصومیت و سنجیدگی جو اُس کی دلربائی کو چار چاند لگا دیتی تھی۔

وہی مقناطیسی کشش۔

ہارون کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے کر بھینچ لیا۔

آگہی کا ایک انجانا کرب اُس کے رگ و پے میں یاسیت بن کر دوڑنے لگا۔

انسان اندھیرے میں ہوتا ہے
تب محبت کا دیوتا سورج کی طرح طلوع ہوتا ہے
انسان کو آگہی ہوتی ہے
چاروں طرف روشنی پھیل جاتی ہے
نرم سفید چاندنی جیسی روشنی
آگہی تکلیف دہ ہوتی ہے
چیزوں کو دور سے دیکھنا اچھا لگتا ہے
اور اپنی انتہاؤں میں
جب سارا وجود ایک ہی آگ میں
جل کے راکھ ہو جاتا ہے
پھر اسی راکھ کے ڈھیر سے
یادیں سلگتی رہتی ہیں
ڈھیرے ڈھیرے

محبت ہاتھ چھڑاتی ہے اور پھر سیاہ شبِ غم میں

انسان اندھیرے میں ہوتا ہے۔

وہ کسی غیر مرئی طلسم کے زیر اثر اُس تک پہنچا تھا۔

وہ پے منٹ کرنے کے بعد اب دوبارہ ہوٹل کی سیڑھیاں طے کرتے ہوئے پارکنگ لا
کی طرف آئی تھی۔

جونہی وہ اپنی گرے کرولا کے پاس پہنچی ہارون نے اُسے جالیا۔

میرا نہیں تو دل کا کہا مان جایئے

پہچان پر ہے ناز تو پہچان جایئے

ڈور لاک کھولتی ہوئی وہ ایک جھٹکے سے اُس کی طرف مڑی تھی۔ اُسے دیکھتے ہی اُس کے
چہرے پر ایک اضطراب آمیز کیفیت ڈول گئی۔ آنکھوں میں پریشانی کے عکس نمایاں تھے۔

"جی فرمایئے۔" وہ خود پر قابو پا کر خشک لہجے میں مخاطب ہوئی۔ آبرو چڑھ گئے تھے ا
ماتھے پر ناگواری کی شکنیں دکھائی دینے لگی تھیں۔ وہ خفیف سا مسکرایا۔

کہنے کو بہت کچھ ہے کچھ کہہ بھی نہیں سکتے

مجبور ہیں اُف اللہ، چپ رہ بھی نہیں سکتے

اُس کی شعر و شاعری سن کر مشعل کے دل و دماغ میں دھماکے ہونے لگے تھے۔ خلاف تو
اُسے اُس کی "اوریجنل فارم" میں دیکھ کر وہ سخت ذہنی خلجان کا شکار ہونے لگی تھی۔

"مجھے دیر ہو رہی ہے۔" وہ بے رخی کا مظاہرہ کرتے ہوئے رخ موڑ کر گاڑی کا دروا
کھولنے لگی۔

"اور دیری کے جس عذاب میں دوسروں کو مبتلا کر رکھا ہے، اس بارے میں کیا ارشاد ہے؟"
ہارون کا لہجہ سُلگ اُٹھا۔

"آپ میرا وقت کھوٹا نہ کریں۔ جو کہنا ہے، جلدی سے کہیں۔"

وہ جانتی تھی کہ اُس سے فرار حاصل نہیں کر سکتی۔ ناچار اُسے اُس کی بات سننا پڑی۔

وہ اس کی گاڑی سے ٹیک لگائے گہری نظروں سے اُس کے چہرے کے تاثرات کا جا
لے رہا تھا۔ مشعل اُس کی نظروں کی "کارکردگی" سے خاصی جز بز ہو رہی تھی۔

یہ اواخر ستمبر کی خوش گوار اور لطیف شام تھی۔ سورج کی کرنوں میں نرمی سی اُترنے لگی تھی۔ ہا

ہے تھے۔ اور ڈھلتے ہوئے شاہِ خاور کی دھیمی نارنجی شفق رنگ شعاعیں جسم و جاں کو بڑی دلنواز
عطا کر رہی تھیں۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ جس کے شریر جھونکوں نے مشعل کے سامنے کی
ی منی لٹوں کو چوٹی کی قید سے آزاد کر کے پیشانی پر سجا دیا تھا۔

ایک عجب سا منظر تھا۔

اور دونوں عجیب سی کیفیات میں گھرے ایک دوسرے کے مقابل تھے۔

وقت، لمحے، یہ سماں، سب کچھ ٹھہر سا گیا تھا۔

ماحول پر یک لخت جیسے جمود سا طاری ہو گیا تھا۔

گردشِ زمانہ رک گئی تھی۔

حقائق کی تلخ اور تند چبھن پس منظر میں جا سوئی تھی۔

اگر کچھ باقی رہا تھا تو ایک دوسرے کی موجودگی کا احساس۔ جسے دونوں بنا کہے، بنا بتائے
ں کر رہے تھے۔

ساتھ نکلوں کہ زمانے سے کنارہ کر لوں

گردشِ وقت ٹھہر جاؤ، مجھے سوچنے دو

ساتھ بہتر ہے کہ اب ترکِ تعلق بہتر

اک ذرا دیر ٹھہر جاؤ، مجھے سوچنے دو

ہارون نے بے ساختہ شعر پڑھ کر جیسے اس طلسم کو توڑا تھا۔ مشعل نے چونک کر اُس کی طرف
ا۔

ہارون کی آنکھوں میں وہی نرمی تھی، وہی اپنائیت بھرے رنگ۔

وہی چہرے کی متانت و تمکنت۔

وہی انداز کی نفاست اور شائستگی۔

مگر اب ان آنکھوں میں شوخی کی جگہ سوز و کرب اور شکوے مچل رہے تھے۔

چہرے کی شگفتگی بھی شکستگی اور ملال گھل گیا تھا۔

معصومانہ شرارتی اور بے ساختہ انداز گہری سنجیدگی و افسردگی میں بدل گیا تھا۔

"میں چلتی ہوں۔" اس نے دوبارہ کہا مگر اب کے انداز میں رکھائی کے بجائے گریز و
ب نمایاں تھا۔

"ایک منٹ۔" ہارون بھی سر جھٹک کر جیسے حال میں لوٹ آیا۔ "اگر تمہارا مینا گ
قسم کا تعلق ہے۔ یا تم کسی حوالے سے اُس کے قریب ہو تو میں درخواست کرتا ہوں کہ مجھ
مطلع کر دو۔ یقین جانو' یہ معاملہ انتہائی سنگین ہے۔ تمہاری انفارمیشن سے مجھے بہت
ہے۔" ہارون کے انداز میں سابقہ تلخی و تندی اور تحکمانہ پن کے بجائے سنجیدگی اور گزارش
تھے۔

"اگر میرے اختیار میں ہوتا تو میں تمہاری مدد ضرور کرتی۔ ماسوائے "سوری"
کہہ سکتی۔" وہ سپاٹ انداز میں جواب میں گویا ہوئی۔

"مگر یہ بات سو فیصد درست ہے کہ مینا گل کئی بار تمہاری کوٹھی میں آ چکی ہے۔" و
کر بولا۔

"وہ مجھ سے نہیں' آپا اماں سے ملنے آئی تھی۔" وہ نظر چرا گئی۔

"تو پھر اس سلسلے میں مجھے آپا اماں سے بات کرنا پڑے گی۔" ہارون نے استفہ
سے اس کی سمت دیکھا۔

"ہرگز نہیں۔" اس کا لہجہ اٹل ہو گیا۔ "میرے گھر میں کسی مرد کو داخل ہونے کا
ہے اور اس سلسلے میں تو قطعاً نہیں۔" اُس کے لہجے کا حتمی پن محسوس کر کے ہارون بھی
اُکھڑنے لگا۔

"میں چاہوں تو اپنے آدمی کے ذریعے تمہارے گھر کی خفیہ نگرانی بلکہ خفیہ تلاشی۔
حاصل کر سکتا ہوں مگر مجھے اُس رشتے کا پاس ہے جو کبھی میرا تم سے تھا۔" اُس کے
کروٹ لے رہی تھی۔

"کوئی رشتہ نہیں تھا میرا تمہارا۔" وہ سرد انداز میں کہہ کر گاڑی میں بیٹھ گئی "اور نہ
ہے۔" جملہ مکمل کرنے کے بعد مشعل نے گاڑی اسٹارٹ کر دی تھی۔

ہارون کچھ دیر تک ہونٹ بھینچے اس کے برہم برہم تیور ملاحظہ کرتا رہا۔

اخلاص و وفا کے سجدوں کی جس در پہ داد نہیں ملتی۔
اے عزم خودی' اے غیرت دل اس در پر سجدہ کیا کرنا۔

"مجھے بھی اب رشتہ جوڑنے کا شوق نہیں ہے۔ یک طرفہ طور پر انسان کب تک اور
چل سکتا ہے۔ بالآخر تھک کر راستہ بدل لیتا ہے پھر میرے تمہارے راستے تو شروع

ہیں۔"
وہ چبھتے ہوئے کاٹ دار لہجے میں کہہ کر کچھ شکایتی سی نظروں سے اُسے دیکھتا ہوا پیچھے ہٹ
گیا۔

وہ گاڑی بیک کرتے ہوئے لمحوں میں ہوا ہو گئی۔

ہارون بے خیالی میں وہیں کھڑا اُس کی گاڑی کے ہیولے کو دور ہوتے دیکھتا رہا۔

غضب ہے جستجوئے دل کا یہ انجام ہو جائے
کہ منزل دور ہو اور راستے میں شام ہو جائے

مگر وہ کب جانتا تھا کہ جو اتنے زعم اور بے نیازی سے گاڑی نکال کر یوں چلی گئی ہے۔ اس
الوں پر ڈرائیونگ کے درمیان مسلسل آنسوؤں کی لڑیاں ٹوٹتی بنتی رہیں گی۔
وہ گھر جا کر بستر پر لیٹ کر تکیے میں منہ چھپا کر تڑپ تڑپ کر روئے گی۔
ایک ایک سانس میں سو سو بار اُسے یاد کرے گی۔ اُس کے لیے مچلے گی۔ اپنے آپ کو اشکوں
ندر میں غرق کر دے گی۔

جیون تلخ حقیقت ہے اور لگتا ہے افسانہ بھی
اک جذبے کی دو تصویریں' شمع بھی پروانہ بھی
جو ہر سوچ سفر میں میری' محو سفر ہے شام و سحر
اپنا اپنا بھی لگتا ہے' بیگانہ بیگانہ بھی

☆☆☆

"کہاں ہوتے ہو بچے تم۔ آنکھیں ترس جاتی ہیں صورت دیکھنے کے لیے۔ یہ اسلام آباد
لوں سے خزانے دفن کر رکھے ہیں جن کی دیکھ بھال کے لیے ہر دوسرے دن دوڑا جاتا ہے۔
ایک ہفتہ نہیں ہوا' ہمیں شادی سے واپس آئے اور تو پھر جانے کو تیار ہے۔ اب جائے گا تو
نے کب واپس پلٹے' ہفتوں تجھے گھر کی یاد نہیں آتی۔" اماں جی حسب معمول خفگی آمیز شکایتی
لہجے میں کہہ رہی تھیں۔

"بس کام کی نوعیت ہی کچھ ایسی ہے اماں جی۔" وہ دھیمے سے مسکرا کر اُن کے پاس آ بیٹھا۔
پ کو پتا ہے' ہم خفیہ والوں کو ایک ایک لمحہ کام کے لیے وقف کرنا پڑتا ہے پھر مشکل کیس میں تو
انے پینے' سونے جاگنے کی فطری ضرورتوں کو بھی پس پشت ڈالنا پڑتا ہے۔ جب ذرا سی فراغت

نصیب ہوئی' دو لقمے زہر مار کر لیے اور مختصری نیند لے لی۔"

"ارے تو بیٹے' چھوڑ دے نا یہ ملازمت۔" اماں جی کے دل میں ہول اُٹھنے لگ
ایسی بے کسی سے تو مزدوروں کی بھی نہیں گزرتی۔ ہر گھڑی جی کو دھڑ کے لگے رہتے ہیں
سیدھے وہم آتے رہتے ہیں۔" پھر اُنہوں نے ناراضگی بھری نظروں سے اُسے دیکھا۔
آف ہو گیا تھا۔ "شادی کے لیے بھی تو نہیں مانتا۔ بیوی بچے ہوں' اپنا گھر ہو تو اتنی بے
رہتی۔ خود ہی پیچھے کا دھیان رہے گا تو واپس بھاگا کرے گا۔ کب دے گا مجھے یہ خوشی۔" ا
افسردگی سے کہا۔ وہ نظریں چرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

"آپ اللہ کا نام لے کر اسما اور حارث کی شادی کے انتظامات کریں۔ خود ہی گھ
لگ جائے گی۔"

دونوں کی منگنی بچپن سے طے تھی۔

"سب پہلے تیرے سر پر سہرا دیکھنے کی تمنا رکھتے ہیں۔ یوں بھی تو گھر میں بڑا ہے
آنگن' میں کھلنے والا پہلا پھول۔ اے بچے' چل تو مجھے کسی دن چپکے سے اُس لڑکی کے
آ۔" وہ یکا یک راز داری کے سے انداز میں اُس کے قریب سرک کر آئیں۔ لہجہ سرّ
لجاحت بھرا تھا۔

"اماں جی۔" ہارون نے سر تھام لیا۔ "آپ میری شادی کو بھول نہیں سکتیں۔" اُ
بس نظروں سے اُنہیں دیکھا۔

"کیسے بھول جاؤں۔" وہ چمک کر خفگی سے بولیں۔ "باؤلا ہوا ہے کیا۔ سیدھی
مجھے اُس سے ملوا دے وگرنہ میں خود ہی تیری بات کسی سے طے کر دوں گی پھر نہ کہنا ہاں'

اُن کا لہجہ تیز اور جارحانہ تھا۔ ہارون کے طوطے اڑ گئے۔

"ایسا غضب نہ کیجئے گا اماں جی۔" اس نے فوراً درخواست دائر کر دی۔

"تو پھر مجھے اُس سے ملواتا کیوں نہیں ہے؟" وہ زچ ہو گئیں۔

"ایسا ممکن نہیں ہے' اماں جی۔" وہ کرب سے ہونٹ کاٹنے لگا۔ نگاہوں سے
رہی تھی۔

"مگر کیوں؟" وہ بھنائیں "کون سے بادشاہ کی بیٹی ہے وہ۔ حد ہو گئی بھئی۔"
گئیں پھر محبت بھرے لہجے میں بولیں۔ "چل اس کی تصویر ہی دکھا دے۔"

"تصویر بھی نہیں ہے میرے پاس۔ وہ آہستگی اور شکستگی سے گویا ہوا۔

غنیمت ہوا جو اسی لمحے فون کی بیل بجنے لگی۔ وہ فوراً اُسے پیشتر اُٹھ گیا۔

"کیوں جھوٹ بولتے ہیں۔ اُس کی تصویر تو آپ کے دل سمیت ہر گلی کوچے میں' ہر بازار
لگی ہوئی ہے۔" کچھ فاصلے پر اوٹ میں بیٹھی چاول چنتی ہوئی افراح تلخی سے دل میں کہہ رہی
وہ تمام گفتگو سن چکی تھی۔ نئے سرے سے دل کی بربادی کا زخم تازہ ہو گیا تھا۔

وہ مجھ کو چھوڑ کے جس آدمی کے پاس گیا
مقابلے کا بھی ہوتا تو صبر آ جاتا

اگر کوئی شریف اور سلجھی ہوئی لڑکی ہوتی تو افراح کو اتنا دکھ نہ ہوتا۔ مینا گل جیسی بازاری
بت کے انتخاب پر اُسے بڑا توہین آمیز احساس ہوتا تھا۔

وہ بے راہ رو حسینہ کسی طور پر اُن کے قابل نہیں تھی۔ ہارون بھائی نے اپنی محبت کے سجدوں
لیے بڑا غلط کعبہ چنا تھا۔

☆☆☆

"نئی دریافت ارباب اور منجھی ہوئی سینئر اداکارہ مینا گل کا زبردست معاشقہ۔ ارباب نے
وج کے لیے مینا کو سیڑھی بنا لیا۔"

ہیڈ لائن کے نیچے تفصیلات درج تھیں۔

"اُن دنوں بشیر علی کی فلم "درخشاں" کی شوٹنگ کے سلسلے میں ایک ہفتے سے یونٹ مری میں
ہرا ہوا ہے۔ اس دوران میں ارباب اور مینا ایک دوسرے کے بہت قریب نظر آئے ہیں۔ ذرائع
ے پتا چلا ہے کہ ارباب نے کئی راتیں ہوٹل میں قیام کے دوران مینا کے کمرے میں بسر کی ہیں۔
لوں میں تعلقات کی اس انتہائی اور قابل اعتراض قربت پر ایک مذہبی جماعت نے شدید احتجاج
یا ہے۔ دونوں شراب کے نشے میں دُھت رنگ رلیاں مناتے دیکھے گئے ہیں۔ مذہبی تنظیم کے
ربراہ نے دونوں پر زنا کا فتویٰ عائد کرتے ہوئے بیان دیا ہے کہ اسلام میں شادی کے بغیر مرد و
ن کا خلوت میں اکٹھے رہنا ناجائز قرار دیا گیا ہے۔"

اس سے آگے مشعل میں پڑھنے کا حوصلہ نہ رہا تھا۔ وہ کھانے کی ٹیبل سے یوں اُٹھی' جیسے
دفان۔ اُس کے کانوں سے گویا دھواں نکل رہا تھا۔

کنپٹیاں سلگ رہی تھیں۔ رگوں سے آتشیں مادہ پھوٹ پڑنے کو تھا۔

آنکھیں آگ برسا رہی تھیں۔

وہ تیز تیز قدموں سے چلتی لاؤنج سے گزری۔

دلشاد انہماک سے ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ اکثر فارغ اوقات میں وہ ٹی وی کے آگے
تھی۔

اتفاق سے اس وقت کسی غیر ملکی چینل پر مینا کی سپرہٹ فلم ''شعلہ بدن'' چل رہی
ملک گیر مقبولیت کے بعد اسے دیگر چینلز نے بھی خریدنے میں دلچسپی ظاہر کی تھی۔

''کیا ہوا باجی؟'' دلشاد اُس کے بھینچے بھینچے ہونٹ اور دل ہلا دینے والے خوفناک
اُچھل کر کھڑی ہو گئی تھی مگر مشعل اس کی طرف متوجہ نہیں تھی۔

اس کی خونیں نظریں ٹی وی اسکرین پر جمی ہوئی تھیں جہاں نیم عریاں لباس میں
تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ ہیرو اور باب کے بازوؤں میں تھرک رہی تھی۔ گانا فلمایا جا

''اوہ شٹ۔'' دوسرے ہی لمحے پلک جھپکتے میں مشعل نے جنونی انداز میں سائیڈ
کرسٹل کا پیس اُٹھایا اور پوری قوت سے ٹی وی اسکرین پر دے مارا۔

شیشے کی کرچیاں دور دور تک بکھرتی چلی گئی تھیں۔ وہ ٹی وی توڑ کر اسی دیوانگی میں
گئی تھی اور دلشاد پتھرائی ہوئی کیفیت میں کھڑی رہ گئی تھی۔

اُسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرنا چاہیے۔

وہ کتنی ہی دیر ساکت وصامت کھڑی رہی۔

پھر جیسے ذہن کی کوئی گرہ کھل گئی تھی۔

وہ سرپٹ بھاگتی ہوئی آپا اماں کے کمرے میں چلی گئی۔

جب آپا اماں کے ہمراہ وہ مشعل کے بیڈروم میں آئی تو اسے بیڈ کے بیچوں بیچ
گھٹنوں میں منہ چھپائے دوزانو بیٹھے پایا۔

آپا اماں اسے چوکھٹ پر رُکنے کا اشارہ کر کے خود آہستہ آہستہ بستر کے پاس آ گئیں
''مشعل، میری بچی، کیا بات ہے؟'' اُن کی شفیق مربیانہ آواز پر اُس نے دھیرے
سر اوپر اُٹھایا۔

دلشاد اُس کا چہرہ دیکھ کر دل مسوس کر رہ گئی۔

لال سرخ گالوں پر موتیوں کی لڑیاں ترتیب سے بنتی چلی جا رہی تھیں۔

آنکھوں میں عجیب طوفانی کیفیت تھی۔

کچھ عجب سے تاثرات تھے۔

یوں جیسے کوئی سب کچھ لُٹا کے ہوش کھو بیٹھا ہو۔

سنسان مقبروں کی سی خاموشی اور ویرانی۔

بلا کا دل گرفتہ انداز۔

''آپا اماں۔'' معاً وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر آپا اماں کی گود میں سر رکھتے ہوئے
ل پڑی۔ ''ہم جیسے بے کار اور تہمت زدہ بندوں کو خدا کیوں پیدا کرتا ہے۔ کیوں زندہ چھوڑ
ہے۔ پیدا ہوتے ہی ختم کیوں نہیں کر دیتا۔'' اس کی گریہ زاری دلشاد کو تحیر میں مبتلا کر رہی تھی۔

''بُری بات' چندا ایسا کیوں سوچتی ہو۔ تم تو دوسروں کو ''پڑھایا'' کرتی ہو' انہیں اس گھنا
ن فعل سے روکتی ہو۔'' وہ دھیرے دھیرے اس کی پشت تھپتھپاتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے
کے بالوں کو سہلا رہی تھیں ''اسی مقصد کے تحت تو تم نے ادارہ کھولا ہے۔ ٹھکرائے ہوئے
راث بچوں کی نگہداشت پر سیمینار منعقد کرواتی ہو' لوگوں کو بے نام ونشان بچوں کو قبولنے کے
اُکساتی ہو۔ انہیں احساس ذلت اور محرومی سے بچانے کی باتیں کرتی ہو مگر خود حوصلہ ہار بیٹھی
یہ تو اچھی بات نہیں ہے۔'' آپا اماں کی سحر انگیز مشفقانہ باتیں اُس کے بے چین بلکتے دل کو سہارا
رہی تھیں۔

''میں بھولنا بھی چاہوں تو حقائق کی بھیانک تصویر مجھے پھر اسی کریہہ منظر میں دھکیل دیتی
، بچ کے ناگ میرا وجود ڈسنے لگتے ہیں۔ مجھے بے ہمت اور بے روح بنا دیتے ہیں۔ آپا اماں'
کیا کروں۔ کس طرح اپنے دل کو پتھر بنا کے فطری خواہشات سے دست بردار ہو جاؤں۔'' وہ
نکھیں پونچھتے ہوئے سیدھی ہو گئی۔ لہجہ بھرایا ہوا تھا۔ ''ایک گھر' نام' قریبی رشتے' ماں باپ'
نے والے اور معزز و معتبرین کو دنیا کا سامنا کرنے کی تمنائیں ہزار دبانے کے باوجود سر اُٹھانے
تی ہیں۔ میرا قرار و ضبط' میری شخصیت کی استقامت ملیامیٹ کرنے لگتی ہیں۔ میں بھی دل رکھتی
ں آپا اماں' اپنی بے نشانی کا دکھ کس سے کہوں۔ کس کا گریبان پکڑوں۔ کس سے فریاد کروں۔''
ا کا گلا شدت رنج سے رُندھ گیا تھا۔

دلشاد کا دل پھٹنے لگا۔ کتنی تکلیف میں تھی یہ کامنی سی لڑکی۔

سب کے دکھوں کا مداوا کرنے والی خود کتنی اذیتوں کے حصار میں تھی۔

"حوصلہ کرو میری بچی۔" آپا اماں کی آنکھوں میں پانی اُترنے لگا تھا۔

"نہیں ہوتا حوصلہ آپا اماں۔" وہ بے اختیار ہوگئی۔ اشک مسلسل بہہ رہے تھے "ہر
ہاتھ میں ہوتے ہوئے بھی کچھ مٹھی میں نہیں ٹھہرتا۔ کچھ نہیں ہے میرے پاس۔ حتیٰ کہ اپنے
افتخار بھی نہیں۔ ہر طرف سے تہی دست ہوں۔ میں کیا ہوں۔ فقط سیاہ لمحوں کی کھیتی۔" اُس
بھری پکاریں پتھر کے کلیجوں میں بھی شگاف ڈال دیتیں۔ دلشاد کا نرم اور کم ہمت جی بھر آیا
چوکھٹ چھوڑ کر پرے ہوگئی اور ہاتھوں میں منہ چھپا کر گھٹے گھٹے انداز میں سسکنے لگی۔

یہ میرے گرد
آوازوں میں آنکھیں
اور آنکھوں میں
ادھورے لفظ، لہجے بولتے ہیں
کچھ سنائی بھی نہیں دیتا
دکھائی بھی نہیں دیتا
یہ سب مجھ سے مخاطب ہیں
کہ میں اُن سے مخاطب ہوں
کٹیلی گرد بیٹھے تو سجھائی نہ دے
مگر یہ گرد
یہ تو میرے ہی پیروں سے اُڑ کر
پھیلتی جاتی ہے
اور اندھی ہوا کے آئینے پہ
جمتی جاتی ہے

☆☆☆

وہ پرسوں شام "درخشاں" کے یونٹ کے ہمراہ مری سے واپس لاہور آئی تھی۔ اُس
میڈم بانو نے فون کر کے اُسے تنویر جمال کے سلسلے میں صبح اسلام آباد پہنچنے کی تاکید کی۔
چنانچہ اس وقت وہ اسلام آباد میں "ہالی ڈے ان" میں اپنے سوئیٹ میں تنویر جمال کے
ساغر و مینا سے دل بہلا رہی تھی۔ تنویر جمال کو قابو کرنے کے لیے وہ ہر طرح کے عشوے، غمزے

رہی تھی۔ معاً بیڈ سائیڈ پر پڑے فون کی بیل بجنے لگی۔

مینا نے اُلجھن کے عالم میں سبز فون کی طرف دیکھا۔ اس کے ساتھ انٹرکام علیحدہ سے رکھا
ہوا تھا۔ میڈم بانو نے ہوٹل کی انتظامیہ سے کہہ کر خصوصی طور پر علیحدہ لائن لے لی تھی۔ صرف خاص
الخاص اور اہم ترین شخصیات کو ہوٹل میں یہ سہولت حاصل تھی کہ چاہیں تو پرائیویسی کی خاطر ہوٹل کو
الاٹ کی ہوئی لائنوں میں سے ایک ڈائریکٹ لائن لے لیں چونکہ مینا اُن کی مستقل کرایہ دار تھی اور
پھر میڈم بانو کی بارسوخ شخصیت کے پیش نظر علیحدہ لائن حاصل کرنا مشکل نہیں تھا۔

کون ہوسکتا ہے؟

یقیناً میڈم بانو ہی ہوں گی۔

مینا نے یہ نمبر خفیہ رکھا ہوا تھا۔ کسی کو بھی اُس کے بارے میں علم نہیں تھا۔

"ہیلو۔" اس نے ریسور اُٹھا کر مخاطب کیا۔ اُسے قوی اُمید تھی کہ میڈم ہی ہوسکتی ہیں مگر
دوسری طرف سے کرخت، کھردری مردانہ آواز نے اس کے چھکے چھڑا دیے۔

"فاحشہ عورت۔ تم یقیناً اس وقت بھی کسی یار کی بغل میں گھسی دادِ عیش دے رہی ہوگی کہ یہی
تمہارا دھندا ہے مگر غور سے سن لو۔ تم نے اس لونڈے کے ساتھ مل کر فلم میں جو فحش سین فلمائے ہیں
اور اُس کے ساتھ سرِعام عشق جھاڑ رہی ہو اس کا تمہیں خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔"

"کون ہو تم اور تمہیں یہ نمبر کیسے معلوم ہوا؟" وہ ایک لمحے کو ہکا بکا رہ گئی تھی پھر خود پر قابو پا کر
سختی سے گویا ہوئی۔

کون تھا جو اس حد تک اُس کے متعلق "باخبر" تھا۔ اُس نے دل ہی دل میں کھسیانی سی ہو کر
تنویر جمال کا اپنے گرد لپٹا بازو آہستگی سے ہٹا دیا تھا۔ مخاطب نے انجانے میں بالکل درست تیر
چلایا تھا۔ وہ واقعی تنویر جمال کے بازوؤں میں مقید تھی۔

"میں تمہاری قضا ہوں، بدفطرت عورت۔" مخاطب نے دانت پیسے۔ اُس کے لب و لہجے
سے اندازہ ہوتا تھا کہ تیس پینتیس برس کا ہوگا۔

"سیدھی طرح اپنا کام بتاؤ ورنہ میں پولیس کو بلا کر تمہارے پیچھے لگا دوں گی۔" وہ
پھنکاری۔

"زیادہ بھونکنے کی ضرورت نہیں۔" مخاطب اُس کے غیظ کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اُس
سے زیادہ زور سے دہاڑا۔

"میں ایک مذہبی جماعت کا کارکن ہوں اور ہماری مذہبی جماعت کے امیر نے مجھے تم
موت کا سامان کرنے کا مکمل فریضہ سونپا ہے۔" وہ غرایا۔ لہجے میں خوفناک سرسراہٹ تھی۔

مینا کی ریڑھ کی ہڈی میں خوف کی سرد لہر دوڑ گئی۔

فلم انڈسٹری کے لوگوں کو انتہا پسند مذہبی تنظیموں کی جانب سے اس قسم کی دھمکیا
معمول کی بات تھی۔ فلم "شعلہ بدن" کے بے باک مناظر کو فلمانے کے لیے مینا نے جو نیم ع
ملبوسات اور شہوانی انداز اپنائے تھے اس پر فلم بینوں کے پڑھے لکھے شریف طبقے میں بھی خا
میگوئیاں ہوئی تھیں۔ سنسر کی نرم پالیسی کی تنقید کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ مینا کو لاشعوری طور پر اند
کہ کوئی مذہبی تنظیم اس فلم کی نمائش پر ہنگامہ ضرور کرے گی مگر اتنا جارحانہ اور دہشت طاری کر
والا دھمکی آمیز لہجہ سن کر اس کا پتا پانی ہونے لگا تھا۔ ساری بہادری ہوا ہو گئی تھی کہ وہ تو میڈم
بیک سپورٹ کی وجہ سے مضبوط تھی۔ بذات خود تو وہ کچھ بھی نہیں تھی۔

"اگر تم دوبارہ اس چھوکرے ارباب کے ساتھ نظر آئیں یا اگلی فلم میں بے حیا انداز میں
گر ہوئیں تو تمہیں سالار خان کے ہاتھوں کوئی نہ بچا سکے گا۔"

فون تڑاخ سے رکھ دیا گیا تھا۔

وہ سکتے کے عالم میں کھڑی رہ گئی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے وہ تنویر جمال کے ساتھ نیٹ
پورٹ پی رہی تھی۔ دو پیگ چڑھا لیے تھے مگر اب سارا نشہ جاتا رہا تھا۔

وہ بڑی مشکل سے تنویر جمال کو مطمئن کر سکی تھی۔ زبردستی اپنا موڈ بحال کرنا پڑا تھا۔
جمال کو رخصت کرنے کے بعد وہ سوئیٹ میں قیام کرنے کے بجائے ایف ٹین میں واقع اپنی
پر چلی آئی۔ یہ کوٹھی حال ہی میں مون گروپ آف انڈسٹریز سے ایک گھنٹہ "خوش گوار" ملا
میں تحفے کے طور پر ملی تھی۔ بڑی پر تعیش اور مہنگی رہائش گاہ تھی۔ ایف ٹین کے علاقے میں تو
بھی قیمتیں کروڑوں کے ہندسے کو چھوتی ہیں۔

کتنی ہی دیر مضطربانہ انداز میں ٹہلنے کے بعد اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔

اس نے جھپٹ کر ہارون احمد کا پریس کارڈ نکالا اور نیوز ایجنسی کا نمبر ملانے لگی۔

"جی ایک منٹ۔" ہارون کا نام سن کر فون اٹھانے والا ایک لمحے کے لئے متامل ہوا تھ
کچھ دیر کے جان لیوا انتظار کے بعد اس نے نمبر نوٹ کروا دیا۔

مینا نے جھلاتے ہوئے دوسرا نمبر ملایا۔

"ہیلو۔" ہارون احمد کی آواز سنتے ہی اسے پتنگے لگ گئے۔

"تو تم نے مذہبی جماعت کا بندہ میرے پیچھے لگایا ہے؟" وہ زہر بھرے انداز میں
پھنکاری۔

"آپ کو اتنی شدید غلط فہمی کیسے لاحق ہو گئی مادام؟"

ہارون احمد کی مسکراتی ہوئی چڑاتی ہوئی آواز سن کر اس کو خون کھولنے لگا۔

"بکواس نہیں کرو۔ ہوٹل کے سوئیٹ کا خفیہ نمبر صرف تمہیں معلوم ہے جو تم نے نجانے کیا
کاری دکھا کر معلوم کیا تھا۔ یقیناً تم نے ہی اپنے کسی لگتے کو نمبر دیا ہوگا۔" اس کا بس نہیں چل رہا تھا
کہ اس کی بوٹیاں نوچ لے۔

"کیا کہہ رہی ہیں آپ؟" ہارون سنجیدہ ہو گیا۔ "بھلا مجھے کیا ضرورت ہے کسی جماعت کے
کارکن سے رابطے کی۔" اس کی حیرانی میں سچائی تھی۔ مینا تذبذب میں پڑ گئی۔

"تو کیا تم سالار خان نامی شخص کو نہیں جانتے؟"

"اخبار والے جھوٹے ضرور ہوتے ہیں مگر اب اتنے بھی نہیں۔" وہ ہلکے پھلکے انداز میں گویا
ہوا۔

"تو پھر اسے میرا پرائیوٹ نمبر کیسے معلوم ہوا؟" وہ سوچ میں ڈوبی مخاطب ہوئی۔

"بالکل ایسے ہی جیسے مجھے آپ کی نئی کوٹھی کا نمبر معلوم ہو گیا ہے حالانکہ آپ میرے اصرار
کے باوجود نہیں بتا رہی تھیں۔" اچانک ہی وہ محظوظ ہونے والے انداز میں ہنسا۔

"کیا مطلب؟" وہ بوکھلا اٹھی۔

"یہ جاننے کے لیے اپنی عقل کے گھوڑے دوڑائیے۔" اس نے کھلکھلا کر فون بند کر دیا۔

مینا نے جھنجلا کر زور سے فون پٹخا تھا۔

☆☆☆

"پہلے پہل تو میں بھی حیران رہ گیا تھا کہ آخر اس تنظیم کے کارکن نے یہ خفیہ نمبر کیسے حاصل
کیا پھر ساری بات سمجھ میں آ گئی۔" ہارون طاہر سے بال پوائنٹ لے کر موبائل فون کی اسکرین پر
درج نمبر ڈائری میں نوٹ کر رہا تھا۔

مینا گل پریشانی کے عالم میں بھول گئی تھی کہ موبائل فون کا نمبر ملانے سے آپ کا اپنا نمبر بھی
موبائل کی اسکرین پر نمودار ہو جاتا ہے۔ اس طرح بآسانی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ فون کس نمبر سے

کیا گیا ہے یا کہاں کیا گیا ہے۔"

اور یہی بھول صبح ہارون سے بھی ہو گئی تھی۔ طاہر نے رات اُسے اطلاع دی تھی کہ کل آمد متوقع ہے کیونکہ ہوٹل کی انتظامیہ اُس کا سوئٹ سیٹ کر رہی ہے۔

وہ اگلے روز مسجد میں صبح کی نماز ادا کرنے کے بعد مسجد کے ساتھ بنے سرسبز گراؤنڈ میں قدمی کر رہا تھا۔

اچانک ہی اُس کے ذہن میں آیا کہ فون کر کے مینا کی آمد کے بارے میں کنفرم کر فیصل مسجد میں صبح کی نماز پڑھنے جاتا تھا۔ واپس اپنے فلیٹ میں آئی ایٹ تک پہنچتے پہنچتے گھنٹہ لگ جاتا تھا۔

دراصل اُسے ایک نکتہ سوجھا تھا۔ کیونکہ آج ہی خفیہ طریقے سے مینا گل کے کمر حساس آلات فٹ کر دیے جائیں تاکہ تنویر جمال سے ہونے والی تمام ملاقات کے آڈیو اور نٹس مل جائیں۔ اپنے حساب سے میڈم بانو تنویر جمال پر کافی ٹائم لگا چکی تھیں اور یقیناً آ میں فائنل میٹنگ کے دوران راز اگلوانے کا اصل کام شروع کر دیں گی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ خصوصی آمد کا سبب یہی "ڈیل" ہو۔ وہ بے چین سا ہو گیا۔ اپنا موبائل فون وہ گھر ہی میں چھ تھا۔ اُس کی بیٹری کمزور ہو گئی تھی۔ اس کا ارادہ تھا' واپس آ کر نئی بیٹری لگا دے گا۔

اردگرد اسے فون کرنے کے لیے کوئی مناسب جگہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ اچانک ہی اُسے باریش مرد کی جیب سے موبائل جھلکتا نظر آیا۔

کچھ سوچ کر ہارون اُس کے پاس آیا اور ضروری فون کرنے کی درخواست کی۔ اُس پہلے مینا کا خفیہ نمبر ملایا تھا مگر رسپانس نہیں ملا پھر اُس نے دوبارہ ہوٹل کا نمبر ملا کر طاہر سے با تھی۔

"مینا گل ابھی نہیں پہنچی؟ میں نے نمبر ملا کر دیکھا تھا۔" اُس نے پوچھا۔

"سر وہ دس پندرہ منٹ میں پہنچنے والی ہے۔ فکر نہ کریں' میں نے حساس آلات فٹ کر ہیں۔" طاہر اُس کی فون کال کی وجہ سمجھ گیا تھا۔

ہارون موبائل فون کے مالک سے کچھ فاصلے پر ہی تھا۔ یقیناً مینا گل کا نام اُس کے کان ضرور پڑا ہو گا۔

یوں اُس نے بعد میں موبائل فون کا' ری کال کا نمبر دبا کر مینا کا خفیہ نمبر معلوم کر لیا ہو گا۔

"سالار خان کی تو لاٹری نکل آئی۔" ہارون کو یہ نام مینا گل سے معلوم ہوا تھا۔

"چلیں سر ہمارا کیا جاتا ہے اور مینا گل کا بھی کیا جائے گا۔ وہ انتظامیہ سے کہہ کر نمبر تبدیل کروا لے گی۔"

طاہر مینا گل کے نکلتے ہی حساس آلات اُتار کر واپس لے آیا تھا۔ اس وقت وہ ہارون کے لیٹ میں بیٹھا تھا۔

ہارون نے مختلف بٹن دبا کر تاریں سیٹ کر کے آلات کا ریکارڈ سسٹم چالو کیا۔

"یہ کیا' یہاں تو کوئی آواز ریکارڈ نہیں ہوئی۔" پھر ہارون نے ویڈیو فلم بنانے والا جدید ترین آلہ چیک کیا۔ وہاں بھی کوئی پرنٹ نہیں تھا۔

"سر جب میں نے آلات فٹ کیے تھے تو بالکل درست تھے۔ ان میں کوئی خرابی نہیں تھی۔"

طاہر پریشانی کے عالم میں آلات اُلٹ پلٹ کرنے لگا۔

ہر طرح سے تسلی کرنے کے بعد ہارون اصل بات سمجھ گیا۔

"میڈم بانو کا بگ باس بڑا شاطر اور چالباز شخص معلوم ہوتا ہے۔ یہ امکان یقیناً اُس کے ذہن میں موجود ہو گا کہ مینا گل کو ٹریپ کیا جا سکتا ہے اور کسی ذریعے سے یقیناً اُس کے کمرے میں ہونے والی کارگزاری کی لمحہ بہ لمحہ رپورٹ حاصل کی جا سکتی ہے۔ اسی لیے اس نے آڈیو اور ویڈیو سسٹم والے حساس آلات کو بے اثر اور بے کار کرنے والے جدید قسم کے مائیکرو اسٹائل انسٹرومنٹ مینا کے سوئیٹ میں فٹ کروا دیے ہوں گے۔ یہ آلات حال ہی میں متعارف کروائے گئے ہیں اور جدید خطوط پر ہر قسم کے فالٹ سے محفوظ ہیں۔"

"یقیناً یہی بات ہو گی۔" طاہر نے گہری سانس لی۔

"اب ہمیں کیا کرنا چاہیے سر؟" اُس نے ہارون کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"ان مائیکرو انسٹرومنٹس کی تلاش۔" ہارون نے براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانک کر گھمبیر لہجے میں کہا۔ "اور یہ آسان کام نہیں ہے۔ اول تو مینا کے مقفل سوئیٹ کو اس کی غیر موجودگی میں کھلوانے کے لیے انتظامیہ کا تعاون حاصل کرنا ہو گا پھر اُن سے نظر بچا کر کسی طرح انہیں منظر سے ہٹا کر کمرے کی ایک ایک اینٹ' ایک ایک چیز چیک کرنا ہو گی۔"

دونوں گہری سوچ میں ڈوب گئے۔

"طاہر۔" اچانک اُس نے سر اُٹھایا۔ "تم ایک کام کرو۔ کسی طرح مینا کے کمرے کی چابی

کاؤنٹر سے اُڑالو اور مجھے دے دو۔ میں کسی نہ کسی طرح اس کے سویٹ تک رسائی حاصل کر لوں گا۔"

"مگر سر! اس کام میں بہت خطرہ ہے۔ آپ کہیں تو میں کوشش کروں کیونکہ میں تو ایک طرح سے ہوٹل کے اندر کا بندہ ہوں۔ اگر کسی نے کمرے میں دیکھ بھی لیا تو زیادہ خطرے کی بات نہ ہوگی۔"

"نہیں۔" میڈم بانو یا اُس کے بندوں کو شک ہوگیا یا کسی طرح انتظامیہ سے شکایت ہو گئی تو راز کھل جائے گا اور اس طرح بات بگڑنے کا اندیشہ ہے۔ تم تسلی رکھو۔ مجھے چور دروازوں تک آتا ہے۔"

وہ اُٹھ کر کافی میکر کی طرف بڑھا تھا۔

"میں سوچ رہا ہوں، کل ڈپٹی ڈائریکٹر صاحب کو تنویر جمال کیس کی رپورٹ فائل کر دوں۔ بہر حال ہمیں اتنے کلیو مل چکے ہیں کہ اُس کے خلاف کارروائی عمل میں لائی جا سکے۔ مینا گل کے ساتھ جہاں جہاں سیر و تفریح کی ہے، لنچ اور ڈنر اُڑائے ہیں ان کا تصویری ثبوت ہم حاصل کر چکے ہیں۔ ایک اہم حکومتی پرزہ ہونے کے باعث اُس کے ہر قسم کے ذاتی و سرکاری معمولات غیر معمولی تبدیلی پر محکمے کی کارروائی لازم ہے۔ اُس کا محکمہ میڈم بانو کے عیاشی کے اڈے پر اس کی آمد و رفت پر سخت ایکشن لے گا کہ اُس سے حکومتی ارکان کی بدنامی ہوتی ہے۔ باقی تفصیلات میں سامنے آجائیں گی۔ میں ڈائریکٹر صاحب سے سفارش کروں گا کہ تنویر جمال کے خلاف کارروائی کو خفیہ رکھا جائے کیونکہ اگر یہ منظر عام پر آگئی تو میڈم بانو اور اُس کے گماشتے ہوشیار ہو جائیں گے۔ انہیں کسی قسم کا شک نہیں ہونا چاہیے۔"

وہ کافی کا مگ طاہر کی جانب بڑھاتے ہوئے تفصیلات سے آگاہ کر رہا تھا۔

"مینا کب تک اسلام آباد ٹھہرے گی۔ کچھ اندازہ ہے؟" اس نے کافی کا سپ لے کر اس سے دریافت کیا۔

"ہوٹل کی انتظامیہ کو تو آج رات تک قیام کا بتایا تھا۔ مزید اُس کی مرضی پر منحصر ہے کہ اس کا سوئیٹ صرف اُسی کے نام مستقل ریزرو رہتا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" ہارون نے خالی کپ رکھ دیا۔ "اگر وہ کل روانہ ہوگئی تو میں بھی لاہور کی فلائٹ پکڑ لوں گا۔"

"سر آپ تو سائے کی طرح اُس کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔" طاہر ہنس پڑا۔

"دراصل میرے پاس ایک نکتہ ہے۔" وہ ہلکا سا مسکرایا۔ "میڈم بانو کے مقابلے میں مینا گل اتنا اسٹیمنا اور ہوشیاری نہیں رکھتی۔ اس میں چالاکی کی وعیاری کے جراثیم نسبتاً کم ہیں۔ یوں بھی میڈم بانو کے بغیر اس کی ساری مکاری اور مضبوطی پانی بن جاتی ہے۔ اس میں برداشت کی بھی کمی ہے۔ میں مسلسل اُس کے آس پاس رہ کر اُس سے دوبدو ملاقاتیں کر کے در حقیقت اس پر نفسیاتی دباؤ ڈالنا چاہتا ہوں۔ لفظوں کے ہیر پھیر میں اُلجھا کر اور نفسیاتی اٹیک کر کے اُس سے بے دھیانی میں بہت کچھ اُگلوایا جا سکتا ہے۔ وہ جذباتی سی خود پسند عورت ہے۔ میں اس کوشش میں ہوں کہ اسے ٹینس کر کے، زچ کر کے اُس کا منہ کھلوا سکوں۔ اس سے اس کی کم عقلی کا اندازہ لگا لو کہ آئی جے کے بندے سالار خان کے کے متعلق ساری رپورٹ خود بخود مجھ تک پہنچا دی۔"

"آپ کی ذہنی اپروچ اور مزاج آشنائی کا تو میں معترف ہوں سر۔" طاہر کے لہجے میں تجسس کا عنصر تھا۔

☆☆☆

"ارباب ڈیئر۔ کہاں ہوتے ہو تم آج کل۔ جب فون کرو، گھر پر نہیں ملتے۔" مینا جھنجھلاتے ہوئے انداز میں فون پر کہہ رہی تھی۔

"ہمیں کہاں جانا ہے جانم۔" "میں نے موبائل فون خرید لیا ہے۔ ایسا کرو، موبائل فون کا نمبر نوٹ کر لو۔" وہ نمبر لکھوانے لگا۔

"آج شوٹنگ پر گئے تھے؟"

"ارے مینا جی، کوئی ایک جگہ جانا ہو تو یاد بھی رہے۔ آج کل تو سارا سارا دن بزی رہتا ہوں۔" ارباب کی ہنسی میں اپنی اہمیت اور مقبولیت کا فخر شامل تھا۔

"ہاں تمہاری مصروفیت تو میں نے بھی دیکھی ہے؟" وہ جلے بھنے انداز میں گویا ہوئی "کل رات فنکشن میں وجیہہ کے ساتھ بڑے ہنس ہنس کر باتیں ہو رہی تھیں۔" مینا کے لہجے میں حسد کی بو تھی۔ وجیہہ ایک شوخ، چنچل اور حسین ایکٹریس تھی۔ نوجوان تھی۔ فتنہ انگیز شباب کی مالک تھی اور بڑی تیزی سے اوپر جا رہی تھی۔ ارباب کے ساتھ اُس کی آج کل گاڑھی چھن رہی تھی اور مینا سے یہ سب کچھ برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ وہ ارباب کو صرف اپنی ملکیت سمجھتی تھی۔

ارباب چلتا پرزہ تھا۔ جانتا تھا کہ قدم جمانے اور فلمی "قد" بڑھانے کے لیے کس قسم کے

لوگوں سے میل جول بڑھانا چاہیے۔ کچھ ہی عرصے میں وہ فلمی صنعت کے لوگوں سے گھل
تھا۔ اس کی خوش مزاجی، ملنساری، چرب زبانی اور سحر انگیز لب و لہجے سمیت اُس کی پُرکشش شخص
جادو سر چڑھ کر بولنے لگا تھا۔ اُسے دھڑا دھڑ فلمیں ملنا شروع ہو گئی تھیں۔
اس کی خوش قسمتی کہ ہر فلم اسٹار ہیروئن کے ساتھ اس کی جوڑی مقبول ہو رہی تھ
ہیروئنوں میں آج کل دوڑ سی لگی ہوئی تھی۔ وہ اس پر ڈورے ڈال کر قریب آ رہی تھیں۔ ا
بڑھتی ہوئی دوستیوں نے مینا کی نیندیں حرام کر دی تھیں۔

وہ ارباب کو ہاتھ سے نہیں کھونا چاہتی تھی۔

ارباب اُسے پا چکا تھا۔

اُس کی قربتوں سے گھڑیاں رنگین بنا چکا تھا۔

اُس کا دل فتح کر چکا تھا۔

اُسے زیر کر چکا تھا۔

اُس کے لیے ڈھلتی ہوئی عمر کی اس جذباتی اداکارہ میں مزید کشش نہیں رہی تھی۔

یوں بھی اب اس پر بہت سی فلمی پریاں مہربان ہو رہی تھیں۔

لہٰذا اب اُسے مینا کی اتنی پروا نہیں رہی تھی، محض مروّت میں بات کر لیتا تھا۔

"پہلے تو تم مجھ سے ملے بغیر، مجھ سے فون پر بات کیے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ اب آ
دن گزر جاتے ہیں اور تم خیر خبر نہیں دیتے۔ بڑے احسان فراموش اور بے مروّت ہو۔"
شکووں پر اُتر آئی تھی۔ ارباب دل ہی دل میں کوفت زدہ ہو رہا تھا، تاہم اسے پرچانے کو
بولا۔

"تم نے ایسا کیسے سوچ لیا جانِ من۔ میرے دل میں آج بھی تمہارے لیے محبت
روشن ہے۔ بس کیا کروں، کام ہی اتنا ہوتا ہے کہ کھانے پینے کا بھی ہوش نہیں رہتا۔" اس کے
لاچاری اور بے بسی بھری تھی، جس کا خاطر خواہ اثر ہوا۔

"اچھا چھوڑو، جانے دو۔ میں تو یونہی قنوطی ہو رہی تھی۔" مینا کا دل پگھل گیا تھا۔ "اب
کل مجھ سے مل لو۔ مینا کے سرگوشیانہ لہجے میں نشہ گھلنے لگا۔

ارباب نے ایک لمحے کو سوچا پھر اثبات میں جواب دے دیا۔

کبھی کبھی استعمال شدہ کپڑا پہننے میں کوئی حرج نہیں ہوتا۔

"تم کل دوپہر میرے گھر آ جانا۔ کھانا کھا کر باہر چلیں گے، مجھے انارکلی سے کچھ شاپنگ کرنا
ہے۔" مینا ایک دم ہلکی پھلکی ہو گئی تھی۔

☆☆☆

"سلام صاحب۔ بڑے دنوں بعد آئے تُسی؟" خیراں نے ہارون کو دیکھ کر دانت نکالے
ے۔

"ہاں کچھ مصروف تھا۔ تم یہ سنبھالو۔ یہ کچھ کپڑے ہیں۔ میں بچوں کے لیے لایا تھا۔" اُس
نے بنڈل اُس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"بابا صاحب تو اپنے کمرے میں ہی ہیں نا؟" وہ قدم بڑھانے سے پہلے تصدیق کرنے کی
ض سے خیراں کی طرف پلٹ کر پوچھنے لگا۔

"ہاں جی۔ اوتھے ہی ہیں۔"

ہارون لمبے لمبے ڈگ بھرتا اندر چلا گیا۔

اُسی لمحے دلشاد سائیڈ کے کلاس روم سے نکلی تھی۔ ایک کمرے میں چھوٹی چھوٹی کرسیاں اور
یبل سیٹ کر کے کلاس روم کی شکل دے دی گئی تھی، جہاں چار سال سے زائد عمر کے بچوں کو پڑھایا
اتا تھا۔ دلشاد انہیں دوسری کا اردو کا قاعدہ پڑھا کر فارغ ہوئی تھی۔

"یہ...... یہ صاحب۔" اُس کی تو روح فنا ہو گئی۔ "یہ پھر آ گئے ہیں؟" اُس کے حلق میں
کانٹے پڑنے لگے۔ "اگر جو مشعل باجی آ گئیں تو نئے سرے سے میدان لگ جائے گا۔"

"ارے شادو رانی۔ اے تے وہی ہیں وہی صاحب، جس کے بارے میں تم نے کہا تھا کہ
مجھے ضرور بتانا۔ یہی ہیں جو اکثر یہاں آتے رہتے ہیں۔ بابا صاحب سے ملتے ہیں۔ اگر بی بی بیٹھی
ہوں تو اندر نہیں آتے۔ شاید دونوں کے درمیان کوئی جھگڑا ہے۔" خیراں نے قیاس آرائی کی۔

دلشاد نے طویل سانس لے کر جسم ڈھیلا چھوڑ دیا۔

"بڑے ہی اخلاق والے ہیں۔ بڑی نرم زبان سے بات کرتے ہیں۔ یہ دیکھو، بچوں کے
لیے کپڑے لائے ہیں۔" خیراں نے بنڈل دکھایا۔

دونوں چلتی ہوئی شیر خوار بچوں والے روم میں آ گئی تھیں۔

ماسی بچوں کے کپڑے بدل رہی تھی۔ خیراں اُس کا ہاتھ بٹانے لگی۔

دلشاد دھیرے دھیرے چلتی ہوئی چھوٹے بچے خالد کے پاس آ گئی۔

نہ جانے کیا بات تھی کہ چھ ماہ کے اس بچے سے اُسے خاص اُنسیت محسوس ہوتی تھی
اختیار اسے دیکھ دل ہمکنے لگتا تھا۔

عجیب سی اپنائیت پھوٹتی تھی اُس کے نقوش سے۔

بچہ اُسے پہچاننے لگا تھا۔ اُسے دیکھ کر ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے منہ بسورنے لگا۔
مسکرا کر گود میں لے لیا۔

"بابا صاحب، میرے لیے استقامت کی دعا کیجیے۔" وہ اُن کی چٹائی کے پاس دو
دل سوز انداز میں کہہ رہا تھا۔

"میرے بچے! استقامت ایمان سے آتی ہے اور ایمان کے لیے نیک عمل اور نیک
بہت ضروری ہے۔ اپنی سوچوں کو پانی کے قطروں کی طرح صاف شفاف رکھو کہ جس طرح
سے دریا بنتا ہے، اسی طرح سوچوں سے ایمان بنتا ہے۔"

بابا صاحب نے مربیانہ انداز میں اپنا صحت مند صاف ستھرا گندمی ہاتھ بڑھا کر اُس
تھپتھپایا۔ وہ اس سے خصوصی محبت اور شفقت کا برتاؤ کرتے تھے۔ وہ نہیں آتا تھا تو اُس کا
کرتے تھے اور آمد پر پوچھتے تھے۔

"بیٹے، اتنا عرصہ کہاں رہے! کوئی خیر خبر نہیں رہی۔ اچھے تو رہے۔"

یہ بابا صاحب کی پاکیزہ مشفق نورانی ہستی کی کشش تھی کہ ہارون کھنچا چلا آتا تھا۔
مصروفیات میں سے کسی طرح وقت بچا کر کچھ ساعت ہی سہی اُن کے ہاں حاضری ضرور دیتا

"بابا صاحب۔ کتنا اچھا ہوتا کہ ساری دنیا آپ کی طرح سوچتی۔ آپ کی طرح عمل
سب نیک ہوتے، کوئی برائی نہ کرتا۔" وہ ان کے مقدس ہاتھ تھام کر معصومیت سے گویا ہوا۔

بابا صاحب ہنس پڑے۔ "اگر مور کے پاؤں بھی پروں کی طرح حسین ہوتے تو وہ بھی
پر چلنا پسند نہ کرتا۔ اگر سب نیک ہو جاتے تو نیکی کا غرور و تکبر انہیں لے ڈوبتا۔ ہر شخص اپنی
کمی بیشی کے لیے جھگڑتا، طومار باندھتا کہ میں تم سے زیادہ نیک ہوں۔"

"بابا صاحب، سچ ہے زن، زر اور زمین واقعی ابن آدم کے لیے سب سے بڑے فتنے
خصوصاً زن، اس کی تباہی سے ابلیس بھی پناہ مانگتا ہے۔" وہ کسی گہری سوچ میں گم بولا تھا۔ "
جانتی ہے کہ وہ مرد کی سب سے بڑی کمزوری ہے اور اس کے جسم میں مرد کے لیے راحت اور
چھپی ہے اسی لیے وہ اس کا بھرپور استعمال کرتی ہے۔ اپنے حسن و شباب کی قیمت وصول

اس کا وجود اخلاق و اقدار کی ترویج کا سب سے بڑا خطرہ ہے۔ عورت دھبا ہے معاشرے
جود پر۔ ایک غلیظ اور سیاہ دھبا۔" اس کے چہرے پر اشتعال کی سرخی پھیل گئی۔

"ایسا نہ کہو میرے بچے، حقائق کا یک طرفہ جائزہ لے کر فیصلہ نہیں کیا کرتے۔ بابا صاحب
ل سے اُسے سمجھایا۔ اُن کے انداز میں سکون تھا۔ "عورت کو خدا نے بڑا اونچا منصب عطا کیا
عورت معاشرے کا دھبا نہیں، اس کا سنگھار ہے۔ کائنات کا حسن اسی کے رنگین وجود سے قائم
عورت تباہی و بربادی کا سبب اُسی وقت بنتی ہے، جب وہ اپنے منصب اور اپنے مقام سے
ر جاتی ہے۔ اپنی نسوانیت، اپنے عزت دارانہ تشخص کو ٹھوکروں پر رکھ دیتی ہے اور اس لمحے وہ
نہیں رہتی، ڈائن بن جاتی ہے۔ فاحشہ اور بدکردار کہلائی جاتی ہے۔ ایسی عورت کی سرکوبی
ہے۔ اُسے کیفر کردار تک پہنچانا چاہیے تاکہ خلق خدا اُس کی فتنہ پردازیوں اور شر انگیزیوں
نفوظ رہ سکے۔"

ہارون نے بابا صاحب کو اپنے مشن کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں بتایا تھا اور نہ ہی کبھی بابا
ب نے پوچھا تھا۔ وہ اسی موضوع پر بات کرتے تھے جو مخاطب از خود چھیڑتا تھا یا جس کا جواب
تا تھا۔ وہ کسی کی ذاتیات میں دخل اندازی کے قائل نہیں تھے اور نہ ہی خواہ مخواہ ٹوہ میں لگے
تے تھے۔ جس حد تک کوئی بتاتا، اُسی حد تک اُسے مطمئن کرتے تھے۔

گو کہ ہارون نے اُنہیں اپنی ذہنی اُلجھن کے متعلق تفصیلات نہیں بتائی تھیں مگر اُن کی باتیں
ر اُسے یوں محسوس ہوا، جیسے اُس کے مسئلے کا حل مل گیا ہو۔ جیسے کوئی نیا نکتہ سوجھ گیا ہو۔ وہ خود کو
ہلکا محسوس کرنے لگا تھا اور یہی بابا صاحب کی ساحرانہ صحبت کا اعجاز تھا۔ جو اُن کے پاس بیٹھ کر
ن کی اُلجھی ہوئی گرہیں کھولنا چاہتا، بابا صاحب اُس کے دل و دماغ کی پیچیدہ گتھیاں سلجھا کر
صاف کر دیتے۔

"بابا صاحب، آپ مشعل بی بی کو سمجھائیں کہ وہ اپنی زندگی تباہ نہ کریں۔ شادی ایک مذہبی
فرض ہے اور مناسب عمر میں اس کی تکمیل لازم ہے۔" اس نے دبے انداز میں کہہ دیا۔

بابا صاحب نے چونک کر بغور اُس کی سمت دیکھا۔ اُن کی آنکھوں میں ٹٹولنے والی، جائزہ
نے والی، معاملے کی تہ تک پہنچنے والی کھوج شامل تھی جس نے مضبوط اعصاب کے مالک ہارون کو
ل سا کر دیا۔ وہ بے اختیار نظریں چرا گیا۔ اُن کی نپی تلی جانچتی ہوئی عمیق نگاہ کا سامنا کرنا، اس
کے بس کی بات نہیں رہی تھی۔

''شادی معاشرتی حوائج میں شمار ہوتی ہے اور وہ ابھی ذاتی حوائج میں اُلجھی ہوئی
ذات کا عرفان تلاش کر رہی ہے۔ خود اپنی کھوج میں ہے۔ اس کی ''ڈھونڈ'' پوری ہو لینے
اپنی یہ کھنگال لینے دو پھر خود بخود معاشرتی حوائج کی طرف دھیان دینے لگے گی۔ ابھی وہ
کی جمع تفریق میں لگی ہوئی ہے۔ اندر کی اُلجھنوں کا شکار ہے۔ یہ دھاگے سلجھ گئے تو میں خود
لیے سفارش کروں گا۔''

ہارون پر جیسے گھڑوں پانی پڑ گیا۔ اُس کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ بابا صاح
زیرک نگاہی اور فہم و فراست کی بدولت اتنی جلدی اُس کے رسمی سے الفاظ کے پس پردہ کو
سے آگاہ ہو جائیں گے۔

''میرا یہ مطلب نہیں تھا بابا صاحب۔'' اس نے نظر جھکا کر پست آواز میں کہا۔
شرم کی سرخی سے پھیل گئی تھی۔ نہ جانے کیوں اُسے بابا صاحب سے بہت حجاب آ رہا
ہونے کے باوجود وہ نروس ہو رہا تھا۔ شاید اُن کی شخصیت کے تقدس آمیز رعب اور دبد
تھا۔

''شرماتے کیوں ہو بچے۔ ازل سے ابن آدم دسراہٹ کی طلب میں حوا کے وجود
کرتا رہا ہے اور یہ عین تقاضائے بشریت ہے۔ اسلام اس کا پورا پورا حق دیتا ہے کہ مرد و ز
کے ذریعے اپنی جسمانی و جذباتی آسودگی حاصل کریں تاکہ بہکنے یا بھٹکنے کا احتمال نہ
صاحب اس کی جھینپی ہوئی کیفیت سے محظوظ ہو رہے تھے۔

''میں چلتا ہوں بابا صاحب۔'' وہ بہ مشکل اُن کے سے نظر ملا سکا تھا پھر ٹھہرا نہیں
کے باہر نکل گیا تھا۔

☆☆☆

مینا کے لیے بڑی شبھ گھڑی تھی کہ آج وہ اُس کے دروازے پر آیا تھا۔ وہ دل و
اُس کی خاطر تواضع کر رہی تھی۔
اس کے آگے تن من سے بچھی جا رہی تھی۔
اور ارباب نے بھی حسن کی بہتی گنگا میں جی بھر کر ہاتھ دھوئے۔
اس وقت وہ اٹکھیلیاں کرتے ہوئے قریبی بازار میں شاپنگ کر رہے تھے۔
سامان خرید کر وہ گاڑی کی طرف آئے۔

نا نے پچھلا لاک کھول کر سامان سیٹ پر رکھا۔
باب کوئی گھسا پٹا بے ہودہ سا لطیفہ سنا رہا تھا۔
ا ہنس ہنس کر دوہری ہوئی جا رہی تھی۔ یونہی ہنستے ہوئے اس نے کسی بات پر ارباب کے
اتھ مارا تھا' اُسی لمحے ایک تیز رفتار جیپ ان کے قریب آن رکی۔ اندر سے سر تا پا سیاہ
میں ملبوس تین باریش مرد نکلے۔ تینوں مسلح تھے اور اُن کی جانب آ رہے تھے۔
میں نے تم سے کہا تھا ناں کہ آئندہ اس چھوکرے کے ساتھ سین پارٹ کرتی نظر آئیں تو
ا کوئی نہیں ہوگا۔'' ایک غراتی ہوئی سفاک آواز مینا کا خون خشک کر گئی تھی۔
و دہشت سے اپنی جگہ پر منجمد سی کھڑی رہ گئی۔ ارباب بھی صورت حال کے پیش نظر سہم سا

اب اس کا نتیجہ بھگتو۔'' اس نے رائفل کی نال سیدھی کی۔
ی لمحے مینا کی جبلی حس جاگی۔ اُس نے پوری قوت سے نتائج و عواقب کی پروا کیے بغیر
ع کر دیا۔ بھرا بازار تھا' لوگ لمحوں میں اُدھر متوجہ ہو گئے۔
ر دیکھ کر تینوں سیاہ پوش اپنی جیپ میں سوار ہو گئے اور کھڑکی کے پاس بیٹھنے والے نقاب
اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی۔ ہجوم فوراً منتشر ہو گیا۔
ں سے پہلے کہ مینا کہیں پناہ لیتی' ایک گولی سنسناتی ہوئی اُس کی ٹانگ کا گوشت پھاڑتی چلی

ہولناک چیخ کے ساتھ بھاگتی بھاگتی وہیں گر گئی۔
سی لمحے دوبارہ فائر ہوا اور پھر مزید دو فائر کرنے کے بعد جیپ ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی

ور مینا پارکنگ لاٹ کے شیڈ میں لہولہان پڑی تھی۔ اُس کے جسم میں کوئی حرکت نہیں ہو

♥♥♥

خوش قسمتی سے ارباب فائرنگ سے محفوظ رہا تھا یا وہ مسلح افراد کا ٹارگٹ نہیں تھا۔

جونہی پجارو حرکت میں آئی' اِدھر اُدھر دبکے ہوئے لوگ دوبارہ نکل آئے اور مینا کے ہو گئے۔

ارباب نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اسے گاڑی میں ڈالا اور قریبی اسپتال لے آیا جہاں فوری طور پر آپریشن تھیٹر میں منتقل کر دیا گیا۔

ایک گھنٹے کے کامیاب ترین آپریشن کے بعد ڈاکٹرز نے مینا کی ٹانگ سے گولی تھی۔

اُسے دو گولیاں لگی تھیں۔ ایک تو محض ٹانگ کے اوپری حصے کا گوشت چھیدتے ہو نکل گئی تھی۔ دوسری البتہ اندر تک گئی تھی۔

''خطرے کی کوئی بات نہیں ہے ارباب صاحب۔ وہ ٹھیک ہیں۔ دو گھنٹے بعد ہوش جائیں گی۔ گولی نکالنے کے لیے چھوٹا سا آپریشن کرنا پڑا ہے مگر تشویش کی کوئی بات نہیں۔ ایک ہفتے میں فٹ فاٹ ہو جائیں گی۔''

ارباب کو مینا سے زیادہ اس بات کی تشویش تھی کہ اب نیا اسکینڈل کھڑا ہو جائے گا والے تو جان کو آ جائیں گے۔ وہ فلم انڈسٹری میں اپنے قدم جما رہا تھا' ایسے میں اس قسم کا اُس کی شہرت کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔ وہ اپنے نفس کو کوس رہا تھا جس کی ترغیب پر وہ مینا ٹائم پاس کرنے آیا تھا۔

☆☆☆

''انتہا پسند مذہبی تنظیم کے کارکنوں نے مینا گل پر گولیاں برسا دیں۔ خوش قسمتی سے کی جان بچ گئی۔ وہ زخمی حالت میں شیخ زید اسپتال میں ایڈمٹ ہیں۔ اہم شخصیات اور تانتا بندھ گیا۔ عیادت کے لیے لائے گئے پھولوں سے سارا اسپتال سج گیا۔''

بانہ سی بے چین کیفیت میں اخبار میز پر ڈال دیا۔

''یہ عورت ہمیشہ مجھے دُکھ دیتی ہے' کبھی براہِ راست کبھی بالواسطہ۔ کبھی کھلے بندوں تو کبھی چھپے انداز میں۔'' اس نے دل گرفتگی سے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔

''کیا بات ہے باجی۔ اتنی اُداس کیوں ہو رہی ہیں؟''

اتنے عرصے ساتھ رہنے کا اعجاز تھا کہ اب دلشاد اس سے قدرے بے تکلفی سے اس کے موڈ کے میں پوچھ لیتی تھی۔

دراصل اب اسے سمجھ آ گیا تھا کہ کون سے موضوع پر بات نہیں کرنی۔ وہ مشعل کی دُکھتی اپنے انداز میں جان گئی تھی۔

بہت زیادہ گہرائی میں تو نہیں جا سکی تھی کہ ابھی اُس میں اتنی فہم نہ تھی لیکن اتنا ضرور سمجھ گئی تھی ل باجی سے اُن کے ماضی یا اُن کی رشتے داریوں کے بارے میں سوال نہیں کرنا۔

''بس ایسے ہی یار۔'' وہ کسل مندی سے بولی۔ ''فیکٹری کے معاملات نے ذہن شل کر رکھا میری جنرل منیجر نسرین آج کل چھٹی پر ہے۔ میں بہت سا کام اُس پر ڈال کر بے فکر ہو جاتی اب یہ عیاشی مہنگی پڑ رہی ہے۔''

مشعل اسے دکھانے کو جبراً مسکرائی۔ ایک ایسی مسکراہٹ جس کی تہہ میں بے یقینی' بے بسی اور ی پوشیدہ ہوتی ہے۔

اسی لمحے فون کی بیل بجی تھی۔

''ذرا دیکھنا دلشاد۔ کہیں فیکٹری کی جی ایم نسرین ہی نہ ہو۔'' مشعل خود فون سننے کے بجائے اسے کرسی پر ٹکی رہی۔

دلشاد نے پُر اعتماد انداز میں لاؤنج میں جا کر فون کا ریسور اٹھایا تو اُدھر سے شستہ و شائستہ نہ آواز سنائی دی۔

''مس مشعل سے بات کرنا ہے۔''

''جی آپ کا نام؟'' دلشاد مرد کی آواز سن کر متذبذب ہو گئی۔ شاید ہی مشعل کو گھر کے نمبر پر باہر کا فون آیا ہو۔ وہ آفس کے معاملات کو وہیں تک محدود رکھتی تھی۔ گھر کے نمبر پر چند مخصوص بات کرتی تھیں۔ یہ کون تھا جو اس نمبر سے واقف تھا؟

''ہارون احمد۔ پلیز۔ اُن سے کہیے' میں ایمرجنسی میں بات کر رہا ہوں۔'' غالباً اسے اندیشہ

تھا کہ مشعل فون پر نہیں آئے گی۔
وہ طویل سانس لے کر واپس مشعل کی طرف گئی۔ ''آپ کا فون ہے باجی۔''
''کون ہے؟''
اس نے جواب میں من وعن دُہرایا۔
مشعل کے چہرے کے تاثرات پڑھ کر اس نے سوچا' ہارون کا اندیشہ بجا تھا۔ و
''ایمر جنسی'' کے نام پر طوعاً وکرہاً اُٹھی تھی۔ وگرنہ شاید انکار کہلوا دیتی۔
''جی فرمایئے۔'' اس نے رسمی سلام دعا کے بجائے بڑے سپاٹ انداز میں مخاطب ک
''مشعل' مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنا ہے۔ کیا تم مجھ سے مل سکتی ہو؟'' ہارو
اتنا سنجیدہ اور ہیجان خیز تھا کہ مشعل کو اپنی سرد مہری پس پشت ڈالنا پڑی۔
''تم فون پر بتا دو۔ وہ ضروری بات کیا ہے۔''
''نہیں' فون پر رسک نہیں لیا جا سکتا۔ کیا میں تمہارے گھر آ سکتا ہوں۔''
''نہیں۔ میرے گھر پر مرد نہیں آیا کرتے۔'' وہ دوٹوک بولی۔
''ادارے میں ایسی بات نہیں کی جا سکتی۔ پرائیویسی کا معاملہ ہے۔'' وہ فکر مند
یوں کرو' خود ہی کسی جگہ کا انتخاب کر کے بتا دو جہاں تمہیں آسانی رہے' بس میں اُدھر پہنچ
ہارون کے انداز میں مصلحت تھی۔
''تم کہاں سے بات کر رہے ہو؟'' وہ بادل ناخواستہ راضی ہو گئی۔
''میں اس وقت روز اینڈ جیسمین پارک کے آس پاس منڈلا رہا ہوں۔ ویسے ہ
یہاں بھی مل سکتے ہیں۔ پارک بالکل سنسان ہے۔ اکا دُکا لوگ ہیں۔ کھلی اور محفوظ
قدرے ہٹ کر بھی ہے۔ کسی آشنا چہرے سے ملاقات کا امکان بھی نہیں ہو گا۔''
مشعل نے وال کلاک پر ٹائم دیکھا۔ دوپہر کا ایک بج رہا تھا۔
''ٹھیک ہے۔ میں دو بجے تک پہنچ رہی ہوں۔'' اس نے آہستگی سے پسپائی
میں کہہ کر ریسیور رکھ دیا۔
آج اتوار تھا۔ چھٹی کا دن تھا۔ وہ کافی دیر سے اُٹھی تھی۔ تعطیل کے روز وہ بڑ
جاتی تھی۔ ابھی تک نہائی بھی نہیں تھی۔
''دلشاد' ماسی سے کہہ کر میرا سفید سوٹ استری کروا دینا۔ میں باتھ لینے ج

کھانے پر نہیں ہوں گی۔ میرا انتظار مت کرنا۔ آپا اماں کے ساتھ لنچ کر لینا۔ میں ایک گھنٹے تک
واپس آ جاؤں گی۔'' تیار ہو کر اپنی گرے کرولا نکالی اور روانہ ہو گئی۔
ڈرائیونگ کے دوران وہ متضاد سے جذبات کا شکار تھی۔
وہ کیوں لوٹ رہی ہے' اُنہی پرانی راہوں پر۔
اب تو کچھ حاصل نہیں اور نہ ہونے کی اُمید ہے۔
اب تو فقط ایک ہی راستہ ہے۔ جدائی کا راستہ۔
پھر میں سراب کے پیچھے کیوں بھاگ رہی ہوں!
وہ خود سے دریافت کر رہی تھی۔
وہ پارک میں اُسی مخصوص جگہ پر اُس کا منتظر تھا جہاں سالوں پہلے وہ ملا کرتے تھے۔
وہ ہم تم۔
وہی موسم۔
وہی رستے۔
وہی منظر۔
مگر بیچ میں سالوں کے مہیب فاصلے تھے۔
کچھ سال بیشتر جب وہ ملے تھے تو احساس کی ٹہنی پر نئے پھول مہک رہے تھے۔
آنکھوں کے آنگن میں سکون رقص کرتا تھا۔
آرزو موج کے سینے پر سفر کرتی تھی۔
اُس وقت شب و روز عجیب سی طلسمی کیفیت کے زیر اثر آ گئے تھے۔
ہواؤں میں خوشبو رچی ہوئی تھی۔ رات کی مٹھی میں خواب مقید تھے۔
زندگی کے سمندر میں اُمید اور عزم کی لہریں ہلکورے لیتی تھیں اور اب دونوں تہی دست
تھے۔
دونوں کے دل اور ہاتھ خالی تھے۔
''کہو کیا کہنا ہے؟'' وہ گھاس کے قطعے پر دو زانو بیٹھتی ہوئی بہت ضبط سے مخاطب ہوئی۔
آنکھوں کی تہہ میں مچلتے آنسوؤں پر بڑی مشکل سے قابو پایا تھا۔
کتنی مدتوں بعد وہ یہاں آئی تھی۔ شاید آخری دفعہ اسی کے ہمراہ آنا ہوا تھا۔ اس کے بعد

کبھی ہمت ہی نہ پڑی تھی۔ یہاں آ کر یادوں کے کھرنڈ چھلنے لگے۔

ہارون بھی ماضی کے طلسم میں گرفتار تھا۔ وہ بھی جذبات کی یلغار میں بے بس ہو گیا تھا۔

"کہنا تو بہت کچھ تھا مگر......" وہ رک سا گیا' اُس کے لہجے میں گہرے دکھ کی کاٹ تھی' تھا' اُداسی تھی' اضمحلال تھا۔

"مجھے اختر ملک کی ایک غزل شدت سے یاد آ رہی ہے۔

بنتے کھیل بگڑ جاتے ہیں دھیرے دھیرے
سارے لوگ بچھڑ جاتے ہیں دھیرے دھیرے
سپنوں سے مت جی بہلاؤ دیکھو لوگو
سپنے پیچھے پڑ جاتے ہیں دھیرے دھیرے

وہ براہ راست اس کے چہرے کی سمت دیکھ رہا تھا۔ مشعل اشک چھپانے کے لیے ہونٹ کاٹ رہی تھی۔

ضبط کرو تو بہتر ہے دیوانو ورنہ
آنسو زور پکڑ جاتے ہیں دھیرے دھیرے

"بس کرو' کوئی اور بات کرو۔" وہ چہرہ موڑ کر روندھے ہوئے لہجے میں بولی۔

"بس آخری شعر رہ گیا ہے۔" وہ آہستگی سے گویا ہوا۔

جتنا ہوتا ہے اختر کوئی پاس کسی کے
اتنے فاصلے بڑھ جاتے ہیں دھیرے دھیرے

مشعل خود پر بند باندھے ہوئے تھی ورنہ جی چاہ رہا تھا' پھوٹ پھوٹ کر رو دے۔

"انا کی یہ جنگ یہ گریز و اجتناب کب تک جاری رہے گا مشعل۔ آخر کسی نہ کسی کنا تک تو پہنچنا ہی ہوگا۔ مسئلے کا حل فرار سے نہیں سامنا کرنے سے نکلتا ہے۔ آخر کیوں ہم مجر طرح ایک دوسرے سے چھپتے پھر رہے ہیں۔ حریفوں کی طرح ایک دوسرے کو نیچا دکھانے خوشی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ بہت ہو گیا مشعل۔ یہ کوئی کھیل تو نہیں ہے۔ پوری زندگی کا ہے۔"

اُس کا آزردہ و بے کل انداز مشعل کے اعصاب جھنجھوڑ رہا تھا۔ اُس کا دماغ ماؤف تھا۔

"پوری زندگی کس نے دیکھی ہے۔" وہ عجیب نیم دلی سے مسکرائی تھی۔ "کون جانے کس کی کتنی سانسیں باقی ہیں۔"

"جب تک سانس تب تک آس۔ اُمید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔"

"اُمید اپنے ہاتھ میں تھی ہی کب۔" اس نے ٹھنڈی آہ بھری۔ "یہ تو سراب ہے' فریب نظر ہے' طلسم آرزو ہے۔" وہ برگشتہ ہو کر بولی۔ "ایسا سراب جس میں ہم سب گرفتار ہیں۔"

"کچھ تو ہے ناں۔ کوئی ہلچل' کوئی ہنگامہ' کوئی سرگرمی تو ہے زندگی میں۔ وہ کیا ہے کہ

اے عشق آ کہ پھر سے کوئی تجربہ کریں
دل بھولنے لگا ہے پُرانی کہانیاں"

اس کے لہجے میں شگفتگی پھوٹنے لگی۔

مشعل نے تیز اور تادیبی نظروں سے اُسے دیکھا۔

"مطلب کی بات کرو۔" وہ دوبارہ اپنے سابقہ موڈ میں آ گئی۔

"کس لیے بلایا تھا یہاں؟"

"کیوں بلایا تھا؟" وہ معصومیت سے خود استفسار کرنے لگا۔ "ارے ہاں یاد آیا۔" میں نے کہا۔

بنی نہ بات کہیں بھی تو ہم سے دل نے کہا
وہیں چلو جو ٹھکانے ہیں آزمائے ہوئے

"میں جا رہی ہوں۔" وہ تنگ آ کر سچ مچ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ انداز میں قطعی پن تھا۔ ہارون نے تیزی سے اُٹھ کر اس کا راستہ روک لیا۔

"ارے یار۔ خفا کیوں ہوتی ہو۔ پُرانی یادوں نے دل و دماغ پر حملہ آور ہو کر بے فکرا بنا دیا تھا۔ مجھے غلط نہ سمجھو۔ مجھے واقعی تم سے ضروری کام ہے۔ بیٹھو۔ پلیز۔"

وہ مکمل طور پر سنجیدہ ہو چکا تھا۔

مشعل بادل ناخواستہ دوبارہ بیٹھ گئی۔

"اب کوئی سابقہ حوالہ دُہرایا تو میں لحاظ نہیں کروں گی۔"

مشعل کا تنبیہی لہجہ بے لچک تھا۔

ہارون ہارے ہوئے انداز میں اس کی سمت دیکھنے لگا۔

آنکھوں میں شکایت تھی' غصہ تھا' بے بسی تھی۔

مشعل نظریں چُرا گئی۔

"حوالے کے لیے تم نے چھوڑا ہی کیا ہے۔" وہ تلخی سے گویا ہوا۔

"یاد کرو' تم نے آخری ملاقات میں کہا تھا کہ میں آئندہ تمہاری راہ میں نہ آؤں' کم
رابطہ نہ رکھوں اور نہ کوئی آس لگاؤں کیونکہ ہمارے درمیان قیامت تک کوئی شرعی بندھن
نہیں ہوسکتا۔ میں نے تم سے کیے گئے عہد کا پاس کیا اور تمہارے اردگرد ہوتے ہوئے بھی تم
سامنے نہیں آیا مگر اب مجھے میرا فرض تم سے بدعہدی پر مجبور کر گیا ہے۔ مجھے لامحالہ تم سے را
پڑا۔ دو بدو بات کرنا پڑی۔ تمہارے آفس آنا پڑا۔ کیونکہ ہم مینا گل سے تعلق رکھنے والے ایک
بندے پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔"

"تمہیں مینا گل یا اُس کی سرگرمیوں سے کیا دلچسپی ہے؟"

وہ اُلجھ سی گئی تھی۔

"یہی بتانے کے لیے تمہیں یہاں آنے کی زحمت دی تھی۔"

وہ رسانیت سے گویا ہوا۔ "میں تمہیں جو بات بتانے لگا ہوں اس کا میرے محکمے کے
افسران اور میرے خاص بندوں کے علاوہ کسی کو بھی علم نہیں ہے۔"

معاً اُس کا لہجہ سرگوشیانہ ہو گیا۔ اس نے محتاط نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا پھر اُس
قریب سرک کر شروع ہو گیا۔

"ہمیں شک ہے کہ میڈم مینا گل غیر ملکی جاسوسی ایجنٹ کی آلۂ کار ہے۔"

"نن۔ نہیں......" ضبط کے باوجود مشعل کے مُنہ سے بھنچی بھنچی چیخ برآمد ہو گئی تھی۔

"شی۔ آہستہ۔" ہارون نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کے اُسے ٹوکا۔ "پورا گینگ کا
ہے اور اُن کی سرغنہ میڈم بانو ہے۔ مینا گل میڈم کی چہیتی' منجھی ہوئی اور قابل اعتماد ساتھ
میڈم کے بہت سے پوشیدہ رازوں سے واقف ہے اور اگر کسی طرح مینا گل کو ٹریپ کر لیا
اس گروہ کے انکشاف میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔ اس طرح میڈم بانو اور اس کے پس پردہ
تک پہنچنا نہایت آسان ہو جائے گا۔"

مشعل کا دل بُری طرح دھک دھک کر رہا تھا۔ اس انکشاف نے اس کے جسم میں
دوڑا دی تھی۔

"اور سوچو ذرا اگر ایسا نہ ہوا تو ملکی راز دشمن تک پہنچانے کا سلسلہ جاری رہے گا۔ میڈم بانو
تربیت یافتہ سوسائٹی گرلز کے ذریعے اہم ترین سیاسی و انتظامی شخصیات گمراہ ہو کر وطن سے
ری پر آمادہ ہوتی رہیں گی اور میڈم بانو کے قائم کردہ فحاشی کے اڈّے نوجوان نسل کی اخلاقی و
انی تباہی کا سبب بنتے رہیں گے۔ یوں پورا معاشرہ صنفی انارکی کا شکار ہو جائے گا۔ کیا تم اب
میری مدد نہیں کرو گی؟ میرا ساتھ نہیں دو گی؟"

ہارون کا نفسیاتی حربہ کارگر ثابت ہوا۔

مشعل کی آنکھوں میں آمادگی کی تحریر واضح طور پر نمایاں تھی۔

"میں اس سلسلے میں تمہاری کیا مدد کر سکتی ہوں؟"

"میں جاننا چاہتا ہوں کہ مینا گل تم سے کس تعلق کی بنا پر ملتی ہے۔ اگر تمہارا وجود اُس کے
کسی لحاظ سے اہمیت کا حامل ہے تو اس سے بہت فائدہ ہو سکتا ہے۔ تم اُس تک اپروچ کر سکتی
اُس کے آنے جانے کے اوقات پر نگاہ رکھ سکتی ہو۔ اسے کال کر کے بلوا سکتی ہو۔ یا خود اس کی
ں میں جا سکتی ہو' بوقت ضرورت۔"

مشعل دم بخود بیٹھی رہ گئی۔

یہی وہ مقام تھا جہاں پہنچ کر وہ بے بس ہو جاتی تھی۔

اسے اپنی شخصیت کا وقار' اپنی آن اور عزت نفس بہت عزیز تھی۔ وہ خود کو کسی کی نظر سے گرتا
اشت نہیں کر سکتی تھی۔ ہارون کے سامنے سچ بول کر وہ ساری زندگی اس سے اور خود سے نظر نہ ملا
۔ شاید شدت توہین سے خودکشی کر لیتی۔ وہ اسے کس منہ سے بتاتی کہ وہ کون ہے۔

کن کالی گھڑیوں کا ثمر ہے۔

اندھے لمحوں کی کھیتی ہے۔

سیاہی کی پیداوار ہے۔

گمراہی کا پھل ہے۔

آج سے چھ سات برس قبل وہ اس حقیقت سے بالکل لاعلم تھی۔

آیا اماں نے اسے یہی بتایا تھا کہ ویگن کے حادثے میں اُس کے والدین جاں بحق ہو گئے
تھے اور وہ معجزانہ طور پر بچ گئی تھی۔ امدادی ٹیموں کے ساتھ ایک رفاہی تنظیم کے کارکنان بھی آئے
تھے۔ انہی میں کوئی بیگم مجتبیٰ بھی تھیں۔ وہ بانجھ تھیں اور بیوہ تھیں۔ اس لاوارث بچی کو گھر لے آئیں

اور اپنی بیٹی بنا کر پالنے لگیں۔ آپا اماں اس کوٹھی میں ملازمہ تھیں۔ ایک رات بیگم صاحبہ کو
اٹیک ہوا۔ وہ جاں بر نہ ہوسکیں۔ مرنے سے پہلے وہ اپنی تمام تر جائداد اور بینک بیلنس مشعل
نام کرگئی تھیں۔

مشعل کو یہی پتا تھا اور آپا اماں نے بھی پوچھنے والوں کو یہی اسٹوری بتا رکھی تھی۔

ان دنوں مشعل بی اے کرچکی تھی اور سنجیدگی سے گارمنٹ فیکٹری کھولنے کا سوچ رہی تھی

"ٹھیک ہے میرے پاس اللہ کا دیا بہت کچھ ہے مگر آپا اماں بیٹھے بیٹھے تو قارون کا خزا
خالی ہو جاتا ہے مجھے کچھ کرنا چاہیے۔" وہ روز اینڈ جیسمین گارڈن میں ان کے ساتھ ٹہلتی ہ
سوچ انداز میں کہہ رہی تھی۔ وہ اکثر یہاں آتی رہتی تھی۔ چھوٹی ہوتی تو آپا اماں ہمراہ لے آ
اب جب سے ڈرائیونگ سیکھی تھی۔ آج کل اُن کے ساتھ تو کبھی اکیلے اِدھر آنکلتی تھی۔ اسے
کے لیے یہ جگہ بہت پسند تھی۔ پُرسکون ٹھنڈی اور رازدار۔

اُس دن یہاں گل داؤدی کے پھولوں کی نمائش لگی تھی۔

ہارون بھی فراغت ملنے پر یونہی چلا آیا تھا۔ وہ حال ہی میں خفیہ کے محکمے میں ملازم ہو
یونہی اتفاقیہ اُڑتی پڑتی نظر گھاس کے قطعے پر ٹہلتی اس سنجیدہ و حسین اور معصوم لڑکی
تھی۔

اور پھر وہی بات کہ پھر نظر لوٹ کر نہیں آئی۔

"اُفوہ۔ بھئی مجھے تو پیاس لگ رہی ہے بیٹی۔"

"ہاں۔ مجھے بھی ٹھنڈی ٹھار پیپسی کی طلب ہو رہی ہے۔ ٹھہریے میں کینٹین سے جا
ہوں ایک تو ریفریشمنٹ پیلس بھی دنیا کے آخری کونے پر بنائی ہوئی ہے۔" وہ سستی اور
آمیز لہجے سے بولی۔

"آپ پسند کریں تو میں جا کر لا دوں؟" وہ بے اختیار ہی پیشکش کر بیٹھا تھا۔

"آپ"۔ مشعل ہکا بکا رہ گئی تھی۔ کچھ پس و پیش کے بعد وہ راضی ہوگئی۔ یوں بات
کی سبیل ہوگئی۔ دوسری ملاقات بھی اگلے ہفتے اسی جگہ ہوئی تھی۔

مشعل کا تو معمول کا انداز تھا۔ البتہ وہ خاص طور پر یہاں آیا تھا اور اُس کی طلب را
گئی تھی۔

ابتدائی علیک سلیک کے بعد رفتہ رفتہ وہ بے تکلف ہوگئے۔

ہارون نے گارمنٹ فیکٹری کی مینجمنٹ اور دیگر بیرونی کاموں میں بہت مدد کی تھی۔

دونوں ہر طرح کی بات ایک دوسرے سے شیئر کر لیتے تھے۔

مگر اُن کے تعلقات کی نوعیت پاکیزہ و شفاف مخلصانہ انسیت پر مبنی تھی۔

دونوں کا مزاج اور ذہنی اپروچ پختہ بلند خیال اور اعلیٰ انسانی و تہذیبی روایت و اقدار پر مشتمل
تھی۔ وہ ایک دوسرے کی ذات نفس اور رائے کا بے حد احترام کرتے تھے۔

گو کہ ہارون اُس سے بات کرتے ہوئے شرارتی ہو جاتا تھا چھیڑ خانی کر کے تنگ کرتا تھا۔
شعروں کے ذریعے اس کا ناطقہ بند کرتا تھا مگر اس شوخی اور چھیڑ چھاڑ میں بڑی سادگی معصومیت
و شفافیت ہوتی تھی۔ ذو معنی پن اور چھچھورا پن بالکل بھی نہیں ہوتا تھا۔ اُن کی باتوں کا موضوع
بھی عام سا ہوتا تھا۔

یونہی بے وجہ بلا جواز چھوٹی چھوٹی بچکانہ باتوں پر ایک دوسرے سے رُوٹھ جاتے۔ لڑتے
جھگڑتے اور پھر فوراً ہی من بھی جاتے تھے۔ ان کے درمیان محبت بھرے ڈائیلاگ یا سین پاٹ ہرگز
نہیں ہوئے تھے بلکہ شاید ہی کبھی اس موضوع کو چھیڑا ہو۔

جذبوں کا خلوص اور اپنائیت کا احساس جو کچھ بھی تھا دونوں کے دل میں تھا۔ لبوں پر نہ کبھی
آیا تھا اور نہ ہی دونوں نے اس کی ضرورت محسوس کی تھی۔

بس ایک پاکیزہ سا اخلاص بھرا خاموش رشتہ تھا جسے بن کہے بن جتائے دونوں سمجھتے تھے۔

ہاں جب ہارون نے آئی ریٹ میں فلیٹ لے کر فرنشڈ کروا لیا تو گھر والوں کے اصرار پر
شادی کے لیے ہامی بھر لی۔ وہ والدین کو اُس کو گھر بھیجنے سے پہلے اس سے مشورہ کرنا چاہتا تھا۔
جانتا تو تھا اس کے دل کی بات مگر اس کی زبان سے تصدیق بہرحال ضروری تھی۔

اور جس روز ہارون نے اُسے شام کو ملنے کے لیے کہا تھا اسی دن صبح اُسے وہ زہریلا
انکشاف ہوا۔

مینا گل کبھی کبھار آپا اماں سے ملنے آیا کرتی تھی۔ مشعل کو اس کی آمد پسند تو نہیں تھی تاہم آپا
اماں کی وجہ سے مجبوراً برداشت کر لیتی تھی۔ اس روز بھی وہ ڈرائینگ روم میں آپا اماں سے محو گفتگو
تھی۔ مشعل ماسی سے چائے بنوا کر لا رہی تھی۔

"نہیں راشدہ! مشعل کو پتا نہیں چلنا چاہیے کہ میں اُس کی ماں ہوں اور وہ میری ناجائز اولاد
ہے۔ میں نے یہ بات پوری دنیا سے چھپا رکھی ہے۔ اس راز کو راز ہی رہنا چاہیے ورنہ میری

شہرت و مقبولیت اور میرا سارا کیریئر تباہ ہو جائے گا اور مشعل کی شخصیت بھی ٹوٹ پھوٹ کر شکار ہو
جائے گی۔"

جیسے کوئی آسمان ٹوٹ پڑا تھا۔

قیامت برپا ہو گئی تھی۔

یوم حشر آ گیا تھا۔

وہ اہانت و ذلت کے بدترین سیلاب میں تھپیڑے کھا رہی تھی۔

"تو یہ تھا سارا پلندہ۔ کسی "بیگم صاحبہ" کا وجود نہیں تھا۔ وہ یہی محترمہ تھیں اور آپا اماں ایک
معاہدے کے تحت اسے پال رہی تھیں۔

ہارون اس کی فیکٹری میں آیا تو وہ اُس سے نظر نہیں ملا رہی تھی۔ اُس کی پُر اعتماد بے باک
شخصیت ہل کر رہ گئی تھی۔

مشعل۔ میرے امی ابو اور اماں جی تمہارے گھر آنا چاہتے ہیں' تمہارے رشتے کے لیے۔

"میرا تم سے نہ کوئی رشتہ تھا اور نہ کبھی بن سکتا ہے۔" وہ پھٹ پڑی بلکہ اُبل پڑی۔

"کیا ہو گیا ہے یار۔ کیا بات ہے۔ اتنی پریشان کیوں ہو؟"

ہارون کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی' اُس پر کیا قیامت بیت گئی تھی۔

"کیا میری جسارت بُری لگی ہے؟" اس کا چہرہ دھواں ہو گیا تھا۔ اسے مشعل سے ایسے
ردِ عمل کی توقع نہیں تھی۔

"ہاں۔" وہ بے رحمی سے بولی اور پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سفاکانہ بولتی چلی
گئی۔

"میں نے تم سے مستقل تعلق استوار کرنے کا کبھی نہیں سوچا۔ تم میرے آئیڈیل پر پورے
نہیں اُترتے۔"

"کیا ہے تمہارا آئیڈیل؟" وہ ہونٹ کاٹنے لگا۔

"جو بھی ہے تم بہر حال نہیں ہو۔ آئندہ میری راہ میں نہ آنا اور مجھ سے رابطہ کرنے کی کوشش
نہ کرنا۔" اُس نے جیسے ہارون کے لیے پھانسی کی سزا سنا دی تھی۔

"تم ہوش میں تو ہو۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں۔" وہ سخت پریشان ہو گیا تھا۔ "مجھے تم ٹھیک نہیں لگ
رہیں۔

"مجھے جو روگ لگا ہے' وہ تا زندگی ٹھیک نہیں ہوگا۔ بہتر ہے کہ تم اپنی دنیا میں لوٹ جاؤ۔
ہارے دل میں میرے لیے ذرا سی بھی جگہ ہے تو دوبارہ میرے سامنے مت آنا۔"

اور پھر اُس نے ایک نئے عزم کے ساتھ "ادارۂ اطفال" قائم کیا تھا۔ وہ ان بچوں کی
یاں کم کر کے دل کے رستے ہوئے ناسور کا کچھ علاج چاہتی تھی۔

کسی کے درد کا احساس صحیح معنوں میں تب ہوتا ہے' جب خود پر گزرتی ہے۔

"کس سوچ میں گم ہو؟" ہارون کے ٹہوکا دینے پر وہ عہد رفتہ کے پاتال سے چونک کر باہر
ی۔

"میں نے تمہیں رشتے کی نوعیت بتا دی تو تم مجھ سے نفرت کرنے لگو گے۔" وہ دل شکستہ سی
آواز میں بالآخر گویا ہوئی۔ "بس اتنا ہی سمجھتی ہو مجھے۔ ہارون نے شکوہ کناں نظروں سے
دیکھا۔

"میری بدقسمتی یہ ہے کہ میں نے اُس عورت کی کوکھ سے جنم لیا ہے۔"

"کیا؟" انکشاف کی تیز رو ٹرین اُس کے اعصاب کی پٹڑی پر گزر کر قیامت مچا گئی۔

کتنی ہی دیر تک قیامت کا سکون طاری رہا۔ ہارون کوشش کے باوجود اپنے تعجب پر قابو نہ پا
کا۔

"تم نے کبھی ذکر ہی نہیں کیا۔" اس کا لہجہ کھوکھلا اور پژمردہ تھا۔

"کون سا فخریہ اعزاز تھا جس کا ڈھنڈورا پیٹتی۔ میں نے تو اس راز کو خود سے بھی چھپا کر رکھا
ہے۔ خود سے کہتے ہوئے بھی حجاب آتا ہے۔" وہ وحشت زدہ سی تھی۔ آنکھوں میں طوفانی
بت بپا تھی۔

"کیا مینا گل نے تمہیں اپنی زبان سے بتایا ہے؟"

"نہیں' اپنی دانست میں وہ اور آپا اماں مجھ سے چھپائے ہوئے ہیں۔"

"اور تمہارا باپ۔"

"پلیز۔" مشعل کے کلیجے پر چھری سی چل گئی۔

"میرا خیال ہے' اس قسم کی نجی بات تمہارے کیس سے تعلق نہیں رکھتی۔ یوں بھی میں لاعلم
ں اور جاننے کی خواہش نہیں رکھتی۔"

"اس کا مطلب ہے' مینا نے شادی اس درجہ خفیہ رکھی کہ پریس تک بات نہ جا سکی۔" وہ خود

سے محو کلام اُس کی سمت سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

وہ دیدہ و دانستہ خاموش رہی۔ کیس کی نوعیت کے پیش نظر وہ رشتے کی نوعیت تو بتا
اس کی شرعی حیثیت کے بارے میں مر کر بھی ہارون کے سامنے اعتراف نہیں کر سکتی تھی۔

"تمہیں اتنا تو بہر حال پتا ہو گا کہ تمہارے والد صاحب اس وقت کہاں ہیں۔ کیا ان
طلاق ہو چکی ہے۔؟"

"وہ میرے بچپن میں ہی مر گئے تھے۔" مشعل کے پاس اس جھوٹ کے سوا کو
تھا۔

"ہوں۔ کیا تم کبھی مینا گل کی کوٹھی پر گئی ہو؟ اور کیا میڈم بانو کو جانتی ہو؟"

"نہیں۔ نہ مجھے ایسی خواہش پیدا ہوئی اور نہ مینا گل نے کبھی اصرار کیا ہے' اپنے
والوں سے ملاقات کے لیے۔"

"وہ تمہاری ماں ہے اور تم اتنی سہولت سے اسے مینا گل کے نام سے پکارتی ہو؟"
ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتا تھا جہاں خواتین کا احترام شرافت کی بنیادی شرط سمجھا جاتا

"وہ ماں نہیں ہے۔ نہ اس منصب کی مستحق ہے۔ وہ تو عورت بھی نہیں ہے۔" مشع
ہونٹ بھینچ کر تلخی سے کہا۔

"اب میں سمجھا۔" ہارون کا ذہین دماغ ایک لمحے میں حقیقت تاڑ گیا تھا۔ "اسی وجہ
نے چند سال قبل مجھے مایوس کیا تھا۔ شاید تمہیں بھی یہ انکشاف اچانک ہی ہوا تھا۔ مشعل تم
بھروسا تو کرتیں۔ مجھے بتایا ہوتا۔ کچھ کہا ہوتا۔ کہا اتنا بے حس اور سطحی سمجھا تھا مجھے۔ تم نے
تھا' شاید میں اور میرے گھر والے ایک فلم ایکٹریس کی بیٹی کو قبول نہ کریں۔ اس لیے مجھے خا
واپس لوٹا دیا۔ کیا مجھ پر اعتبار نہیں تھا۔ بے شک میں نے کبھی اپنے دلی جذبات کا تم سے اظہا
کیا مگر مجھے یقین تھا کہ جو کچھ ہم دونوں کے درمیان ہے اسے ہم بنا کہے سمجھتے ہیں۔ ہماری ر
براہ راست رابطہ ہے۔ جذبوں کی اپنی ایک زبان ہوتی ہے۔ اس کے لیے لفظوں کی ضرورت
پڑتی۔ میری سوچ یہ تھی کہ شرعی رشتہ قائم کرنے کے بعد تمہیں اپنی محبت کی انتہاؤں
روشناس کراؤں گا۔ اپنی وارفتگیوں کا شادی کے بعد اظہار کروں گا۔ جب تم تن من
دسترس میں ہو گی۔" وہ ہونٹ کاٹنے لگا۔

"پلیز ہارون۔" اس نے دوبارہ اسے ٹوک دیا۔ "وجہ کچھ بھی رہی ہو' بہر حال وہ معا

ا ہے۔ اب ماضی کی راکھ کریدنے سے تو...... کچھ فائدہ نہیں۔ بہتر ہو گا' ہم گزشتہ باتوں کو بیچ میں
ائیں۔" وہ خود پر قابو پا کر ضبط سے گویا ہوئی۔
اُس کی نظر جھکی ہوئی تھی "مجھ سے جہاں تک ہو سکا' تمہاری دلچسپی کی اطلاع فراہم کرتی
وں گی۔ اگر وہ دوبارہ میری کوٹھی پر آئی تو تمہیں خبر مل جائے گی۔"

پھر وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں چلتی ہوں۔ خدا حافظ!" وہ رُکے بغیر تیز تیز قدموں سے اپنی گاڑی کی طرف بڑھ
ئی۔

ہارون کی پُرسوچ نگاہ جاتی ہوئی مشعل پر جمی ہوئی تھی۔ مشعل بہت ریش ڈرائیونگ کرتے
ئے گھر کے راستے پر گامزن تھی۔ دل بھر بھر آ رہا تھا۔

"میں تمہیں کیسے بتاؤں' میرے ہم دم کہ میں کس بے نشانی کے عذاب میں مبتلا ہوں۔" وہ
یک ہاتھ سے گالوں پر برستے آنسوؤں کے موتی سمیٹ کر خود سے گویا ہوئی۔ "میری ذات ایک
ھے کنویں میں مقید ہے۔
یں ان دیکھے دائروں میں سفر کر رہی ہوں۔ ایک بے روح زندگی بسر کر رہی ہوں...... ہم
جیسوں کی نہ کوئی منزل ہوتی ہے نہ پڑاؤ...... ہم تو بے سمت مسافر ہیں۔"

اُس کا دل لہو لہو ہو رہا تھا۔

اذیت کا یہ سفر کتنا طویل تھا۔

سواد زندگانی میں۔
اک ایسی شام آتی ہے۔
جو خالی ہاتھ آتی ہے۔
کہ جس کے سرمئی آنچل میں۔
کوئی پھول ہوتا ہے نہ ہاتھوں میں کوئی تارہ
رگ و پے میں کوئی آہٹ نہیں ہوتی۔
نہ کوئی بھول پاتا ہے۔
نہ کوئی زخم سلتا ہے۔
گلے ملتا ہے کوئی خواب۔

نہ کوئی غم سلگتا ہے۔
تمنا ہاتھ ملتی ہے۔
سواد زندگانی میں۔
اک ایسی شام آتی ہے
جو خالی ہاتھ آتی ہے

☆☆☆

اس حادثے نے مینا گل کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اُس کا تو خیال تھا' یہ محض دھمکیاں ہیں اور دی ہی اس لئے جاتی ہے کہ عملی اقدام کرنا مقابل کے بس کی بات نہیں ہوتی مگر اس کی لا رنگ لے آئی تھی۔

اگرچہ وہ اب صحت یاب ہو چکی تھی' مکمل طور پر فٹ تھی مگر اس کے باوجود اس کے دل دہشت زائل نہیں ہو پا رہی تھی۔ پروڈیوسرز کی یقین دہانیوں کے باوجود وہ زیر تکمیل فلمو شوٹنگ میں حصہ نہیں لے رہی تھی۔

وہ ارباب تو اس دن کے بعد اس کی معیت سے ایسا بدکا تھا کہ رسماً بھی عیادت کے نہیں آیا تھا۔

مینا گل پر اُداسی اور رنجیدگی کا شدید دورہ پڑ گیا۔

اپنی تنہائی اور کھوکھلے پن کا پہلی بار شدت سے احساس ہوا تھا۔ اب تک تو وہ خود کو ب ملکہ تصور کرتی رہی تھی جسے دنیا کو اپنے قدموں میں زیر کرنے کا جادو آتا تھا۔

وہ خود کو ناقابل شکست اور آہنی چٹان سمجھتی تھی مگر اب وقت کے تند و تیز جھکڑوں نے ا آسمان سے زمین پر لا پٹخا تھا۔

احساس زیاں شدت سے اُس کی روح کچلنے لگا تھا۔

اگر اس کا اپنا ایک گھر ہوتا...... بچے ہوتے...... محبت کرنے والا خیال رکھنے والا جیون سا ہوتا تو کیا پھر بھی یونہی بے آسرا اور بے بس پڑی ہوتی......! کوئی اس کا خیال رکھتا' اس کے لی کرتا...... اس کی غذا' اس کے آرام پر توجہ دیتا۔

"کوئی تھا تو سہی...... مگر تم ہی نے اُسے راستے میں پڑے بے وقت پتھر سے زیادہ اہمیت دی تھی۔ ٹھوکر مار کر چمکتی دمکتی روشن منزلوں کی ہوس میں آگے بڑھتی چلی گئی تھیں......"

اُس کے اندر سے کوئی گمشدہ ملال شکوہ کناں ہوا تھا۔

"علی مراد نے کس کس طرح اپنا دل تمہارے قدموں میں بچھایا تھا! تمہیں پلکوں پہ بٹھایا تمہاری پرستش کی تھی۔ تمہاری خوشیوں کے لئے خود کو مٹایا تھا۔"

وہ کالی چمکدار زلفیں دونوں ہاتھوں کی مٹھیوں میں جکڑ کر بے چین سی ہو کر اُٹھی۔

"تم نے ہی قدر نہ کی......" گزرتے لمحے نے تلخی سے سرگوشی کی تھی۔ اُس نے سرد آہ ا۔

"نہ جانے کیوں آج وہ لوگ بھی یاد آ رہے ہیں جنہیں ماضی کے قلعے میں دفن کر کے بے ں کے قفل لگا بیٹھی تھی۔"

"میڈم۔ شیخ صاحب نے ڈی ایس پی صاحب سے بات کر کے آپ کے لئے پولیس گارڈ ندوبست کر دیا ہے۔ انہوں نے پوری تسلی کروا دی ہے کہ آپ پولیس کے پہرے میں شوٹنگ لئے آئیں جائیں گی۔ اب کیا حکم ہے......؟" گنجا تجربے کار سیکرٹری دستک دے کر اچانک اخل ہوا تھا۔ مینا گل نے خالی خالی کوفت بھری نظروں سے اُس کی سمت دیکھا۔

"پولیس مجھے قضا کے ہاتھوں سے تو نہیں بچا سکتی۔ گولی اندھی ہوتی ہے اور اُس کو پولیس کی ا سے خوف بھی نہیں آتا۔"

اس کے استہزائیہ لہجے پر وہ پریشان سا ہو گیا۔

"میڈم بانو نے کئی مرتبہ فون کیا تھا آپ اس وقت آرام کر رہی تھیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ اپنی ا اور غذا کا مکمل دھیان رکھیں اور کسی چیز کی ضرورت ہو تو ضرور بتائیں......"

"جانتی ہوں میں...... میرے حسن و صحت کے بارے میں وہ فکر مند نہیں ہوں گی تو کیا ہاتھی لے ہوں گے......؟" وہ دلبرداشتہ ہو کر بولی۔ لہجہ طنز سے معمور تھا۔ سیکرٹری چپ چاپ بغور کے تاثرات کا جائزہ لیتا رہا۔ بولا کچھ نہیں۔

نہ جانے کیوں مینا کا دل ہر چیز سے' ہر کام سے اُچاٹ ہو رہا تھا۔

"وہ ہارون احمد پہلے بھی دو دفعہ چکر لگا چکا ہے۔ ابھی بھی موجود ہے' لاؤنج میں بٹھایا ہے۔ یا تو بھیج دوں......؟" اسی لمحے عذرا نے مداخلت کی تھی۔

"اوہو...... ایک تو یہ صحافی جان کو آ گیا ہے۔" وہ چڑچڑے پن سے بولی۔ "خیر بٹھاؤ ے تھوڑی دیر ندر بھیج دینا۔" پھر وہ حکم کے منتظر سیکرٹری کی جانب ناگواری سے متوجہ

ہوئی۔ ''ٹھیک ہے۔ پرسوں کا کوئی وقت طے کر لیجئے شیخ صاحب کے ساتھ۔ جان کو چرنے
بھگتانے تو ہیں۔''

اس کا لہجہ چیخ گیا۔ سیکرٹری ایک گہری متفکرانہ نگاہ اس پر ڈال کر سر ہلاتے ہو
گیا۔

تھوڑی دیر بعد ہارون اُس کے کمرے میں موجود تھا۔

''کیا حال چال ہیں آپ کے۔ کیسا محسوس کر رہی ہیں......؟'' اس کا سادہ سا لہجہ
ٹٹولتا ہوا لگا۔

''محسوسات کی بات نہ کرو۔ انہیں کون دیکھتا ہے۔ یہاں صرف شکل کی چمک دمک
کے تناسب پر نگاہ رکھی جاتی ہے۔'' وہ بے دلی سے گویا ہوئی۔ ہارون نے بھرپور نظر اُس
ہلکی سبزی شرٹ میں بکھرے کالے چمکیلے بالوں کے ہالے میں اس کا زرد چہرہ سرسوں
ہوئے پھول کی طرح لگ رہا تھا۔ سنہری آنکھوں میں تھکن' بیزاری اور نقاہت کے رنگ۔
'واقعی میں نے کبھی غور ہی نہیں کیا۔ کتنے ملتے ہیں نقوش...... مشعل سے بہت
ہے۔'

''آپ پر اتنا بڑا سانحہ ٹوٹا ہے۔ کسی قریبی رشتے دار کو کیوں نہ بلوا لیا......'' وہ کرید

''آپ کے قریبی رشتے دار ہیں ناں......'' اس کی پیشانی پر لکیریں بچھنے لگیں۔

''میڈم بانو کی موجودگی میں کسی اور کی کیا ضرورت۔''

ہارون نے محسوس کیا کہ اُس کے لہجے میں طنز اور استہزا تھا۔ وہ محتاط اور چوکس ہو گ
ہے' یہ ''کھلنے'' کے موڈ میں ہو اس سے پہلے یہ ایسی ٹوٹی ہوئی' ترسی ہوئی بیزار کن کیفیت
نہیں آئی تھی۔

''کوئی تو ہوگا آپ کا اپنا' ماں باپ' بہن بھائی' جیون ساتھی' اولاد۔'' اس نے دانس
داغا تھا۔

''تم کون ہوتے ہو پوچھنے والے۔ کہاں کے ٹھیکدار لگے ہو......'' وہ ایک دم آ
ہو گئی۔ اُس کا بھڑکنا فطری امر تھا۔

''آپ کو اتنا غصہ کیوں آ رہا ہے' میرے سوال پر......؟'' وہ محظوظ ہوتے ہوئے بڑ
معصومیت سے گویا ہوا۔

''تم'' اس نے غصب کی شدت سے کانپتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر قریب پڑا گلدان
پر دے مارا۔

وہ پھرتی سے ہٹ کر وار بچا گیا۔

''ارے' کمرے سے بھگانا ہے تو ویسے ہی کہہ دیجئے۔ تخریبی کارروائی کیوں کر رہی ہیں
؟'' وہ بڑے مطمئن انداز میں مسکراتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھا تھا۔ ''میں پھر آؤں
......'' اس نے گویا ڈرا کر مزہ لیا۔ ''آپ حقائق کا سامنا کرنے کی تیاری کریں مادام......''

وہ باہر نکل گیا۔

''اوہ خدا......'' مینا گل کا جی چاہا' کسی شیشے سے سر پھوڑ لے۔ ''کس طرح کلیجے پر چھریاں
اہے یہ لونڈا۔ مجھے میڈم بانو کو آگاہ کرنا ہی پڑے گا......''

اپنا اشتعال قابو میں کرنے میں اُسے بڑی دیر لگی تھی۔

''ہیلو...... مشعل سے بات کرا دو'' اس نے نہ جانے کس جذبے کے تحت نمبر ملایا تھا۔

''بھئی کون ہے دلشاد۔ پوچھ تو لیتیں کم از کم......'' اس کی خوبصورت' سنجیدہ و باوقار آواز
یور کے پاس آتی محسوس ہو رہی تھی۔ مینا گل کے دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں۔

''ہیلو۔ السلام علیکم......'' وہ میٹھی شہد آگیں آواز کان کیا پڑی' سوکھے دھانوں میں جان پڑ
ا۔

''کیا حال ہے بیٹا۔'' وہ بے اختیاری کی سی کیفیت میں بول پڑی۔

''آپ کون......؟'' اُس کے استفسار پر مینا گل کو افسوس لاحق ہونے لگا۔

''مجھے نہیں پہچانتیں بے بی!......'' وہ دھیمی پڑ گئی۔ لہجے میں ملال تھا۔ ''میں مینا گل بات کر
ی ہوں۔''

جواب میں دوسری طرف سناٹا چھا گیا۔

''کیا تمہیں بُرا لگا میرا فون کرنا......؟'' مینا اپنائیت سے گویا ہوئی۔

''مجھے اچھے بُرے کی تمیز نہیں ہے میڈم...... ہم جیسوں کی بصارت اور بصیرت دونوں
ناقابل اعتبار ہوتی ہیں۔''

اُس کا خشک کھردرا' زہر میں بجھا لب و لہجہ مینا کے دل میں شگاف ڈالنے لگا۔

''تم مجھ سے ناراض کیوں رہتی ہو بے بی......!'' وہ لب کاٹنے لگی۔

"میرا آپ سے کیا رشتہ ہے مادام۔" مشعل کا چبھتا ہوا استفہامی انداز اُسے چکرا گیا

"بھئی......وہ تم راشدہ کی بیٹی ہو اور......" وہ ہکلانے لگی۔

"اچھا......" اُس کی ہنسی میں گہرا طنز تھا۔ "اپنے دل سے پوچھ کر بتائیں' میں کر
ہوں......؟"

مشعل کے بدلے ہوئے تیور مینا کے اوسان خطا کرنے لگے۔

"کون ہے مجھے جنم دینے والا۔ کس کے گناہ کا بیج ہوں میں۔ کس پیڑ سے پھوٹی ہو
ہوں......کس سے ملتے ہیں میرے نقوش......" وہ چیخ گئی۔

مینا کے جسم و جاں سے جیسے کسی نے خون نچوڑ لیا تھا۔

"بیٹی......" بے اختیار اُس کے لب کانپے۔

"مت لیجئے' یہ مقدس نام اپنی زبان سے۔ رشتوں کی تقدیس کا انسانیت کی تذلیل
والوں کو کیا احساس......" وہ زہریلی ہو رہی تھی۔ لہجہ بالکل سرد اور سپاٹ تھا۔

"مشعل......میری بات سنو......" وہ ہارے ہوئے انداز میں بصد منت گویا ہوئی۔ "
شاید کوئی غلط فہمی......"

"ہاہاہا......واہ میڈم......تقدیر کی ستم ظریفی کو غلط فہمی کا نام دے کر مذاق تو نہ اُڑائیے۔
اس کا حرف حرف زہر سے بھرا تھا۔ مینا کی ٹانگیں بے جان ہونے لگیں۔ "تو کیا مشعل
گئی ہے' میرے اور اپنے رشتے کے متعلق......؟" اس کا دل ڈوبنے لگا۔

"صرف یہ بتا دیجئے' آپ کے ہمراہ کون شامل تھا۔ لذت کی گھڑیاں سمیٹنے کے لئے۔
رگوں کا گندہ خون میرے بدن میں دوڑ رہا ہے۔" مشعل کا لہجہ خود اپنی بے بسی پر دھاڑیں ما
رہا تھا۔

مینا گل کا دل سہار نہ سکا۔ اُس نے بے اختیار سنسناتے ہوئے دماغ کے ساتھ فون کریڈ
ڈال دیا اور دونوں ہاتھوں سے چکراتا ہوا سر تھام لیا......

اُس کی ذات جیسے کسی کٹہرے میں کھڑی ہو گئی تھی اور وہ لاجواب ہوئی جا رہی تھی۔

☆☆☆

شام ڈھلتے جب پنچھی اپنے گھر کو جاتے ہیں
کوئی مجھے بتلائے کیوں مجھ کو تڑپاتے ہیں

میں نے بھی اک سپنا دیکھا تھا اپنے گھر کا
بھول نہ جائے میرا پنچھی لیکن مجھ کو ڈر تھا
میرا پنچھی رستہ بھولا' پاگل ہے انجانا ہے
تو کیا ہے تو......
میں نے جانا ہے......
میرا دل اب بھی تیرا دیوانہ ہے
ان کتابوں میں جی نہیں لگتا
مجھ کو بجنی کی یاد آئی ہے
بھیگا بھیگا سایہ دسمبر ہے
بھیگی بھیگی سی تنہائی ہے

وہ بڑے جذب کے عالم میں صحن میں بیٹھا ایزی چیئر پر نیم دراز فائل سینے پر ٹکائے آنکھیں موندے ابرار الحق کے گانے کے بولوں میں گم تھا۔ صرف دائیں پاؤں کا ہلتا ہوا انگوٹھا اُس کی بیداری کی نشاندہی کر رہا تھا۔

صغریٰ چچی کے ٹیرس پر ریلنگ کے ساتھ کھڑی افراح' ہارون کی محویت کو محسوس کر چکی تھی۔

بے اختیار اُس کے لبوں سے آہ نکل گئی۔

دل میں عجیب سی کسک' بے چینی اور یاسیت جاگی تھی۔

"کتنی خوش نصیب ہو تم مینا......کتنا پاکیزہ و مصفا اور شاندار شخص تم پر مرتا ہے۔ تمہارے لئے بے چین پھرتا ہے......تمہیں سوچتا ہے' چاہتا ہے......تمہاری طلب کرتا ہے......"

ان دیکھے آنسو اُس کے قلب پر گر رہے تھے۔

اُف ان مریدوں کے ہاتھ سے کچھ بھی نہیں بچتا۔ لو بتاؤ' میں نے صبح صبح گجریلا بنا کر فریج میں محفوظ کیا تھا۔ دو بڑے بڑے ڈونگے بھر کر بنائے تھے۔ سارا ٹھونس گئے' بمشکل ایک پلیٹ بچی ہے۔ اے بیٹی! ذرا بھاگ کر ہارون کو دے آنا ورنہ یہ بدنیت قوم اسے بھی ڈکار جائے گی۔"

صغریٰ چچی حلق تک بیزار ہو کر اُس تک پہنچی تھیں۔

وہ رواداری سے مسکرا کر پلیٹ ہاتھ میں لئے نیچے اُترنے لگی۔ ایسے ہنگامے یہاں معمول کی کارروائی سمجھے جاتے تھے۔ افراح کا تو یہاں ایسا دل لگا تھا کہ حج کے بعد والدین لینے آئے تو

ٹھنک کر مزید رکنے کے لئے اصرار کر دیا۔ امی ابو نے پس و پیش کے بعد اجازت دے دی تھی
ماحول سے نکلنے کو دل نہیں مانتا تھا۔ اس نے یہاں اپنائیت، خلوص اور بے تکلفی کی ایسی دھنک
دیکھی تھی کہ اب خود بھی پور پور اس میں رنگ گئی تھی۔ وہ اس سحر سے آزاد نہیں ہونا چاہتی تھی۔

"ہارون بھائی! گجریلا لے لیجیے......" آہستگی سے مخاطب ہونے والی نرم و پُر تکلف آواز
ہارون چونک کر سیدھا ہوا تھا۔

"شکریہ......" اس نے ایک اُچٹتی ہوئی نگاہ اُس پر ڈال کر پلیٹ تھام لی۔

"لگتا ہے آپ کو ابرار الحق بہت پسند ہے۔" وہ یونہی بلاوجہ اُس سے مخاطب ہوگئی۔

"ہوں...... مگر میں نام سے زیادہ کام کے معیار کو پسند کرتا ہوں۔ اچھی چیز کسی منجھے ہو
شخص نے بنائی ہو یا نو آموز نے۔ اسے نام دیکھے بغیر پوری سچائی سے سراہنا اور قبولنا چاہیے۔
بولا۔ "تم پھپھو کے ساتھ نہیں گئیں......؟" اچانک ہی اسے خیال آیا تھا۔

"نہیں......" وہ سر جھکا کر پاؤں کے انگوٹھے سے زمین کی گھاس کریدنے لگی۔

"مگر کیوں......؟" اسے اچنبھا ہوا۔

"کیا آپ کو میرا قیام بُرا لگتا ہے۔؟" اس نے شاکی نظروں سے دیکھا۔

"ارے نہیں......" بے ساختہ انداز میں کہتے ہوئے ہارون نے یونہی اُڑتی پڑتی نگاہ اُس
ڈالی تھی۔

"وہ بھی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ نظر ملی اور پل کر جھک بھی گئی مگر ہارون کے دل کی
تہہ و بالا کر گئی۔ وہ بھونچکا سا لق دق کھڑا رہ گیا تھا۔ افراح کی آنکھوں میں کیا تھا۔ نارسائی کا کر
......لا حاصلی کے رنگ، ملال، رنجیدگی، احساس شکست، بے بسی اور شکایت۔

بھلا وہ ان رنگوں اور احساسات کی تہہ تک کیوں نہ پہنچتا۔

وہ بھی تو اسی کرب سے گزر رہا تھا۔

انہی احساسات سے دوچار تھا۔

"تو کیا افراح بھی چاہ کی اس دلدل میں گردن تک دھنس چکی ہے......!"

اس انکشاف نے اس کے ہوش اُڑا دیئے تھے۔

وہ بُری طرح حواس باختہ ہوگیا تھا۔

اس نے دوبارہ جانچتی ہوئی نظر سے افراح کا جائزہ لیا۔ معصوم نوخیز کلیوں کا سا پاکیزہ اور

جاذب نظر حسن تھا، وہ حال ہی میں بی اے کا...... امتحان دے کر فارغ ہوئی تھی۔

بیس سالہ سرتاپا مرصع دوشیزہ کا حسین سراپا کسی بھی ہوش مند شخص کے دل پر کمندیں ڈال کر
ے زیر کر سکتا تھا۔ دلربائی کی ساری ہی ادائیں اُس میں موجود تھیں۔

"اگر ہارون، مشعل کے شعلۂ جوالہ زہد شکن قاتل سراپے کا اسیر نہ ہوا ہوتا تو یقیناً افراح
ے تسخیر کر سکتی تھی۔

"میں تمہارے لئے کچھ نہیں کر سکتا اچھی لڑکی...... بہتر ہوگا اپنی پرانی راہوں پر واپس لوٹ
۔" ہارون کا دل چاہا اُسے کہہ دے مگر وہ دانستہ چپ رہا۔

جب ادھر سے کوئی ڈیمانڈ، کوئی طلب کوئی سوال نہیں ہے۔ محبت کو بے وقار اور بے حرمت
نے کے لئے کوئی قدم نہیں اُٹھایا گیا تو اُسے کیا حق پہنچتا تھا اُس کے دل کے نہاں خانے میں
موتی سے جذبوں کو عریاں کرنے کا۔ جواب تو تب دیتا، جب وہ اُس سے مانگتی۔

وہ تو مانند دیوار چپ تھی۔

کوئی تقاضا، کوئی اصرار لبوں کے گوشوں سے مس نہ ہوا تھا۔

"اے بچے...... کتنے عرصے سے یہ چھوٹی قوم شور مچا رہی ہے۔ اسلام آباد اور مری کی سیر
لئے۔ میں کہتی ہوں، اس بار تو لے ہی جاؤ میرے بچے...... افراح بھی یہیں ہے۔ اس بہانے
کی بھی تفریح ہو جائے گی پھر موسم بھی ہے...... حارث اور توقیر نے جان نکال لی ہے، برفباری
لینے کی فرمائش کر کے......" اماں جی لشتم پشتم صحن میں تشریف لائی تھیں۔ غالباً تازہ تازہ "چھوٹی
م" کے نرغے سے باہر نکلی تھیں۔ یقیناً انہوں نے ناطقہ بند کر کے ہارون بھائی سے بات کرنے کا
البہ منوایا ہوگا۔ وہ جانتے تھے کہ ہارون، اماں جی کی بات نہیں ٹال سکتا۔ وہ مسکرا دیا۔

"ٹھیک ہے، اماں جی...... اُنہیں کہہ دیں، تیاری کر لیں۔ پرسوں چلے چلتے ہیں۔ پہلے
رے فلیٹ پر عارضی قیام ہوگا۔ وہاں سے جہاں چاہیں، گھوم آئیں۔"

☆☆☆

"اوہ گاڈ۔ کتنی ویک ہوگئی ہو ڈارلنگ۔ مجھے تمہاری بہت فکر تھی۔ بس اسلام آباد کی
روفیات نے باندھ رکھا تھا۔ خیر میں نے بھی آئی جی صاحب سے کہہ کر شدت پسند تنظیم کے
ارکان کے خلاف رپورٹ درج کروا دی ہے۔" میڈم بانو دلار سے اُس کے بیڈ کے پاس بیٹھی
لہرا رہی تھی۔ "مسیتھ اکبر کتنے عرصے سے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ کہہ رہا تھا، میڈم سے ضرور ایک

ملاقات کا ٹائم لے دیں۔ یقین کریں' میں اُن کی ہر ڈیمانڈ پوری کر دوں گا مگر میں ٹالتی رہی پھر زخمی ہو گئیں۔ ابھی کل پھر اُس نے مجھے فون کر کے خوشامد کی۔" مینا اس کی خصوصی لاہور آمد متفکر انداز کا سبب جان گئی۔ اس کے لبوں پر استہزائیہ مسکراہٹ کھیلنے لگی تھی۔

"میری مانو تو تم شادی کر کے بیٹی کو پالو۔ کل کو تمہاری جگہ سنبھالے گی۔ تمہارا بڑھاپا سنوار دے گی۔ کتنا کہا تھا کہ خفیہ طور پر ایک آدھ شادی میں حرج نہیں ہوتا۔ تم کر لو تا کہ بیٹی کی صورت میں اپنا نام اور مقام آگے بڑھا سکو۔ اب اگر تمہاری کوئی بیٹی ہوتی تو کتنی بے فکری رہتی۔"

وہ روانی سے کہہ رہی تھیں اور مینا گل کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا اور ایک جا رہا تھا۔

'شکر ہے خدایا۔ یہ مشعل کے وجود سے لاعلم ہے۔'

وہ دل ہی دل میں خدا کی مشکور ہو گئی۔ وہ اس بااختیار اور بارسوخ عورت کو بخوبی پہچانتی تھی۔ میڈم بانو چاہے تو پاتال سے بھی بندہ برآمد کروا سکتی ہے۔

"وہ ہوتی بھی تو شاید میں اُسے اس فیلڈ میں نہ لاتی۔" وہ براہ راست کہنے کی جرأت تو نہ رکھتی تھی تاہم دبے انداز میں اپنا نکتۂ نظر بتا گئی۔

"خیر......" میڈم نے بھی تجاہل عارفانہ سے بات ختم کر دی۔ "مینا ڈیئر' میرا خیال ہے' شوٹنگ میں حصہ لینا شروع کر دو۔ خواہ مخواہ نقصان ہوگا اور پھر تمہاری غیر موجودگی میں دوسری ہیروئنوں کو پر نکالنے کا موقع مل جائے گا۔ ویسے بھی ان دنوں بڑی تیزی سے شہرت کا گراف اوپر کر رہی ہے۔ اس سے ہوشیار رہو۔"

"جی میڈم" وہ سعادت مندی سے بولی مگر اس کا ذہن کہیں دور اُلجھا ہوا تھا۔ "آپ بے اکبر کو ٹائم دے دیں۔ میں اسے "ڈیل" کر لوں گی۔" اس نے تھکے ہوئے انداز میں سر بیڈ کی پشت پر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔

☆☆☆

"دیکھو بھئی......زیادہ دور نہیں نکل جانا۔ اسلام آباد کے آس پاس ہی رہنا۔ کہیں راستہ بھول جاؤ۔ حارث' دھیان سے جیپ چلانا اور شام تک واپس لوٹ آنا۔ مجھے ڈپٹی ڈائریکٹر صاحب نے طلب نہ کیا ہوتا تو ضرور ساتھ چلتا۔"

"آپ فکر ہی نہ کریں' بڑے بھائی......" حارث نے بے فکری سے گاڑی کی چابی ہوا میں اُچھالی۔ "ہمیں تین دن ہو گئے ہیں' یہاں آئے ہوئے۔ آپ نے اتنا گھمایا ہے کہ اب سب

راستے ازبر ہو چکے ہیں۔"

"بھائی جان' یہ زیادتی ہے' اصولاً گاڑی چلانے کی ذمے داری مجھے سونپی جانی چاہیے۔" راشد ملول خاطر سا تھا۔

"کیوں......میں مر گیا ہوں کیا......" توقیر جیسے صدمے سے نڈھال ہو گیا۔

"اوہو......لڑنے مرنے پر کیوں تُل گئے ہو۔ جس کو بھائی نے نامزد کیا ہے' وہی گاڑی چلائے گا......" اسماء نے تصفیہ کروانا چاہا۔

"ہاں تم تو حمایت کرو گی۔ نصف بہتر جو ٹھہریں۔" راشد برافروختہ ہوا۔ اسماء کا چہرہ سُرخ پڑ گیا۔ ہارون اُس دوران شیو کا سامان لے کر باتھ روم میں بند ہو چکا تھا۔

"اوئے' میری منگیتری کو کچھ مت کہنا ورنہ میرے سے بُرا کوئی نہیں ہوگا۔"

"وہ تو اب بھی نہیں ہے۔" حارث کے للکارنے پر راشد نے ہاتھ جھاڑے۔

"کیا صبح صبح مہابھارت شروع کر لی ہے۔؟" طیبہ نے ناک بھوں چڑھا کر ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔

اسی لمحے فلیٹ کے بیرونی دروازے پر بیل ہوئی۔ حارث باہر لپکا۔

"جی فرمایئے۔" ایک حسین صورت دوشیزہ سنجیدہ تاثرات چہرے پر سجائے متذبذب سی حارث کی شکل دیکھ رہی تھی۔

حارث بھی صحیح معنوں میں چکرا گیا۔ "مونث قسم کی چیزوں سے ہارون بھائی کا کیا واسطہ......!"

"کیا یہ ہارون صاحب کا فلیٹ نہیں ہے......؟" اُس کی آواز میں نغمگی' وقار اور آہستگی کے ساتھ ساتھ اُلجھن بھرا استفسار تھا۔

"جی ہاں......" اس نے سٹپٹا کر اثبات میں جواب دیا پھر گومگو کے عالم میں اُس کی جانب دیکھنے لگا' جیسے مدعا جاننا چاہتا ہو۔

"اُن کو بلا دیجیے۔" لڑکی کے چہرے پر اطمینان جھلکنے لگا۔

"جی آپ کا اسم گرامی۔" وہ فوراً چوکنا ہوا۔

"مشعل......" مختصر جواب آیا۔

"اس کے آگے پیچھے کچھ نہیں......" بے اختیار اُس کی زبان سے پھسل پڑا۔ جواب میں

مشعل نے اسے یوں دیکھا جیسے ذبح کیے جانے والی مرغی دم آخر تڑپتی ہے۔ وہ گھبرا گیا۔

"میرا مطلب ہے پورا نام کیا بتاؤں......"

"بس اتنا ہی ہے میرا نام۔" اس کا لہجہ سرد تھا۔

"جی آپ پلیز اندر آجایئے۔" حارث کو اُس کی آنکھوں اور لہجے کے گمبھیر بے فیصلے تاثرات سے خوف سا محسوس ہوا۔

وہ اس کی معیت میں اندر آ گئی۔

وہ سب لوگ حارث کے ہمراہ ایک جیتی جاگتی لڑکی کو دیکھ کر گنگ ہو گئے۔

"یہ...... یہ......ان کی تعریف......" توقیر نے ہکلا کر دریافت فرمایا۔

"مس مشعل۔" حارث نے بڑے رعب سے جواب دیا پھر مشعل سے بیٹھنے کی درخواست کی۔

"بھائی جان کو بلاؤ۔ انہیں اُن سے ضروری کام ہے۔" حارث نے توقیر سے کچھ حاکمانہ کہا۔

توقیر کھا جانے والی نظروں سے اُسے دیکھتا ہوا اندر چلا گیا۔

"کیا آپ بھائی جان کے محکمے میں کام کرتی ہیں۔؟"

اسماء اُس کے قریب آ کر دلچسپی سے پوچھنے لگی۔ افراح بھی بغور اُس کا جائزہ لے رہی تھی۔ مشعل کی صورت میں عجیب ملاحت، نرمی اور اُداسی کا امتزاج تھا۔ جیسے بہت تھکی تھکی ہو۔

"نہیں۔" اس نے کچھ توقف کے بعد جواب دیا۔

"بس کچھ معلومات فراہم کر دیتی ہوں۔ میں گارمنٹ فیکٹری چلاتی ہوں۔ اس کے علاوہ لاوارث بچوں کا ادارہ کھولا ہوا ہے۔"

"ہیں سچی سے......اُف آپ کتنی اچھی ہیں۔" طیبہ نوخیز لڑکی بے اشتیاق سے بولی۔

مشعل مروتاً مسکرائی۔ اس کو یہ شرارتی، کچھ مؤدب اور کچھ چلبلے سے لڑکے لڑکیاں اچھی لگی تھیں۔

"ارے آپ!" ہارون لائٹ گرین شرٹ اور بلیک پینٹ میں گلے میں سفید تولیہ لٹکائے توقیر کے ہمراہ اندر آیا تھا۔

اسے دیکھ کر وہ بیک وقت متحیر اور مسرور تھا۔ افراح نے اُس کے تاثرات محسوس کر لئے تھے۔

"خیریت تو ہے ناں......!" اگلے ہی لمحے وہ سنجیدہ ہو گیا تھا۔ مشعل اس سے پیشتر کبھی ں نہیں آئی تھی۔

"جی ہاں۔ آپ کے کام کے سلسلے میں کچھ باتیں ڈسکس کرنا تھیں۔" وہ تذبذب سے ے دیکھنے لگی۔ "آپ شاید مصروف ہیں۔" اس کا اشارہ اس جمگھٹے کی طرف تھا۔

"بالکل بھی نہیں۔" اس نے اطمینان سے ہاتھ جھاڑے پھر حارث لوگوں کی طرف مڑا۔

"تم لوگ چلنے کی تیاری کرو۔ اسماء اچھی سی چائے اور یقیناً ناشتہ بھی۔" ہارون نے اس کی ت دیکھا۔

"ارے نہیں، نہیں۔" اس نے جلدی سے کہا۔ "میں ناشتا کر کے آئی ہوں۔ آپ آرام ،ناشتا کریں۔ میں نیچے اپنی گاڑی میں بیٹھی ہوں۔" وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"پلیز بیٹھیے نا آپ......افراح اس پُراسرار ساحرانہ حسن میں جیسے کوئی مماثلت تلاش کر رہی ا،اسے یہ لڑکی اچھی لگی تھی۔ پُروقار، پُرتمکنت اور حسین شخصیت کی مالک۔

"بہت بہت شکریہ بے بی......" اس نے نرمی سے افراح کے گال تھپتھپائے اور اپنا بیگ ٹھالیا۔ "مجھے کچھ جلدی ہے۔"

"آپ دوبارہ آئیں گی نا......؟" طیبہ نے اشتیاق سے پوچھا۔

جواب میں وہ صرف مسکرا دی۔ ایک روادارانہ مسکراہٹ۔

"ان کی صورت دیکھی دیکھی لگ رہی تھی۔ ہے نا......" مشعل کے جانے کے بعد اسماء نے ئے کھوئے انداز میں حاضرین سے تائید چاہی تھی۔

"ناشتہ بھائی جان۔" طیبہ نے ہارون کے سامنے ڈھیر ساری چیزیں رکھ دیں مگر اُس نے ف چائے کا کپ لیا اور جلدی جلدی ختم کر کے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس کا موڈ یک بیک خوشگوار ہو گیا جسے سب نے محسوس کیا تھا۔

"ارے ناشتا تو مکمل کر لیں آپ۔" طیبہ نے توجہ دلائی۔

"بس کر لیا۔ مشعل انتظار میں ہوں گی۔" وہ عجلت میں دیوار گیر آئینے کی طرف مڑا اور بال ٹ کرنے لگا۔

"زیادہ دیر نہیں لگانا۔" اُس نے دوبارہ انہیں تاکید کی تھی۔

"جی بھائی جان۔" حارث نے بے مثال فرمانبرداری کا مظاہرہ کیا۔

"بھائی جان! آپ دوبارہ مس مشعل کو مدعو کیجئے گا ہمارے قیام کے دوران......" راشد بولا
ہارون مسکرا دیا۔ بہت دلچسپی اور دلکشی سے۔

"وہ اتنی فارغ نہیں بیٹھتیں جو اونگوں بونگوں سے ملتی پھریں۔"

"نہیں ناں...... پلیز بھائی جان......" طیبہ ٹھنکی۔

"کتنی سلجھی ہوئی اور شاندار خاتون ہیں۔ کیا مقناطیسی چہرہ ہے جو دیکھے کھنچا چلا جائے۔ کی شادی ہو چکی ہے کیا......؟" توقیر نے کچھ سوچ کر ہارون سے دریافت کیا۔

سب کی ہنسی چھوٹ گئی۔

"اگر بالفرض نہیں ہوئی تب بھی تمہارا کوئی چانس نہیں بنتا۔ تم سے تو کئی سال بڑی گی۔"

"میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" حارث کی شرارتی پھبتی پر توقیر کا چہرہ غصے اور خجالت سے ہو گیا۔

"شرارت نہیں۔" ہارون نے ہاتھ اُٹھا کر دونوں کو تنبیہہ کی۔ "او کے خدا حافظ۔" جھڑک کر وہ عجب ترنگ سے مڑا اور مسرور قدموں سے باہر نکل گیا۔

"وہ حقیقتاً بہت خوش تھا۔ مشعل اُس کے گھر آئی تھی۔ اُس سے بذات خود بات کرنا چا تھی۔ اُس کی منتظر تھی۔ بھلا اس سے بڑھ کر ہارون کی خوش قسمتی اور کیا ہو سکتی تھی۔

وہ تیز تیز سیڑھیاں پھلانگتا نیچے آیا۔ جہاں اس کی روح کی روشنی اس کے دل کی مکین زندگی اسکا انتظار کر رہی تھی۔

☆☆☆

دیکھو بھئی، گاڑیوں کا رش ہے جگہ نئی ہے اور ہم لوگ تعداد میں کافی زیادہ ہے۔ اس اپنی حفاظت آپ کے اصول کے تحت خود ہی دھیان رکھنا۔ گاڑی کا بھی اور راستوں کا بھی۔ میں ذمے دار نہیں ہوں گا۔ ابھی بارہ بج رہے ہیں۔ ایک گھنٹہ اِدھر اُدھر پھر کے شاپنگ کر مرضی کرو ٹھیک ایک بجے سب خود بخود جیپ کے پاس آ جانا۔ مجھے ڈھونڈنا نہ پڑے۔ یہاں ہم دامن کوہ چلیں گے۔ اگر بالفرض کوئی رہ جائے تو خود ہی عقل مندوں کی طرح دامن کو جائے۔

آخری جملہ یقیناً مذاق ہی تھا۔ یہ وہ ہدایات تھیں جو حارث نے سپر مارکیٹ کے آگے"

کی شاپ کے پاس گاڑی پارک کرتے ہوئے سب کو سنائی تھیں۔

"تم چھوڑ کے تو جاؤ ایک دفعہ...... ہارون بھائی سے اُلٹا نہ لٹکوایا تو راشد نام نہیں۔" راشد نے منہ پھیر کر دھمکی دی۔

"بھئی! میں نے کہہ دیا ہے۔ ریوڑ جمع کر کے ہانکنے کی ذمے داری ہارون بھائی نے مجھ پر ہیں کی تھی، تم لوگوں کو خود خیال کرنا ہوگا۔" اس کے بعد سب مارکیٹ میں اِدھر اُدھر بکھر گئے

یہ اسلام آباد کی سب سے مہنگی اور جدید ترین لوازمات سے بھرپور مارکیٹ تھی۔ کافی بڑا ایریا ر کھا تھا۔ اگر ایک دفعہ یہاں گم ہو جاؤ تو ڈھونڈنا اور ایک دوسرے تک رسائی حاصل کرنا بھی بن جاتا ہے۔

لڑکے تو باٹا اور "ہش پپیز" میں جوتے پسند کرنے گھس گئے تھے۔ کچھ کو گلاسز کی شاپ نے رف کھینچ لیا تھا۔ راشد اور توقیر "ہیوز" ریسٹورنٹ میں پیٹ پوجا کے لئے جا گھسے۔

رغوانہ بھابی کو ہینڈی کرافٹس کی شاپس نے اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ اسماء اپنی معلومات ضافے کی غرض سے عروسی ملبوسات والی شاپ کے گرد پھرتی ہوئی ونڈو شاپنگ کر رہی تھی۔ د جوتے دلوانے تھے۔ حارث بھابی کی ہدایت کے مطابق اسے ہمراہ لئے مارکیٹ کی پچھلی بڑ پر "ملی شوز" پر جوتے دیکھ رہا تھا۔

"سنا ہے یہاں اسلام آباد کا سب سے مشہور مہنگا بیوٹی پارلر "ملی" بھی ہے۔ آؤ ذرا چل کر یں آخر ہے کیا چیز......؟"

طیبہ کو شوق چڑھا تو وہ اسماء کی ونڈو شاپنگ کا خاتمہ کرواتے ہوئے اس کو ساتھ لیے مارکیٹ کے حصے میں آ گئی۔ افراح فینس بک شاپ سے کچھ کتابیں دیکھ رہی تھی۔ اس کے علاوہ اور کسی کو یوں سے دلچسپی نہیں تھی اس لئے وہ اکیلی ہی تھی۔

کتابیں دیکھتے دیکھتے اُسے وقت گزرنے کا پتا نہیں چلا۔ اتفاق سے اسے رضیہ بٹ کا ناول شائنہ" مل گیا تھا۔ اُس نے اس سے پہلے یہ ناول اپنی کسی سہیلی سے لے کر پڑھا تھا مگر آخر کے بلا باب پھٹے ہوئے تھے۔ ناول اتنا دلچسپ تھا کہ اُس کا اینڈ پڑھنے کے لئے وہ بُری طرح بے ین ہوئی تھی مگر اتفاق سے اسے دوبارہ یہ ناول نہ مل سکا۔ اب ملا تو دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر ے مکمل کرنے لگی۔ خریدنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

"اوہ گاڈ۔ایک بج کر دس منٹ ہو رہے ہیں۔" ناول ختم کر کے ہی وہ سر اُٹھا سکی تھی
اب جونہی نگاہ گھڑی پر پڑی' اس کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔وہ عجلت میں ...
کتاب رکھ کر بھاگنے کے سے انداز میں باہر نکلی تھی۔

ایک لمحے کو اسے سمجھ نہیں آیا' کس طرف کو جائے۔غلطی سے وہ سیدھی ہی نکل پڑ...
جب مختلف شاپس پر پھرتی پھراتی مین روڈ تک آئی تو جیپ کو نہ پا کر اس کے چھکے چھوٹ گ...

"کہاں پارک کی تھی گاڑی......؟" وہ کافی دیر تک اِدھر اُدھر کھوجتی رہی پھر یاد آیا ...
نہیں تھی' یہ مارکیٹ کا عقبی حصہ تھا۔گاڑی دوسری طرف "مسٹر بکس" کی سائیڈ پر پارک کی ...

"اُفوہ ...... میں بھی کس قدر خبط الحواس ہوں......" وہ سرپٹ واپس دوڑی
مارکیٹ کی دوسری طرف مین روڈ پر آئی تو یہاں گاڑی کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔

پارکنگ کی جگہ وہی تھی مگر گاڑی موجود نہیں تھی۔

"اوہ خدایا......اب کیا کروں......" اس کا دل دھک سے رہ گیا۔

"اجنبی شہر' نامانوس جگہ اور ناواقف لوگ۔

"تو کیا حارث سچ مچ مجھے چھوڑ گیا ہے۔؟ وہ لوگ میرے بغیر چلے گئے ہیں......!
اس کے قدموں تلے سے زمین سرکنے لگی۔اسے چکر آنے لگے۔

"وہ یقیناً دامن کوہ پہنچے ہوں گے ابھی......" اُس نے حواس بحال کر کے خود کو س...
کوشش کی۔"اگر کسی طرح میں دامن کوہ پہنچ جاؤں تو اُن کو ڈھونڈ لوں گی!" مگر وہاں...
پہنچوں۔مجھے تو یہاں کے راستوں کا بھی علم نہیں ہے......!"

گھبراہٹ' پریشانی' خوف و ہراس یکلخت اُس پر حملہ آور ہوئے تھے۔اس کے
ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔لائٹ بلیو جارجٹ کے سوٹ میں اس کا دمکتا ہوا ہوشربا چہرہ'
اشتہار بنا ہوا تھا۔

وہ بوکھلاہٹ کے عالم میں ہاتھ ملتی ہوئی دیکھنے کی چیز لگ رہی تھی۔

"ایکسکیوزمی بے بی......کیا مسئلہ ہے۔آپ پریشان نظر آ رہی ہیں......" وا...
پُرتعیش سی شاندار گاڑی عین اُس کے سامنے رکی تھی اور اس کی ڈرائیونگ سیٹ پر...
خوبصورت اور اسمارٹ خاتون نے "رے بین" سن گلاسز آنکھوں سے ہٹا کر اپنے تر...
سرخی مائل بالوں پر ٹاکتے ہوئے بڑے نرم اور میٹھے انداز میں مخاطب کیا تھا۔افراح پلٹ...

...جانب دیکھنے لگی۔

...کچھ نہیں......آ......آنٹی......" اس نے کچھ تامل سے کہا مگر اس کے چہرے کی اُڑتی
...ہوں میں اُتری خوف اور پریشانی کی پرچھائیاں اور گھبراہٹ سے لبریز انداز بہ زبان خود
...ار ہے تھے۔

...یشن ایبل لیڈی دروازہ کھول کر گاڑی بند کر کے باہر نکل آئی اور اس کے کندھے کے گرد
...ر دیے۔

...گھبراؤ نہیں' بے بی۔مجھے بتاؤ' شاید میں تمہاری کچھ مدد کر سکوں......غالباً تم کسی کو تلاش کر
...؟"

...تون کی زیرک نگاہی پر وہ حیران ہو گئی۔اُس کے مہربان اور مشفق انداز نے افراح کو کچھ

...دراصل میں اپنی گاڑی تلاش کر رہی تھی......" اس نے کچھ ہچکچا کر بتایا۔

...کیا ڈرائیور کے ساتھ آئی تھیں......؟" خاتون نے روانی سے دریافت کیا۔

...نہیں......اصل میں ہم سب کزنز گھومنے پھرنے کی غرض سے نکلے تھے۔وہ لوگ شاید
...ادھر اُدھر ہو گئے ہیں......انہی کو ڈھونڈ رہی تھی......"

...کیا تم پہلی مرتبہ یہاں آئی ہو......؟" خاتون نے اُس کے خوبصورت چمکتے ہوئے شہابی
...بنا کر شیریں انداز میں پوچھا۔

...جی ہم اسلام آباد کی سیر کرنے آئے ہیں۔دو دن پہلے......"

...کہاں سے......؟" خاتون نے رسانیت سے پوچھا۔

...لاہور سے......"

...اس خوش لباس' خوش انداز اور خوش اندام عورت کا رویّہ اتنا نرم' اتنا مہربان اور مربیانہ تھا کہ
...ازخود بتاتی چلی گئی۔

"پھر تو تمہیں اپنی قیام گاہ کا راستہ نہیں پتا ہوگا......"

"جی آنٹی......اسی لئے پریشان ہوں......" افراح نے ہاتھ مسلتے ہوئے سر جھکا کر کہا۔

"پھر اب کیا کرو گی۔کیا سوچا ہے تم نے......؟ خاتون غور سے اس کی صورت دیکھ رہی

"یہاں سے دامن کوہ جانے کا پروگرام بنایا تھا ہم نے۔اگر کسی طرح وہاں پہنچ جا
انہیں ڈھونڈ لوں گی......"

"ٹھیک ہے' آؤ میرے ساتھ...... میں تمہیں ڈراپ کر دیتی ہوں۔" عورت نے
اُس کے کندھے تھپتھپائے اور فرنٹ ڈور کھول کر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"آپ کو زحمت ہوگی۔" وہ کچھ جھجکی۔

"ارے بھئی' ایسی ہزار زحمتیں اُٹھانے کے لئے ہم ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔تم آ
شاباش......" خاتون کا موڈ انتہائی خوشگوار اور تسلی بخش تھا۔

افراح اسے غیبی امداد سمجھ کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔گاڑی ایئر کنڈیشنڈ تھی اور اندر کی فضاء
فرنچ پرفیوم سے معطر تھی۔

"تمہارا نام کیا ہے ڈارلنگ......!"

"افراح......"

"بہت خوبصورت نام ہے' بالکل تمہاری طرح......" خاتون ایک پسندیدہ......نگا
ڈالتے ہوئے چہچہا کر بولی۔افراح نے جھینپ کر سر جھکا لیا۔

گاڑی مختلف جگہوں سے گزر رہی تھی۔

"کتنی دور ہے دامن کوہ......؟" افراح نے کچھ بے چین ہو کر پوچھا۔

"بس پانچ منٹ کا راستہ ہے۔"

"نپٹ لوں گی ان لوگوں سے۔ہارون بھائی سے شکایت لگا کر ایسی دُھنائی کرواؤں
چھٹی کا دودھ یاد آ جائے گا۔" وہ دل ہی دل میں حارث لوگوں پر طیش کھا رہی تھی۔

"بہت دیر ہوگئی۔ابھی تک نہیں آیا۔" اسے تشویش ہونے لگی۔باہر نظر دوڑائی
علاقہ شروع ہو چکا تھا۔بہت شاندار اور دیدہ زیب کوٹھیاں بنی ہوئی تھیں۔

"یہ...... یہ ہم کہاں آ گئے ہیں۔" ایک سرخ ٹائلوں سے بنی انتہائی اسٹائلش سی کو
کھلے گیٹ سے گاڑی اندر آ گئی تھی۔گاڑی اندر داخل ہوتے ہی گیٹ کیپر نے گیٹ بند کر
افراح کی سانسیں رُکنے لگیں۔

"میں تمہیں جنت میں لے آئی ہوں' میری جان۔" میڈم بانو نے مسکرا کر گاڑی بند کر دی

♥♥♥

"یار' ایک بج گیا۔سب لوگ آ چکے ہیں۔یہ افراح کہاں رہ گئی۔"
حارث جیپ سے ٹیک لگائے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے اضطرابی حالت میں دایاں پاؤں
ا۔

سب لڑکیاں گاڑی میں بیٹھ چکی تھیں۔

"جاؤ۔تم دیکھ کر آؤ۔کہیں راستہ نہ بھول گئی ہو۔"
جب دس منٹ اوپر ہو گئے تو رضوانہ بھابی نے شیشے سے چہرہ باہر نکال کر حارث سے کہا۔
حارث اور راشد سامنے والی چند شاپس پر چکر لگا آئے۔

"اس طرف تو نہیں ہے۔" انہوں نے واپس آ کر بتایا۔سب کو پریشانی ہو رہی تھی۔

"ایسا کرتے ہیں' مارکیٹ کی پچھلی سائیڈ کا چکر لگا لیتے ہیں۔شاید وہ اُدھر ہمیں ڈھونڈ رہی

اسما کی تجویز پر حارث نے گاڑی اسٹارٹ کر دی اور مارکیٹ کی عقبی طرف جانے والی روڈ پر
۔وہاں پہنچ کر انہوں نے جیپ روکی اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔یہ وہی وقت تھا' جب
یوس ہو کر مارکیٹ کی فرنٹ سائیڈ پر "مسٹر بکس" کے سامنے کھڑی جیپ تلاش کر رہی تھی۔

"وہ تو یہاں بھی نہیں ہے......اب کیا کریں۔"

سب کے چہروں پر ہوائیاں اُڑنے لگیں تھیں۔

"کہاں تلاش کریں؟"

"وہ یہیں کہیں ہوگی۔اکیلی کہاں جا سکتی ہے۔راشد' توقیر تم دونوں میرے ساتھ آؤ۔ہم
یک شاپ چیک کرتے ہیں۔بھابی' آپ لوگ گاڑی میں بیٹھیں۔اندر سے لاک کر
" حارث نے ہدایات دیں۔

☆☆☆

"میں اپنے آدمی سے کہہ کر گاڑی تمہاری فیکٹری پہنچا دوں گا۔ اس وقت پر
چلو۔ میں تمہیں ڈراپ کر دیتا ہوں۔ راستے میں باتیں بھی ہو جائیں گی۔"

ہارون کی خواہش پر وہ اپنی گاڑی لاک کر کے اُس کی سفید سوزوکی میں بیٹھ گئی تھی۔

"بہت خوشی ہو رہی تھی' تمہیں اپنے گھر دیکھ کر۔ اپنی خوش بختی پر رشک آ رہا ہے۔"

وہ ڈرائیو کرتے ہوئے اس کی سمت دیکھ کر دلکشی سے مسکرایا۔

وہ نظریں چُرا کر باہر دیکھنے لگی۔

"ایک شعر ذہن کی تہہ میں کلبلا رہا ہے۔

التفاتِ خاص تو خوش قسمتی کی بات ہے
آپ کے زیرِ نظر رہنا بھی اچھی بات ہے

بس اب شعر و شاعری نہ شروع کر دینا۔" وہ سنجیدگی سے ٹوکنے لگی۔

"بھلا کیوں؟" اُس پر چنداں اثر نہ ہوا۔

"جدائیوں میں ہی گزرے جو دن وصال کے
تھے
ہمارے چاہنے والے بھی کس کمال کے تھے"

ہارون شروع ہو چکا تھا۔ مشعل حسب سابق زچ ہونے لگی۔

"میرے پاس زیادہ ٹائم نہیں ہے۔ دس بجے مجھے ایک غیر ملکی کمپنی سے سپلائی
میٹنگ کرنی ہے پھر ادارے کا چکر بھی لگانا ہے۔"

"آہ......" وہ افسردگی طاری کر کے بولا۔

وہ تو جاں لے کے بھی ویسے ہی سبک نام رہے
عشق کے باب میں سب جرم ہمارے نکلے

کتنی مدت کے بعد ہم تم یوں یکجا ہوئے ہیں۔ ایک دوسرے کے ہمراہ ہیں۔
تو مایوس ہو چکا تھا۔ ہمیشہ کے لئے تم پر صبر کر چکا تھا۔ میں نے تسلیم کر لیا تھا کہ تم میری
تمغہ نہیں بن سکتیں مگر کتنے عجیب اور حیران کن انداز میں تمہارا ساتھ' تمہاری قربت اب
نصیب بن گئی ہے۔"

ہارون سنجیدہ ہو گیا۔

"چند گھڑی کی ہمراہی ہمیشگی کے ساتھ میں نہیں بدلا کرتی۔"

مشعل کا لہجہ حوصلہ شکن تھا۔

ہارون نے اک جانچتی ہوئی گہری نگاہ اُس پر پھینکی۔

"جو احساس ہوا سے بتانے' اُس کے اظہار کرنے میں کیا حرج ہے مشعل! کیا شرمندگی کیا
اس میں۔"

"اظہار تب کیا جاتا ہے' جب اس کے بنا اور کوئی چارہ کار نہیں رہتا۔ انسان خوشی سے کب
ہے' جذبے کی شدتیں خود بخود اس سے کہلواتی اور کرواتی ہیں۔ اظہار تو بہت بے بس ہو کر
ہے اور میں ابھی اتنی۔ بے بس نہیں ہوئی۔ سچ پوچھو تو ہارون اب انکشاف کی منزل سے گزر
کے بعد میرے اندر فطری رو پہلے جذبے کہیں دفن ہو گئے ہیں۔ دوشیزگی کے خواب غرقاب
ہیں۔ کہیں کھو گئے ہیں۔ اب کچھ بھی دل میں نہیں اترتا۔ من کو نہیں تڑپاتا۔ عجب بے حسی'
فیلا پن در آیا ہے طبیعت میں۔"

مشعل کی سنہری اداس آنکھوں میں عجیب پُر ملال سے ٹوٹے ہوئے خوابوں کے عکس جاگ
۔

"انسان اپنے جسم و جاں کے فطری تقاضوں کو شعوری جبر سے دبا کر ان کی نفی کر دے تو اور
مگر نہ یہ تو ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ کوئی بشر فطری و جبلی جذبات و احساسات سے مبرا نہیں

ہارون کا لہجہ ٹھوس اور پُر اعتماد تھا۔

"نہیں۔ ہو سکتا ہے' تم درست کہتے ہو مگر میرے پاس اب کوئی خواب زندہ نہیں رہے۔
کر کے سب فطری خواہشات دل کی پٹاری میں بند ہو گئی ہیں۔ کچھ پا لینے کی خواہش اور
مسلک جذبے کی شدتیں انسان کو مایوس نہیں ہونے دیتیں۔ اسے آگے بڑھنے پر مجبور
تی ہیں لیکن جب آگے بڑھنے' حاصل کرنے اور مطلوب و مقصود پانے کی امنگ ختم ہو
انسان برف کی سرد و سپاٹ اور منجمد چٹان کی مانند ایستادہ رہ جاتا ہے پھر ایسے ہی فطری
کیسے کروٹ لے کر بیدار ہو سکتی ہیں۔"

میں چاہتا ہی نہ تھا لاجواب کرنا تجھے
بہت جواب اگرچہ ترے سوال کے تھے

ہارون نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''میں تمہیں اپنے مخصوص خول سے باہر آنے کی آ
دینا چاہتا ورنہ آج تمہیں باور کرا دیتا کہ انسان زندگی کی کسی اسٹیج پر بھی فطری تقاضوں
نہیں ہو پاتا۔''

''اگر ایسی بات ہے تو پھر تم نے اب تک شادی کیوں نہ کر لی؟''

مشعل نے حسب معمول ٹھنڈے اور متحمل انداز میں سوال کیا۔

''کیونکہ بہر حال سراہٹ اور تسکین کے تقاضے فطری و جبلی ہیں۔ بقول تمہار
''میرے اندر بھی یہ تقاضے مچلتے ہیں۔ میں کب انکاری ہوں مگر میں ان خوا
تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے جس ''ذریعے'' یا واسطے'' کا متمنی ہوں وہ ابھی تک مجھے نہ

ہارون نے اطمینان سے ایک بھرپور نگاہ اس پر ڈال کر جواب دیا۔

جانے اس کچھ کہتی بولتی نظر میں کیا تھا کہ مشعل کی پلکیں جھکنے لگیں۔ وہ پزل سی ہو
جھانکنے لگی۔

ہارون فطری جھجک اور نسوانی حیا کے اس دلکش مظاہرے پر بے اختیار سا ہو کر گاڑی
اسے تکنے لگا تھا۔

مشعل کا سر جھکا ہوا تھا۔ پلکیں اجلے گداز رخساروں پر سایہ فگن تھیں۔ سیاہ شال ا
سیاہ پرنٹ کے گرم سوٹ میں اس کا لازوال حُسن بنی تمام تر تابانیوں سمیت پھوٹا پڑ رہا تھا۔
اس حسن میں ٹھنڈک تھی۔ تازگی بھرا خمار تھا۔ اس کی ماں مینا گل کا احسن آگ بھڑ
والا تھا۔ جو دعوت نظارہ دیتا تو ایمان لوٹ لیتا تھا۔ اس کے برعکس مشعل کے حسن میں ا
ایک رعب ایک پُراسراری تمکنت تھی۔

''مشعل۔'' اس نے مخاطب کیا تو اس کے لہجے کا مہکیلا رچاؤ اور نرم جھنکار سماعت
جذب ہونے لگی۔

''اپنے دل سے پوچھ کر بتاؤ کیا یہ ''ٹھہراؤ'' نہیں مانگتا؟ کیا تمہاری بے رنگ ب
سپاٹ زندگی محبتوں کے دیدہ زیب رنگوں کی طلب گار نہیں ہے......؟ کیا تمہیں ایک پیار
گھر ایک قابل اعتماد جیون ساتھی اور چاند تاروں سے بھی زیادہ پیارے پیارے بچوں کی
نہیں ہے؟'' وہ بغور اس کا چہرہ پڑھ رہا تھا۔

وہ سر جھکائے خاموشی سے ہاتھ مسل رہی تھی۔

''میں جانتا ہوں۔ مجھ سے دور ہو کر تم بھی خوش نہیں ہو۔ چھ سال بیت گئے ہیں یوں
ائی کے کرب میں جھلستے ہوئے۔ ہم دونوں سزا بھگت رہے ہیں۔ جب ہم جانتے ہیں کہ ایک
رے کے لئے لازم و ملزوم ہیں تو پھر یکجائی کے فیصلے پر ہچکچاہٹ کیوں؟ ایسی کون سی رکاوٹ ہے
ہم عبور نہیں کر پا رہی ہو؟ مجھے بتاؤ شاید میں کچھ مدد کر سکوں۔''

ہارون کا لہجہ بہت شفیق مہربان و مخلص اور سنجیدہ تھا۔ وہ خود پر اپنے دل پر پہرے بٹھا بٹھا کر
ل چکی تھی۔ جب انسان مایوسی اور تھکن کا شکار ہوتا ہے تو فطری طور پر کوئی پڑاؤ کوئی سہارا کوئی
دھا تلاش کرتا ہے۔

مگر وہ جانتی تھی وہ جن منزلوں کی مسافر تھی وہاں کوئی پڑاؤ نہیں ہوتا کوئی ڈرامائی موڑ نہیں
تا۔

وہ چاہتی بھی تو عام انسانوں کی فخر و مسرت اور سکون سے لبریز دنیا میں نہیں آ سکتی تھی۔
دنیا بڑی اجلی تھی اور اس کا تن میلا تھا۔

''ہم جیسے لوگ سمندر کے بچھڑے ہوئے ساحل ہوتے ہیں ہارون۔ روز ازل سے تنہائی
ن کا مقدر کر دی جاتی ہے۔ اس پار بھی اور اس پار بھی۔'' اس نے بہت سارے رخساروں پر
رنے والے آنسوؤں کی راہ روک کر انہیں دل کے دامن پر گرا لیا تھا۔ ہارون نے خاموش
ظروں سے اسے دیکھا۔

''مجھے قتیل شفائی کی غزل کے کچھ شعر یاد آ رہے ہیں۔

خدا وہ وقت محبت میں اب دکھائے مجھے
کہ زخم تجھ کو لگے اور چوٹ آئے مجھے
وہ مہرباں ہے تو اقرار کیوں نہیں کرتا
وہ بدگماں ہے تو سو بار آزمائے مجھے

آخری شعر پڑھ کر اس نے مایوس اور مضمحل نظروں سے مشعل کا چہرہ ٹٹولا تھا۔

''دکھ تو یہ ہے کہ میرے ساتھ تو بہر حال زیادتی کر ہی رہی ہو اپنے ساتھ حقیقتاً بہت برا کر
رہی ہو۔ تنہا رہنے کا فیصلہ کرنا بہت آسان ہے مگر اس کو نبھانا انگاروں پر چلنے کے مترادف ہوتا
ہے۔ پاؤں زخم زخم ہو جاتے ہیں اور حوصلوں کے بادبان ٹوٹ جاتے ہیں۔'' ہارون کا لہجہ تنبیہہ
لئے ہوئے تھا۔

مشعل نے سیلف کنٹرول سے کام لیتے ہوئے خود کو بمشکل سنبھالا۔

"میں تم سے مینا گل کے بارے میں ڈسکس کرنے آئی تھی۔" وہ اپنے مقصد کی طر تھی۔

"دو تین دن پہلے اس نے لاہور سے مجھے فون کیا تھا۔ شاید اب کی بار اسلام آباد آ پر آئے تو میری کوٹھی پر بھی آئے۔ اگر تم ضرورت محسوس کرو تو میں خود بھی اسے اپنے گھر ب ہوں۔"

"تمہارے پاس اس کے ذاتی نمبر ہیں؟"

"ہاں۔ میں نے تو کبھی اس سے کنٹیکٹ کرنے میں دلچسپی نہیں دکھائی مگر زبردستی اپنا نمبر اور کوٹھیوں کے ایڈریس آپا اماں کو تھما جاتی ہے...... اگر تمہیں درکار ہوں تو......"

"نہیں۔ فی الحال تو مجھے اس کے بارے میں مکمل معلومات حاصل ہیں۔" ہارون س ہوئے انداز میں بولا۔ "البتہ تم ایک بات کنفرم کرا دو۔" وہ سوچ میں ڈوبا ہوا بولا۔

"کیا وہ ہالی ڈے ان کے سوئٹ میں آج کل قیام کرتی ہے یا ریزرویشن کینسل کروا د کیونکہ طاہر کی رپورٹ کے مطابق گزشتہ ایک ماہ سے وہ یہاں نہیں آئی۔ ہم نے جو خفیہ آ جاسوسی کے لئے فٹ کروائے تھے' ان کے استعمال کی نوبت نہیں آئی بلکہ میں سوچ رہا ہوں ا ویٹر والی ڈیوٹی سے سبکدوش کر دوں! اب اس ہوٹل میں کوئی خاص ایکٹی ویٹی نہیں رہی ہما لئے۔"

"کوئی اور وقت ہوتا تو میں مینا گل کے سوال کا جواب دینا بھی گوارا نہ کرتی مگر اب مج ہے۔ اس سے ڈھنگ سے بات کرنی پڑے گی۔" مشعل نے خیال آرائی کی۔

ہارون نے ہاتھ بڑھا کر ریڈیو آن کر دیا۔ علی حیدر کا بہت خوبصورت گیت فضاؤں م گیا تھا۔

قریب آؤ کہ دوری
سہی جائے نہیں اب اور
نہ دور جاؤ کہ دوری
سہی جائے نہیں اب اور

ہارون نے ایک جتاتی ہوئی مسکراہٹ سمیت اُس کی طرف دیکھا تھا۔ گیت کے بول ا

ں دو رنجیدہ اور التجائیہ موسیقی کے پس پردہ گونج رہے تھے کہ سیدھے دل پر اتر کر رہے تھے۔

مشعل نے آہستگی سے گردن موڑی اور نظریں چُرا کر باہر کے مناظر میں دلچسپی لینے کی م کوشش کرنے لگی۔

"کیا تم بوقت ضرورت مینا گل کے گھر جا سکتی ہو؟"

معاً ہارون کسی دھیان سے چونک کر مخاطب ہوا۔

"دل تو نہیں مانتا لیکن اگر ایسا کرنا ناگزیر ہوا تو چلی جاؤں گی۔" وہ گہری سانس لے کر خر گویا ہوئی۔

"یاد آیا۔ دلشاد کو اپنے ساتھ فیکٹری لے جانا تھا۔ تم ایسا کرو' گاڑی کا رخ میرے گھر کی ف موڑ دو۔ مجھے ڈراپ کر کے تم اپنے آفس چلے جانا۔ میں دلشاد کے ساتھ ٹیکسی کر کے فیکٹری جاؤں گی۔" اچانک ہی مشعل کو یاد آیا تھا۔

"میں تم دونوں کو فیکٹری چھوڑ دوں گی۔ ٹیکسی کی ضرورت نہیں۔ یہ دلشاد وہی لڑکی ہے نا جو دن تمہارے آفس میں نظر آئی تھی۔"

"ہاں...... وہی ہے۔ ادارے میں بھی کام کرتی ہے اور ساتھ ساتھ پڑھائی بھی کر رہی ہے۔"

"ویسے ہے کون؟ تم تک کس طرح پہنچی؟"

ہارون نے معمول کے سے انداز میں سوال کیا تھا مگر مشعل کو بے اختیار ہی ہنسی آ گئی۔

"آخر ہو نا پورے جاسوسی ایجنٹ۔ سرکاری اور پیشہ ورانہ انداز نجی معاملات میں بھی گھسیٹ تے ہو۔" پھر اس نے ساری تفصیل بتا دی۔

"گویا ایک سال سے زائد عرصہ ہو چکا ہے' اسے تمہاری تحویل میں آئے۔"

ہارون نے تائید کے لئے اس کی طرف دیکھا۔ "اس کے والی وارثوں نے اس تک رسائی ں پائی؟ وہ یقیناً اس کی تلاش میں ہوں گے۔"

"شاید...... مشعل نے کندھے اچکائے۔" کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ مشکل یہ ہے کہ دلشاد اپنی کم ی اور بے خبری کے باعث اپنا مکمل پتا بھی نہیں بتا سکتی جس سے اس کے پچھلوں کا سراغ مل کے۔"

"ایڈریس نہ سہی اپنے والد' والدہ اور محلے کا نام تو جانتی ہوگی۔" ہارون نے کسی نکتے پر غور

کرتے ہوئے اس کی سمت دیکھا۔

"ہاں......یقیناً"............مشعل نے سر ہلایا۔"مگر میں نے پوچھا نہیں۔"

"میں پوچھ لوں گا۔لڑکی کے اصل وارثوں کا پتا لگانا ضروری ہے۔کچھ بھی سہی بہر
والدین ہیں۔یقیناً اس کے لئے تڑپ رہے ہوں گے۔"ہارون کی نظروں میں اپنے گھر کی بز
خواتین کے تاثرات گھومنے لگے۔کوئی ذرا سا لیٹ بھی ہو جائے تو پورا گھر تشویش سے آدھا ہ
تھا۔

"یہ بھی ہو سکتا ہے' وہ بچی پر فاتحہ پڑھ کر صبر کر چکے ہوں۔" وہ بے رحمی سے مسکرائی۔

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔" ہارون نے بے ساختہ نفی کی۔

"اس دنیا میں ہر چیز ممکن ہے' ہارون صاحب۔وہ معاشرہ جہاں سگی ماں اپنے جگر
ٹکڑے کو سینے پر اینٹیں رکھ کے اسے تاریکی کے حوالے کر آتی ہے۔جہاں نئی آنے والی روح
بدن کا ناسور سمجھ کر پیٹ میں ہی ختم کر دیا جاتا ہے۔جہاں گناہوں کے ثمر چوری چھپے باہر پھینک
دیئے جاتے ہیں۔وہاں ہر چیز ممکن ہے۔"

مشعل کا چہرہ شدت جذبات سے سرخ اور بھیگا بھیگا سا تھا۔ہارون دم بخود سا اس کا رخ
دیکھا رہ گیا۔

"ریلیکس۔" ہارون نے نرمی سے اس کے سفید نازک گداز ہاتھ کی پشت تھپکی۔اس کا
دھیما تھا۔

"میں نے محسوس کیا ہے کہ تم لاوارث اور ناجائز بچوں کے متعلق بہت حساس اور جذباتی
جاتی ہو۔"

اس نے آہستگی سے اس کا حسین و جمیل ملائم ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔غالباً پہلی مرتبہ
نے اس کا ہاتھ چھوا تھا۔وہ بہت لئے دیئے رہنے والا محتاط اور متین و شفاف مزاج کا مرد تھا اور
اختیار قانونی حق ملنے کے بعد استعمال کرنے کا قائل تھا۔مشعل دوسرے ہاتھ سے اپنی تپتی ہ
پیشانی مسل رہی تھی۔اس کی بات پر اس کے چہرے پر تھکی تھکی زہریلی مسکراہٹ در آئی۔

"یہ حساسیت تو مجھے وراثت میں ملی ہے۔" وہ جیسے خود سے مخاطب تھی۔دل چیخ چیخ کر کہ
تھا۔

"تم کیا جانو ہارون۔چوٹ وہیں پر لگتی ہے جہاں درد کی شدت کو براہ راست محسوس ک

لگتا ہے۔جس پر بیتی ہو' وہی اچھا داستان گو بن سکتا ہے۔"

اس نے آہستگی سے اپنا ہاتھ اس کے گرم فولادی ہاتھ سے نکال لیا تھا۔ہارون نے ایک
گہری نگاہ اُس پر ڈالی اور پھر گاڑی آگے بڑھا دی۔

☆☆☆

"یہ آپ کہاں لے آئی ہیں۔چھوڑیئے مجھے۔"

میڈم بانو کے لبوں پر ایک کھلتی ہوئی روشن مسکراہٹ پھوٹ رہی تھی۔"یہاں جو ایک بار آتا
ہے' اس کے لئے واپسی کا ہر دروازہ بند ہو جاتا ہے میری جان۔"

"تم......تم یقیناً صحیح عورت نہیں۔ہٹو مجھے جانے دو۔" وہ ایک بگولے کی طرح اٹھی تھی۔اس کا
رخ دروازے کی طرف تھا۔

"کیوں زحمت کرتی ہو ڈارلنگ۔خواہ مخواہ ان نازک قدموں کو تھکاؤ گی۔" میڈم بانو اپنی جگہ پر
مطمئن بیٹھی مسکرا رہی تھی۔

"افراح نے جھپٹ کر بھاری آبنوسی دروازہ کھولا اور باہر نکل آئی۔تیز تیز قدموں سے وہ
مسلسل آگے بڑھتی جا رہی تھی۔میڈم بانو یا اس کے کسی گرگے نے اس کا پیچھا کرنے کی زحمت
نہیں کی تھی۔

آگے پھر دروازہ تھا۔وہ بھی کھلا تھا۔

وہ آندھی طوفان کی طرح گزرتی ہوئی بڑے سے ہال کمرے میں گئی۔یہ بہت وسیع و پرشکوہ
ہال تھا۔مغربی دیوار کے ساتھ اسٹیج بنا ہوا تھا۔جہاں چاندنیاں بچھی ہوئی تھیں۔ہال کا فرش بیش
قیمت سرخ ایرانی قالینوں سے آراستہ تھا جن پر قدم رکھتے ہی آدھا پاؤں دبیز اونی ریشوں میں
ڈوب جاتا تھا۔

وہ بیتاب قدموں سے گویا قالینوں پر تیرتے ہوئے اسٹیج کی مخالف سمت میں بنے بیرونی
دروازے کی سمت بڑھی تھی۔اس نے بے قراری سے دروازے کا ہینڈل گھمایا۔

مگر وہ نہ کھلا۔دوازہ لاک تھا۔

"افوہ۔" افراح نے اضطراری انداز میں ہینڈل کھینچ کر کھولنے کی ہر ممکن کوشش کی مگر اسے
کامیابی نہ ہوئی۔

بوکھلائے ہوئے انداز میں وہ واپس مڑی۔

"شاید باہر نکلنے کا کوئی اور راستہ ہو۔"

ڈوبتے دل سے وہ ہال کی مشرقی دیوار کے درمیان جڑے دروازے کی طرف آئی۔ ہینڈل کھینچا تو کھل گیا لیکن آگے پھر ایک پُرتعیش کمرا تھا۔

اس کمرے کا دروازہ بھی کھلا تھا۔ وہ آس و نراش کے عالم میں اسے کھول کر آگے بڑھی تو اسے سیڑھیاں نظر آئیں۔

"ضرور چھت پر سے باہر نکلنے یا چھلانگ لگانے کا کوئی ذریعہ ہاتھ آ سکتا ہے۔"

وہ پُرجوش ہو کر سیڑھیاں طے کرنے لگی۔ ابھی تک کوئی اس کے پیچھے نہیں آیا تھا۔ وہ آزادانہ اِدھر اُدھر نقل و حرکت کر رہی تھی۔

جونہی سیڑھیاں طے کر کے اوپر پہنچی' آخری سیڑھی کے آگے ایک بھاری آبنوسی دروازہ اس کا منہ چڑا رہا تھا۔ یہ دروازہ اندر سے لاکڈ تھا۔

"اوہ خدایا۔" وہ چکراتا ہوا سر ہاتھوں میں تھام کر ہارے ہوئے قدموں سے نیچے آ گئی اور ہال کمرے کے فرش پر ڈھے گئی۔

اسے اب سمجھ میں آیا تھا کہ میڈم بانو نے اسے آزاد کیوں چھوڑا تھا۔

اسے پنجرے میں پھڑپھڑانے کی مکمل آزادی دی گئی تھی مگر اس سے باہر نکلنے کا ہر راستہ مسدود تھا۔

"میں کہاں جاؤں...... کیا کروں...... اے اللہ! میری مدد کر۔" خوف' وحشت' بے بسی اور لاچاری کے باعث اس کی غزالی آنکھوں میں برسات امنڈنے لگی۔

اس ہال کے تین اطراف میں دروازے تھے' جبکہ چوتھی سمت میں اسٹیج بنا ہوا تھا۔ اسی سمت انتہائی کونے میں اسے نقرئی رنگ کا ایک خوبصورت سا ڈرم نظر آیا۔

اس کی حس تجسس بیدار ہو گئی۔ وہ آہستہ قدموں سے چلتی ہوئی اس عجیب و غریب ڈرم کے پاس آ گئی۔ ڈرم کی ساخت کسی کھلے ہوئے پھول کی طرح تھی۔ جس کی پتیاں دائرے میں پھیلی ہوں۔ پھول کے درمیان میں ٹنکی تھی اور اطراف میں ٹونٹیاں لگی ہوئی تھیں۔

"اس کے اندر کیا ہے؟" وقتی طور پر وہ اپنے گرد و پیش سے غافل ہو گئی۔ وہ تعجب خیز نظروں سے اس خوبصورت سے اسٹیل کے عجیب و غریب ڈرم کو دیکھ رہی تھی۔ ڈرم کے پاس ایک چھوٹی سی ٹاپ گلاس ٹیبل تھی جس پر کرسٹل کے نفیس گلاس ایک قطار میں ترتیب سے رکھے ہوئے تھے۔

"شاید اس کے اندر کوئی ڈرنک ذخیرہ کی گئی ہے!" افراح نے اندازہ لگایا پھر کچھ سوچ کر ے جھکی۔ ایک گلاس ہاتھ میں لے کر ڈرم کی ایک ٹونٹی کے نیچے رکھتے ہوئے اسے کھول دیا۔

ٹونٹی کھلتے ہی ڈرنک پریشر کے ساتھ باہر نکلی اور سیدھی گلاس میں گر گئی۔ گویا اس کا اندازہ ت نکلا تھا۔ اس نے جلدی سے ٹونٹی بند کر دی اور کھڑے ہو کر ہاتھ میں تھاما ہوا گلاس اونچا تے ہوئے غور سے اس ڈرنک کا جائزہ لینے لگی۔

اس سیال مادے کا رنگ عجیب سا تھا۔ کم از کم عام ڈرنکس میں سے نہیں تھا۔

افراح نے ناک کے قریب کر کے سونگھا۔

اگلے ہی لمحے اس کا جی متلانے لگا۔ اس نے بڑی مشکل سے ابکائی روکی تھی۔

گلاس میز پر پٹخ کر وہ الٹے قدموں پیچھے ہٹ گئی۔

وہ سمجھ گئی تھی کہ یہ سیال شراب کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے پھر اس کے ساتھ ہی اسے ایک غیر لکی فلم کا سین یاد آ گیا۔ ایسا ہی ایک ڈرم اس نے ایک ہوٹل کے سین میں دیکھا تھا۔ فلم کے راس عجیب و غریب مگر اسٹائلش ڈرم کو "شیمپین فاؤنٹین" کہہ رہے تھے۔

پھر اسے یاد آیا۔ مووی دیکھنے کے بعد اس نے ابو سے اس فاؤنٹین کے بارے میں تفصیلاً تھا اور انہوں نے بتایا تھا کہ اعلیٰ درجے کے غیر ملکی اور ایک دو ملکی ہوٹلز اور پارٹی ہاؤسز میں بات کے دوران سافٹ ڈرنکس کے لئے اس قسم کے فاؤنٹین رکھے جاتے ہیں۔ ڈرم میں کے ذریعے ڈرنک سپلائی کی جاتی ہے۔ عام طور پر سوڈا واٹر فاؤنٹین استعمال کئے جاتے ہاں' مغرب میں کبھی کبھی امیر و کبیر لوگ اپنی امارت دکھلانے اور اپنے مہمانوں کی حسب ل تواضع کے لئے شیمپین' بیئر یا شیری کے فاؤنٹین کا اہتمام کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ وسکی' ارٹینی اور پورٹ وغیرہ کے ڈرم بھی لوگ تقریبات میں رکھوا لیتے ہیں' حسب استطاعت اور ب ذوق۔ جن کی تجوریاں پیسوں سے ابل رہی ہوں' وہ مہنگی سے مہنگی شراب بھی پانی کی طرح ول پر بہانے میں نہیں ہچکچاتے۔

"تو اب یہ تعفن اور بسائند پاکستان کے امراء کے ہاں بھی آ گئی ہے۔" میڈم بانو کی کوٹھی یہ فاؤنٹین دیکھ کر اس نے کراہت سے سوچا تھا۔ "خدا جانے کتنا پیسہ اور اختیار ہے' اس عورت پاس...... مگر یہ ہے کون؟ کیا کام کرتی ہے...... ؟ صحیح عورت تو نہیں ہے یقیناً...... کون سا دھندا تا ہے...... ؟ مجھے کیوں اغوا کیا ہے؟!"

فاؤنٹین کی اصلیت جان لینے کے بعد وہ پھر حقیقی دنیا میں واپس لوٹ آئی تھی۔

اسی ساعت سامنے والا دروازہ کھلا۔

میڈم بانو مسکراتے ہوئے اس کی سمت بڑھی تھیں۔ انہوں نے لباس بدل لیا تھا۔ ا وقت طاؤسی رنگ کی بیش قیمت ساڑی میں چم چم کرتا دلکش سراپا لئے تک سک سے تیار ا سامنے کھڑی تھیں۔ غالباً کہیں جانے کا ارادہ تھا۔

"تھک کر کیوں بیٹھ گئیں جانو۔ ابھی تو اس لال محل میں بہت کچھ دیکھنے کو باقی ہے۔ کون سی مہمان ہو یہاں۔ اب تو یہی تمہارا مسکن ہے۔"

وہ مکاری سے اس کے شفق رنگ گال ہاتھ سے تھپتھپا کر گویا ہوئیں۔

"مجھے ہاتھ نہ لگاؤ۔" افراح نے غصے سے اس کا ہاتھ جھٹکا۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑ پچکارتے ہوئے بولیں۔

"بہت معصوم ہے، میری گڑیا رانی۔ ارے بھئی مفت میں کون کافر تمہیں ہاتھ لگا جرأت کر سکتا ہے۔ بڑا انمول ہے یہ حسین وجود۔ فکر نہیں کرو۔ اس گل بدن کو جو پائے گا وہ موتیوں سے مالا مال کر دے گا۔"

میڈم بانو معنی خیز انداز میں اسے سرتاپا دیکھ رہی تھیں۔

افراح ان کی نظروں کی چبھن سے خائف سی ہونے لگی۔ اس نے جل کر رخ پھیر لیا تو

"ویمن ایسوسی ایشن کی بہت اہم میٹنگ میں نہ جانا ہوتا تو میں تمہیں اپنے پاس تمہاری خاطر داری کرتی مگر مجبوری ہے۔ میں اس ایسوسی ایشن کی صدر ہوں۔ جانا لازمی پھر گپ شپ ہوگی۔ تم اس عمارت کے اندر آزاد ہو۔ جہاں مرضی گھومو پھرو۔ ڈائننگ روم فریج ہیں۔ جو ہر طرح کے کھانے پینے کی اشیاء سے بھرے ہوئے ہیں۔ اگر آرام کرنا چاہو بھی کمرے کا بیڈ استعمال کر لو۔ ویسے میں شام تک تمہارے لئے اسپیشل کمرا سیٹ کروا دوں

"چھی چھی...... اتنی فراڈ عورت خواتین کی تنظیم چلا رہی ہے؟ کیسے کیسے دہرے ہوتے ہیں لوگوں کے چہروں پر۔"

افراح کو سوچ کر ہی گھن آ رہی تھی۔

"میں جا رہی ہوں۔ ہاں باہر نکلنے کی بیکار کوشش نہ کرنا۔ عمارت کے دو داخلی درواز اور دونوں جدید ترین سسٹم کے تحت کھولے اور بند کئے جاتے ہیں۔ اس لئے یہاں سے فرار

بالفرض محال کسی طرح دروازے سے نکل بھی جاؤ تو بھی کوٹھی کے گیٹ سے باہر نہیں جا سکو گی۔ کھولنے کا سسٹم کسی کی سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ اس کا علم صرف گیٹ پر موجود چوکیدار کو ہے اور کو تم اچھی طرح دیکھ چکی ہو۔ اس جلادی صورت اور طاقتور دیو کا سا ڈیل ڈول دیکھ کر بڑے سورما دہل جاتے ہیں۔ جب کسی کو سزا دینی ہو تو میں اسے ڈینی کے حوالے کر دیتی ہوں۔"

ڈم بانو کے تیور بے رحم ہو گئے تھے۔ ڈینی اس چوکیدار کا نام تھا۔ افراح کے رونگٹے کھڑے ہو ۔ اس کا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ جسم و جاں سے جان نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔

"آ...... آپ کون ہیں اور مجھے یہاں کیوں لائی ہیں۔ میں نے آپ کا کیا بگاڑا ہے۔ پلیز جانے دیں۔ دیکھیں، میری آپ سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔" وہ یکلخت روہانسے انداز میں گھبرا ر بولی۔ اس کی آنکھوں میں وحشت رقص کر رہی تھی۔

"میں کون ہوں...... یہ تمہیں خود ہی پتا چل جائے گا۔"

میڈم بانو کے چہرے پر پُراسرار تبسم ڈولنے لگا۔

"بس یوں سمجھ لو کہ سمجھ دار اور بات ماننے والوں پر میں انتہائی مہربان ہوں اور غداری اور اوت کرنے والوں کے لئے سراپا قہر بن جاتی ہوں۔ تم سے دشمنی نہیں بلکہ دوستی کرنے کے لئے ہاں لائی ہوں۔ اصل میں حسین لوگوں کو اپنی کوٹھی میں جمع کر کے مجھے اسی طرح خوشی ہوتی ہے یے نوادرات اکٹھا کرنے کے شائق کو۔ میں چلتی ہوں اب...... اور ہاں چیخ چلا کر اپنے نازک لے کو تھکانے کی کوشش نہ کرنا۔ پوری عمارت ساؤنڈ پروف ہے۔ تمہاری آواز باہر نہیں جائے گی۔"

وہ ٹھک ٹھک کرتی ہائی ہیل بجاتی بجلی کی سی سرعت سے باہر نکل گئی تھیں۔ افراح بے اختیار ان کے پیچھے لپکی مگر وہ جانے کس دروازے میں غائب ہو گئی تھیں۔ وہ بے مقصد ایک ایک کمرا کھنگا لنے لگی۔ اب تک کسی دوسرے انسان کا وجود نظر نہیں آیا تھا۔ چہار اطراف بہت خاموشی تھی۔

وہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے بیرونی دروازے تک پہنچ ہی گئی مگر یہ وہ جگہ نہیں تھی جہاں سے وہ اندر لائی گئی تھی۔ عمارت میں دو خارجی دروازے تھے اور یہ عقبی دروازہ تھا۔

دروازہ حسب توقع لاکڈ تھا۔ ہاں مگر ایک چیز تھی جسے دیکھ کر افراح کی آنکھوں میں امید کی جوت جلنے لگی۔

دروازے کے دائیں طرف اوپر کو جاتی بل کھاتی ہوئی کارپیٹڈ سیڑھیاں تھیں۔

افراح ایک لمحہ ضائع کیے بغیر بسرعت سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ گویا خارجی دروازوں کی ط
اوپر جانے کے لئے بھی دو سیڑھیاں بنائی گئی تھیں۔

ان کے اختتام پر دروازہ نہیں تھا۔

وہ اوپر آ گئی۔

ایک لمبی راہداری تھی جس کے دونوں طرف چار چار کمرے تھے۔ یعنی کل آٹھ کمرے
ہر کمرے پر اُس کا نمبر درج تھا۔

"کمال ہے۔ باہر سے دیکھنے پر تو عمارت اتنی کشادہ نہیں لگتی۔" وہ اس کوٹھی کے عج
غریب طرزِ تعمیر پر غور کر رہی تھی۔

اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اوپر یا نیچے جانے کا اور کوئی راستہ دکھائی نہیں دیا۔

"تو پھر وہ سیڑھیاں کہاں جاتی ہیں جن کے اختتام پر ایک بند دروازہ تھا؟ اس کا مط
ہے' وہ حصہ ان کمروں کے پیچھے ہے اور دونوں کے درمیان مکمل پرائیویسی کے لئے ان کی سیڑ
الگ بنائی گئی ہیں۔"

وہ سوچ بچار کے بعد اسی نتیجے پر پہنچی تھی۔

اُس کے باری باری سارے کمروں کا جائزہ لیا۔ سب کے دروازے کھلے تھے۔

اندر سے معائنہ کرنے کے بعد وہ حیرت سے بے ہوش ہونے کے قریب ہو گئی۔

ہر کمرے کی سیٹنگ' فرنیچر' رقبہ اور ڈیکوریشن ایک جیسی تھی۔

ہلکے سبز پردے' اسی رنگ کی بیڈ شیٹ' دو کرسیاں' ایک سینٹرل ٹیبل' سرخ کارپٹ' سجا
کے لئے ایک بڑی سی پینٹنگ' پورٹیبل ٹی وی' وی سی آر اور ٹیپ ریکارڈر' ایک سنگھار میز۔

انتظام سے تو یوں لگ رہا تھا' جیسے کوئی گیسٹ ہاؤس ہو۔ عموماً ہوٹل اور گیسٹ ہاؤس م
اس طرح کی ارینجمنٹ دیکھنے میں آتی ہے۔

"عجیب بھوت بنگلہ ٹائپ کوٹھی ہے۔" وہ واپسی کے لئے مڑی تو اس کی نظر کونے میں ک
کی شیپ کی ایک میز پر جم گئی۔ وہاں ایک پیڈ رکھا ہوا تھا۔

افراح نے قریب آ کر جائزہ لیا۔ پیڈ پر ڈیوٹی سلپ نمایاں حروف میں چھپا نظر آ رہا
نیچے آج کی تاریخ درج تھی پھر نمبر وار تحریر تھا۔

(۱) کمرہ نمبر سات......رعنا۔ اپائنٹمنٹ شام چھ بجے۔

ا نمبر دو......رومانہ۔ اپائنٹمنٹ رات آٹھ بجے۔

ا نمبر چار......ثمن۔ اپائنٹمنٹ رات دس بجے۔

یہ سب کیا چکر ہے......! افراح کے ہوش و حواس گم ہونے لگے۔ نہ جانے کیوں خوف کی
ری سی اس کے جسم و جان میں دوڑتی گئی۔ کوئی چیز اس کے لاشعور سے شعور میں آنا چاہ رہی
کچھ سمجھنا چاہ رہی تھی مگر سرا ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔

خوفزدہ ہو کر جلدی جلدی سیڑھیاں طے کر کے نیچے آ گئی اور جو پہلا دروازہ نظر آیا' اسے
اندر چلی گئی۔ جگ سے پانی گلاس میں بھر کر وہ غٹاغٹ پی گئی۔

نی پی کر اعصاب کچھ قابو میں آئے تو طائرانہ انداز سے کمرے کا جائزہ لینے لگی۔

یڈ کی داہنی سمت آئینہ جڑے پٹ والی آبنوسی الماری تھی۔

فراح اضطراری انداز میں پٹ کھول کر الماری کا جائزہ لینے لگی۔ اس میں بہت سے دراز
مقفل تھے' جبکہ باقی کھلے ہوئے تھے۔ ان میں زنانہ استعمال کی کچھ چیزیں تھیں۔ میک
ری ہیئر بینڈز' موزے' رومال' تہہ کئے ہوئے سوٹ وغیرہ......

ھلے خانے کی ایک دراز میں سے سرخ مخملیں کور والی ایک لمبی چوڑی البم نما فائل اُس کے
لا۔

فراح اس فائل کو لے کر بیڈ پر بیٹھ گئی اور کھول کر اسے دیکھنے لگی۔

فحہ پلٹتے ہی اسے جھٹکا لگا تھا۔

ہ تیزی سے صفحے پر صفحہ پلٹتی چلی گئی۔ ہر صفحے پر یکساں ترتیب سے معلومات درج

"یا اللہ۔ یہ کیا معاملہ ہے۔" افراح نے سر تھام لیا۔ ایک بار پھر فائل کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔
ہر صفحے پر خواتین کی تصویریں چپکی ہوئی تھیں اور ہر تصویر کے نیچے کچھ تفصیل درج تھی۔

رعنا......عمر تیس سال

غیر شادی شدہ

تعلیم......بی اے

اسی طرح رومانہ کی تصویر کے نیچے درج تھا۔

رومانہ......عمر پچیس سال

غیر شادی شدہ

تعلیم......ایف اے

اور ثمن کی فوٹو گراف کے نیچے اس کی تفصیلات رقم تھیں۔

ثمن......عمر اکیس سال

طلاق یافتہ

تعلیم......تھرڈ ائیر

اور بھی تصویریں تھیں؛ جن میں عورتوں کے متعلق مختصر اُخاکہ درج تھا۔ کچھ بیوہ اور شاد
خواتین کی تصویریں بھی البم میں موجود تھیں۔ افراح کے انداز کے مطابق اس فائل میں کم از
سو تصویریں مع معلومات چسپاں تھیں۔ کچھ خواتین کا تعلق ملک کے دوسرے علاقوں سے تھا۔

"کیا یہ میڈم لڑکیوں کا بیوپار کرتی ہے یا اُن سے دھندا کرواتی ہے جو ڈیوٹی سلپ
رکھی ہوئی ہے۔"

افراح کے ہاتھ پاؤں سرد پڑ گئے۔ اُسے خطرہ بالکل سر پر دکھائی دے رہا تھا۔

اس کوٹھی کے درو دیوار اس پر دہشت طاری کرنے لگے تھے۔

"یا اللہ۔ مجھے یہاں سے نجات دلا دے۔" وہ گڑگڑا کر دعا مانگنے لگی۔

حارث لوگ نہ جانے کہاں کہاں مجھے تلاش کر رہے ہوں گے اور ہارون بھائی!!
بھی اب تک اطلاع مل چکی ہوگی۔

وہ بے قراری سے اٹھ کر باہر آ گئی۔ ایک کمرے سے دوسرے کمرے تک چکرا
کچھ حاصل نہ تھا۔

وہ سیڑھیوں کے اختتام پر بنے بند دروازے کی طرف سوچنے والی نظروں سے دیکھ

"یہ دروازہ اندر سے کیوں بند ہے؟ گویا یہاں عام لوگوں کا جانا منع ہے۔ اس
کے پیچھے یقیناً دو تین کمرے ضرور ہوں گے اور شاید وہاں کوئی موجود بھی ہوگا۔ ہو سک
لڑکیاں ہوں جن کی آج ڈیوٹی ہے۔ کیا یہ لڑکیاں یہاں رہتی ہیں؟"

سوچ سوچ کر افراح کا سر دُکھنے لگا تھا۔ کنپٹیوں کے پاس ٹیسیں سی اٹھتی محس
تھیں۔

ہر طرف سے فرار کا راستہ بند تھا۔

وہ بُری طرح میڈم بانو کے جال میں پھنس چکی تھی۔ وہ دھپ سے بیٹھ گئی اور دونوں ہاتھوں
رہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

اچانک کھٹکے کی آواز سن کر اس نے سر اٹھایا۔

زینے کا بند آبنوسی دروازہ کھل رہا تھا۔

"رعنا' میڈم کو بتا دینا۔ میں لیٹ ہو رہی ہوں۔ مزید رک کر ان کا انتظار نہیں کر سکتی۔"

آواز کے ساتھ ہی دروازے سے جو ہستی برآمد ہوئی' اسے دیکھ کر افراح کی آنکھیں تحیر
ٹ گئیں۔

اسے اپنی بصارت پر دھوکا ہو رہا تھا۔

اسی اثناء میں وہ ہستی سیڑھیاں اترتے ہوئے اُس کے پاس آ رکی تھی۔

افراح کی سانسیں اس کے جسم کا ساتھ چھوڑنے لگیں۔

☆☆☆

"مشعل باجی۔" دلشاد بڑی دیر بعد ہچکچا کر بالآخر اسے مخاطب کر بیٹھی۔

مشعل ایزی چیئر پر آنکھیں موندے نیم دراز تھی۔

"ہوں......کہو......" اس نے آنکھیں کھول کر دلشاد کا سراپا جانچا۔

"وہ......آپ سے ایک بات پوچھنا تھی' اگر آپ ناراض نہ ہوں۔" وہ دونوں ہاتھوں کی
آپس میں مروڑتی ہوئی اپنے نروس ہونے کا پتا دے رہی تھی۔

"پوچھو اور ان انگلیوں کا قصور بخش دو۔"

مشعل مسکراہٹ دبا کر اسے دیکھ رہی تھی۔

"یہ جو ہارون صاحب ہیں۔" دلشاد نے ڈری ہوئی چور نگاہیں اُس کے چہرے پر

"یہ آپ کے کون ہیں؟" مشعل کا چہرہ سنجیدہ تاثرات سے مزین ہو گیا۔ وہ سدھی ہو کر بیٹھ

"میرا مطلب ہے' آپ انہیں پہلے سے جانتی ہیں؟" دلشاد نے جلدی سے اپنی بات کی

"اگر اسے جاننا کہتے ہیں تو ہاں واقعی میں اسے ایک مدت سے جانتی ہوں۔ غالباً چھ

سات برس سے۔"

"اچھا......" اسے نارمل لہجے میں جواب دیتے دیکھ کر دلشاد کی آنکھوں میں جائزا
دوڑ گئی۔

"تو پھر تو وہ آپ کے دوست ہوئے اس لحاظ سے۔"

"لڑکیاں غیر مردوں کو دوست نہیں بنایا کرتیں۔" مشعل کے لہجے میں تادیب ا
تھی۔

"اس سے دوستی نہیں شناسائی ہے۔ ہر ملاقاتی دوست نہیں کہلاتا' البتہ کچھ جانے
ایسے ہوتے ہیں جن سے انسان اعتبار کا رشتہ استوار کر لیتا ہے۔ بس یہی اعتبار کا تعلق ہے
سبب ہم ایک دوسرے سے کچھ باتیں شیئر کر لیتے ہیں۔ ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔"

"اچھا۔ اسی لئے آپ نے انہیں میرے متعلق بتایا تھا۔"

دلشاد نے مطمئن ہو کر سر ہلایا۔ صبح مشعل کو ہارون کی گاڑی میں گھر آتے دیکھ کر و
گئی تھی پھر اس کے حکم پر وہ بھی تیار ہو کر اُن کے ہمراہ چل پڑی تھی' فیکٹری جانے کے لئے
میں ہارون نے دلشاد سے اس کی فیملی کے متعلق طرح طرح کے سوالات کئے تھے اور امی
تھی کہ جلد ہی اس کے ماں باپ کا سراغ لگا لیا جائے گا۔ اس وقت سے دلشاد الجھن میں تھ
جو شام کو فراغت سے گھر پہنچے تو اس نے موقع پر کا مشعل سے پوچھ ہی لیا۔

"کیا تم اپنے ماں باپ کے پاس جانا چاہتی ہو؟"

مشعل نے بغور اس کا چہرہ ٹٹولا۔

دلشاد نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

"میں اس کا ہاں یا نہیں میں جواب نہیں دے سکتی باجی۔ پہلے تو یہی جی چاہتا تھا کہ
کر نگاہ نہ کروں مگر اب وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ایک کسک سی بیدار ہو رہی ہے۔ گذ
ملنے کو دل تڑپتا ہے۔ میں ایک بار اپنوں کے چہرے دیکھنا چاہتی ہوں۔"

"میں تم پر زبردستی نہیں کروں گی۔ بے فکر رہو۔ اگر وہ مل گئے اور تمہارا دل پگھل گ
تمہیں مجبور نہیں کروں گی۔ وہ تمہارے والدین ہیں۔ اُن کا تم پر مجھ سے کہیں زیادہ حق

مشعل نے اس کی پشت تھپتھپائی۔ دلشاد بڑے ضبط سے آنکھوں کی سطح پر مچلتے آنسو د
تھی۔

"میں آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی باجی۔" وہ مشعل سے لپٹ گئی۔ "آپ نے ہی تو
دوسرا جنم دیا ہے۔ میری تاریک زندگی میں امید کی شمع روشن کی ہے۔ اب روشنیوں کو چھوڑ کر
روں میں بھٹکنے کی سکت مجھ میں نہیں ہے۔"

وہ دل گرفتہ سی تھی۔

"ہم سب اپنے اصل کی تلاش میں ہیں۔ اپنے آپ کو ڈھونڈ رہے ہیں۔ خود سے اور
وں سے پوچھتے پھرتے ہیں کہ ہم کون ہیں۔"

مشعل کا لہجہ ملول اور مضمحل سا تھا۔ وہ بھی اداس ہو گئی تھی۔

"باجی۔ آپ نے اپنے بارے میں کیا سوچا ہے؟"

جواب میں وہ بے دلی سے ہنس دی۔

"میں نے کیا سوچنا ہے چندا۔ سوچنا تو وہ ہے جو اپنی زندگی میں بہتری اور تبدیلی کی خواہش
ہے۔ میں ان دونوں چیزوں پر اختیار نہیں رکھتی۔ نہ میرے "اصل" میں تبدیلی ہو سکتی ہے اور
ت حال میں بہتری کی گنجائش ہے۔"

"مگر کیوں باجی! آپ اپنے مستقبل کے بارے میں اتنی ناامید اور بے پروا کیوں ہیں؟"

"اس لئے کہ میرا کوئی مستقبل ہی نہیں ہے۔ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو صرف بھیانک
لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ وہ اسی کیفیت میں عمر گزار دیتے ہیں۔ اُن کا کوئی حال یا مستقبل نہیں
اجہاں بھی جاتے ہیں' اُن کا ماضی اُن کے ساتھ ساتھ گردش کرتا ہوا اُن کے حال اور مستقبل
وم شمیں نگل جاتا ہے۔ عمر کی کئی دہائیاں گزار لینے کے باوجود وہ کوئی حال یا مستقبل تعمیر نہیں
تے۔ ماضی کا سایہ ہر جگہ تعاقب میں ہوتا ہے۔ لوگ اسی سے اس کی شناخت کرتے ہیں۔
ثیت اور مقام دیتے ہیں۔ بھلا بتاؤ تو جب لوگوں کی نظر سے کسی کا حال اور مستقبل غائب ہو
ور صرف بھیانک ماضی ہی سامنے دکھائی دے تو وہ شخص ناامید نہ ہو تو کیا کرے۔"

شعل کا لہجہ دکھ اور رنج کی کاٹ سے گیلا سا ہو گیا تھا۔ اُس نے تھکے تھکے انداز میں آنکھیں
پنا بازو ان پر رکھ لیا تھا۔

بات سچ ہی تو تھی۔

یا گل نے جو گل کھلائے تھے' ان کا خمیازہ اسے بھگتنا پڑ رہا تھا۔ چونکہ جب بھی اپنے غیر
"اصل" کا خیال آتا۔ خود سے گھن آنے لگتی تھی۔ اپنا آپ تعفن کا ڈھیر لگتا تھا۔ یہی ماضی

کے وہ روح فرسا حقائق تھے جن سے آگاہ ہوتے ہی وہ اپنے حال و مستقبل سے بے نیاز ہو
تھی۔ اب تو فقط ایک ہی سیاہ لمحہ تھا جو آنکھوں کے سامنے ٹھہر گیا تھا۔ انکشاف کا بھیانک لمحہ۔

☆☆☆

سیڑھیاں اتر کر نیچے آنے والی ہستی معروف اداکارہ مینا گل تھی۔
افراح پتھر کے بُت کی طرح ساکت وصامت کھڑی اسے دیکھے چلی جارہی تھی۔ مینا
لئے یہ انداز پذیرائی' یہ ٹکٹکی' یہ رشک آمیز جذبہ نیا نہیں تھا۔ وہ ایک فلم اسٹار تھی۔ لاکھوں دلوں
دھڑکنوں میں بسی تھی۔ اس کا حسن بے مثال دیکھکر مداحین اسی طرح گنگ رہ جاتے تھے۔ ا
لئے وہ ایک شان بے نیازی لئے نخوت سے گزر جانا چاہتی تھی۔ مگر افراح کی آنکھوں سے جھ
عجیب سے ناقابل فہم تاثرات نے مینا کے قدم ٹھٹکا دیے تھے۔

"اوہ..... تو گویا نئی سنہری چڑیا کا شکار کیا ہے میڈم نے۔" اس نے ایک گہری جانچتی
نگاہ افراح پر ڈال کر گردن موڑتے ہوئے دو قدم اوپر کی سیڑھی پر کھڑی رعنا کو مسکرا کر مخاطب

"کیا نام ہے تمہارا....." مینا گل کے لب و لہجے میں اپنی اہمیت کا احساس' رعب اور
تغافل نمایاں تھا۔

"افراح....." اس کے لب دھیرے سے ملے۔

"اسے اوپر کے رہائشی کمرے میں لے جاؤ رعنا..... میرا خیال ہے' یہ اپنے گردوپیش کا
طرح جائزہ لے کر اپنی قسمت و ذہانت اور بہادری آزما چکی ہے۔" مینا گل نے اک اچٹتی
نگاہ ڈال کر طنزاً کہا اور پھر تنک جوتی کی ہیل بجاتے ہوئے سر جھٹک کر آگے بڑھنے لگی۔ ا
پتھرائی ہوئی کیفیت سے باہر نکل کر ایک دم اس کے پیچھے دوڑی۔ "بات سنئے۔ میناجی پلی
ایک منٹ میری بات سن لیجئے۔" جیسے اچانک ہی اس کے ذہن میں اسپارک ہوا تھا کہ مینا
کے لئے مددگار ثابت ہوسکتی ہے۔"

"دیکھیے۔ میں ہارون کی کزن ہوں۔ ہارون احمد کی۔" اُس نے مینا کے مقابل پہنچ
ہوئے عاجلانہ انداز میں یقین دلایا۔

"کون ہارون۔" مینا گل کے ہونٹ سکڑ گئے۔ "میں نہیں جانتی اُسے۔"

"وہی جو خفیہ ادارے میں ملازم ہیں مگر وہ آپ کی خاطر' آپ کی قربت حاصل کر
لئے صحافی کا بہروپ رچائے ہوئے ہیں۔"

وہ بہت آس اور امید ہے سے تیز تیز بولتی ہوئی اُسے بتارہی تھی۔

"ہارون احمد..... وہ صحافی! اوہ....."

مینا گل کی نظروں میں کائنات ڈولنے لگی۔

"وہ میری خاطر' مجھ تک پہنچنے کے لئے صحافی بنا ہے؟" اس کے لہجے میں اعلیٰ درجے کی بے
نی۔

"جی ہاں۔" افراح نے جوش میں بتایا۔ "وہ آپ سے محبت کرتے ہیں۔ ان کی ڈائریاں
، کے ذکر سے' آپ کے نام کی نظموں غزلوں سے بھری ہوئی ہیں۔ وہ نہ جانے کب سے آپ
ر میں گرفتار ہیں۔ چھ سات برس گزر چکے ہیں۔ وہ صرف آپ کی وجہ سے شادی نہیں کر
،" افراح اس تیزی سے ساری تفصیل بتارہی تھی جیسے ایک بھی ہوالہ مس ہوگیا تو وہ اس قید
ہائی نہ پاسکے گی۔

یقیناً مینا گل ہارون بھائی سے تعلق کے ناتے اُسے بچالے گی۔ اسے اس وحشت کدے سے
نالنے میں مدد کرے گی۔

یہاں سے نکل بھاگنے کا تصور اس حد تک اس کے اعصاب پر حاوی تھا کہ فی الوقت مینا گل
لھ کر جذبۂ رقابت بھی بیدار نہ ہوا تھا۔ اسے آزادی حاصل کرنے سے زیادہ اور کسی چیز سے
انہ تھی۔

"ناقابل یقین۔" مینا گل بڑبڑائی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ نفیس و متین اور
ار شخص محض اس کی دید اور رفاقت کی غرض سے اس کے آس پاس منڈلاتا تھا۔ اس کے راستے
آتا تھا۔

تو پھر وہ اس کا جلانا ستانا' طنز کے تیر برسا کر سلگانا' ذومعنی فقرے بولنا۔ دھمکیاں دینا۔ وہ
کیا تھا۔

کیا وہ سب مذاق تھا یا یہ مذاق لگ رہا ہے؟

مینا گل الجھ سی گئی' تاہم اس کا ذہن بہت دور تک سوچ رہا تھا۔ اسی بے خیالی میں وہ آگے
ے لگی۔

"پلیز میناجی۔ مجھے اپنے ہمراہ لے جائیں۔ مجھے اس دلدل میں نہ چھوڑیں۔" افراح نے
اسے پہلے ہی لپک کر اُس کی راہ روک لی اور لجاجت و منت سے گویا ہوئی۔

"دلدل سے نکلنا آسان نہیں ہوتا میری جان۔" مینا گل نے طویل سانس کھینچ کر اس
گال تھپتھپائے اور مڑ کر رعنا کو اشارہ کیا۔ رعنا نے آ کر اس کا بازو تھام لیا۔ اس کی گرفت م
تھی۔

اسی اثنا میں مینا گل کسی نادیدہ جگہ سے باہر نکل چکی تھی۔

"چھوڑو مجھے۔" اس نے وحشت کے عالم میں اپنا بازو چھڑانا چاہا مگر مقابل کو غا
صورتِ حال سے واسطہ پڑتا رہتا تھا۔

"خواہ مخواہ شور شرابا کر کے اپنی شامت کو آواز نہ دو۔ جو کسی سے نہ سدھریں وہ ڈنڈ
کی طرح سیدھے ہو جاتے ہیں۔" رعنا کے سرد و سپاٹ لہجے میں محسوس کی جانے والی سر
دھمکی تھی وہ اسے سختی سے تھام کر اوپر لے آئی۔ آبنوسی دروازے سے آگے تین کمرے تھے
میں سے ایک کامن روم کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ افراح کو ادھر ہی لے جایا گیا۔

"اوہ...... نیا پرندہ...... واؤ...... خوبصورت ہے...... مدتوں چلے گا"...... بیر
سالہ گورے چٹے رنگ کی لمبی اسمارٹ لڑکی جو نیلے اسٹائلش کپڑوں میں ملبوس نیل پالش
تھی اسے دیکھ کر چہچہائی تھی۔

"میڈم بانو کی لاٹری نکل آئی۔" وہ پُر اشتیاق نظروں سے افراح کو دیکھ رہی تھی
بالکل مختلف انداز میں سجایا گیا تھا۔ یہاں کسی قسم کا فرنیچر نہیں تھا۔ فرش پر قالین بچھا کر او
گدے ڈال دیئے گئے تھے اور ان گدوں کے اوپر سبز و سرخ خوبصورت اونی قالین بچھ
لڑکی اسی پر نیم دراز نیل پالش لگا رہی تھی۔

"ہوں۔ خاصے کام کی چیز ہے۔ ظاہر ہے خاص خاص لوگوں کے پاس بھیجی جا
بہرحال! یہاں جو بھی آ جائے مصرف تو ایک ہی ہے۔ رومانہ کہاں گئی ہے۔"

رعنا کامن روم کا دروازہ لاک کرنے کے بعد افراح کو سرے سے نظر انداز کر
اسی لڑکی کے پاس جم گئی۔

"باتھ روم میں ہے۔ شام کی "ڈیوٹی" کے لئے تیار ہو رہی ہے۔"

یہ لڑکی غالباً ثمن تھی۔ وہ اس کی تصویر البم میں دیکھ چکی تھی۔ اسی لمحے دروازہ کھلا
روب میں لپٹی ایک خوبصورت لڑکی ادھر چلی آئی۔ اس کا بھرا بھرا گداز بدن اور گندمی
رنگت مختصر سے ملبوس سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔

"ان کا حدود اربعہ کیا ہے۔" وہ افراح کو سرتاپا دیکھ رہی تھی۔ افراح کو ان لوگوں کی نظروں
میں ترحم اور طنز برستا محسوس ہو رہا تھا۔

"یہ تو میڈم ہی بتا سکتی ہیں یا پھر یہ خود بتائے گی۔"

رعنا کندھے اچکا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کیوں بھئی۔ سویٹی...... کہاں سے آئی ہو؟"

رومانہ نے دلچسپی سے پوچھا۔ افراح بے طرح گھبرانے لگی۔

"ارے ڈرو نہیں۔ میڈم بانو کی پناہ میں آ کر تم ہر بیرونی کارروائی سے محفوظ ہو گئی ہو۔
تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ ادھر آرام سے قالین پر بیٹھ جاؤ۔ ہم بھی تمہاری جیسی لڑکیاں
ہیں۔"

افراح نے محسوس کیا کہ رومانہ کا لب و لہجہ دوستانہ اور ہمدردانہ ہے۔

"میں یہاں سے جانا چاہتی ہوں۔ پلیز! مجھے جانے دیں۔" وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا
رو پڑی۔

رعنا کمرے سے باہر نکل گئی تھی جبکہ ثمن موبائل فون پکڑ کر کونے میں جا کر مصروف گفتگو تھی۔

رومانہ اُس کے پاس آ بیٹھی۔ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر حوصلہ افزا انداز میں تھپتھپایا۔

"ایسا ممکن ہوتا تو ہم تمہیں اس زنداں میں جڑے نظر نہ آتے۔ روؤ نہیں۔ یہ رونا تو اب عمر
کا ہے۔" رومانہ کے لہجے میں شکستگی تھی۔ "کیا اپنے محبوب کے ساتھ گھر سے بھاگی تھیں؟"

رومانہ اس کا بھیگا بھیگا ملول حُسن جانچ رہی تھی۔

"اور وہ حسب روایت چند دن تمہاری عزت سے کھیل کر تمہیں کسی اوباش طبع شخص کے
بیچ کر فرار ہو گیا ہوگا۔ ہے نا......!"

"کیا......؟" افراح کے آنسو جہاں کے تہاں تھم گئے۔ وہ یوں اُسے دیکھنے لگی جیسے وہ
زبان بول رہی ہو۔

"رعنا کے ساتھ یہی ہوا تھا۔" رومانہ نے جیسے اس کے تحیر کو خاطر میں نہ لایا تھا۔

"پھر وہ اوباش بندہ جی بھر کر لطف اندوز ہونے کے بعد اسے میڈم بانو کے اڈے پر لے
میڈم نے محض چالیس ہزار میں ہمیشہ کے لئے رعنا کو خرید لیا۔ دام کھرے کرنے کے لئے
ہر روز میڈم کے اشارے پر دوسروں کی آغوش سجاتی ہے۔ کبھی اس کی ڈیوٹی دن لگتی ہے تو

کبھی شام کو۔ اگر تم اس عمارت کا اچھی طرح جائزہ لے چکی ہو تو تم نے اس اڈے کا گیسٹ
طرز کا انتظام بھی ملاحظہ کیا ہوگا۔ کاؤنٹر پر ہر روز میڈم ''ڈیوٹی سلپ'' بنا کر رکھ دیتی ہیں۔
باری باری جا کر اپنی روزانہ کی اپائنٹمنٹ کا ٹائم اور کمرا دیکھ لیتے ہیں۔ ان کمروں میں کبھی
مہمان بنتے ہیں تو کبھی صاحب مال اور صاحب جائیداد سیٹھ لوگ دل پشوری کے لئے میڈ
کر کے بکنگ کرواتے ہیں۔ اپنی اپنی پسندیدہ کال گرل کے ساتھ وقت گزارنے کی فرمائش
کرواتے ہیں۔ سب سے زیادہ کالز میڈم مینا گل کے لئے آتی ہیں۔ تمہیں یہ سب کچھ اس
رہی ہوں تاکہ تم اس ماحول سے مانوس ہو جاؤ۔ اب تمہیں اسی سسٹم کا حصہ بننا ہے۔ ان
سے فرار موت سے قبل ممکن نہیں ہے۔''

افراح دل پر ہاتھ رکھے سکتے کے عالم میں رومانہ کے منہ سے بھیانک حقائق سن رہ

''کہیں اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے شوق میں تو برباد نہیں ہوئیں؟'' رومانہ
نکالا۔

''ثمن کے ساتھ یہی ہوا تھا۔ ماں باپ کا سایہ اُٹھنے کے بعد چچا کے ہاں ٹھکانا کیا
کے دن رات کے طنز و تشنیع سن کر تعلیم ادھوری چھوڑ کر نوکری کا ایک اشتہار دیکھ کر پرائیو
کے آفس پہنچ گئی۔ باس نے پرسنل سیکرٹری رکھ لیا اور کچھ عرصے بعد اس کے بھولپن اور کم عم
فائدہ اٹھا کر داشتہ بنا لیا پھر تحفتاً اپنے ساتھیوں کو بھی بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے کے مواقع ف
کے اپنا بزنس بڑھایا۔ باس نے شادی کا جھانسا دے کر اس کو اپنی ڈگڈگی پر نچایا مگر جب
ہوئی تو ذمے داری قبول کرنے سے انکار کرتے ہوئے اسے دھتکار دیا۔ چچی کو اس کی برباد
ہوا تو مار پیٹ کر حشر کر دیا اور پھر کہیں سے ایک بڈھا پھونس ڈھونڈ کر اس سے بیاہ رچا دیا
کے سات ماہ بعد اس نے مردہ بچے کو جنم دیا۔ اس کا بڈھا شوہر انتہا درجے کا شقی القلب
کنجوس تھا۔ اسے خرچا پورا نہیں دیتا تھا۔ بدچلنی کے طعنے چوبیس گھنٹے زبان پر رواں ر
ازدواجی حقوق ادا کرنے کے قابل نہیں تھا۔ ایک دن ثمن نے مسلسل فاقوں اور بڈھے ک
سے تنگ آ کر اس کا گھر چھوڑ دیا اور فرار ہو کر میڈم بانو کے کوٹھے پر آ بیٹھی۔ خود کو بیچنے کے
عزت تو بہت پہلے لٹ چکی تھی۔ اب رہا بھی کیا تھا۔ میڈم بانو نے اس کے شوہر پر اپنا دباؤ
طلاق لکھوا لی اور ثمن کو ہمیشہ کے لئے لال کوٹھی میں رکھ لیا۔''

''اور آپ کے ساتھ کیا ہوا تھا؟''

بے اختیار و بے ارادہ افراح کی زبان سے پھسل پڑا۔ وہ سحر زدہ کیفیت میں رومانہ کی گفتگو
رہی تھی۔ مزاحمت کا خیال وقتی طور پر ذہن سے محو ہو گیا تھا۔

''میرے ساتھ۔'' ضبط کے باوجود رومانہ کے لبوں سے آہ نکل گئی۔

''میں اپنے والدین اور بہن بھائیوں کے ساتھ ہنسی خوشی لاہور میں زندگی بسر کر رہی تھی۔
اے میں تھی' جب ایک بگڑا ہوا امیر زادہ پیچھے پڑ گیا۔ میں نے سختی سے اسے جھڑک دیا تھا مگر وہ
آیا۔ ایک روز اس نے مجھ سے بے تکلف ہونے کی کوشش کی تو میں نے اسے تھپڑ رسید کر دیا۔
کا بدلہ لینے کے لئے اس نے چند غنڈوں کی مدد سے مجھے اغوا کروا لیا اور پھر انہوں نے لاہور
انہوں دور راولپنڈی لے جا کر اجتماعی آبروریزی کی۔ میں پندرہ دن اُن کی تحویل میں رہی پھر
مجھے بے یار و مددگار چھوڑ کر واپس لاہور چلے گئے اور میں نے بے کسی کے عالم میں دارالامان
پناہ ڈھونڈی۔''

''آپ کے گھر والوں نے آپ کو تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی تھی اور پھر یہ کہ آپ خود بھی
ں لاہور جا سکتی تھیں؟''

افراح نے بھولپن سے سوال کیا۔

رومانہ تلخی سے مسکرا دی۔

''پندرہ روز تک لاپتا رہنے والی جوان لڑکی کے سر پر نہ آسمان ہوتا ہے اور نہ کسی کی دست
شفقت کی ردا۔ میرے گھر والے مجھ پر صبر کر چکے تھے۔ ایک دن چپکے سے ہمت کر کے میں نے
دارالامان سے اپنی پڑوسن سہیلی کے ہاں فون کیا تو پتا چلا' میرے والدین میرا سوئم بھی کر چکے تھے۔
انہوں نے لوگوں کو یہ بتایا تھا کہ رومانہ اپنی خالہ کے ہاں گوجرانوالہ گئی تھی۔ وہیں روڈ......
ایکسیڈینٹ میں دم توڑ گئی۔ نعش خراب ہونے کے خدشے کے پیش نظر اسے وہیں گوجرانوالہ ہی میں
دفنا دیا گیا تھا۔''

''اوہ......!'' افراح کے دل کو کچھ ہوا۔ کیسی ہولناک داستان تھی۔

''پھر دارالامان کی انچارج نے ایک نیا روپ دکھایا۔ دلالہ کا روپ۔ اعلیٰ افسران اور امراء
عیاشی کے لئے دارالامان سے لڑکیاں کرائے پر لیتے تھے۔ انچارج کو ایک موٹی رقم بطور معاوضہ ملتی
تھی۔ میں نے اس کا حکم ماننے سے انکار کیا اور احتجاج کیا مگر سزا کے طور پر جسمانی اذیتوں سے
گزرنے کے بعد بالآخر راضی ہونا پڑا پھر ایک روز ویمن ایسوسی ایشن کی صدر میڈم بانو نے

دارالامان کا دورہ کیا۔ دورہ تو محض بہانہ تھا۔ حقیقت میں وہ اپنے مطلب کا مال چھانٹنے آئی تھی
اس سلسلے میں دارالامان کی انچارج میڈم کی مخبروں میں سے ایک تھی۔ میڈم بانو کو میرا پُر شباب
سراپا بھا گیا۔ انہوں نے مستقل مجھے اپنے ساتھ رکھ لیا۔"

"اوہ خدایا! کیسی عبرتناک داستانیں ہیں' آپ لوگوں کی۔" افراح نے بے ساختہ
کانوں کو ہاتھ لگایا تھا۔

صرف ہم ہی نہیں اور بھی بہت سی لڑکیاں میڈم بانو کے دھندے میں حصہ بٹا رہی ہیں
تقریباً ملک کے ہر بڑے شہر میں میڈم بانو نے خفیہ اڈے قائم کر رکھے ہیں جہاں لڑکیاں بخ
شوقیہ یا پھر میڈم کے جال میں پھنس کر پیشہ کر رہی ہیں۔ کچھ ایسے نام بھی ہیں جو بظاہر قوی
بڑے معروف و معزز ہیں۔ کچھ ایسی خواتین ہیں جو اپنا گیسٹ ہاؤس چلا رہی ہیں' یا پارلرز
ہیں۔ بزنس ویمن ہیں' سماجی سطح پر تنظیم میں سرگرم رکن ہیں' فلاحی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حص
ہیں یا فلم انڈسٹری کا درخشاں ستارہ ہیں مگر درپردہ سب میڈم بانو کی مرہون منت ہیں۔ ا
چابی میڈم بانو کے ہاتھ میں ہے اور وہ ان سے اپنی مرضی کا کام نکلوا لیتی ہیں۔"

"اوہ......!" افراح کو اب سمجھ میں آیا کہ مینا گل یہاں کیوں نظر آئی تھی۔

"میڈم بانو کے تمام کاموں کو مینا گل اسسٹ کرتی ہیں۔ بڑا اہم اور قابل اعتماد مہ
ان کا۔"

رومانہ نے سرگوشی میں بتایا۔

اور ایسی مکروہ شخصیت سے ہارون بھائی محبت کرتے ہیں۔"

"چھی......" افراح کو سخت کراہیت محسوس ہوئی۔

"یہاں صرف وہ لڑکیاں قیام کرتی ہیں جن کا اور کوئی ٹھکانا نہیں ہوتا۔ جو اسلام آ
رہائشی ہیں' وہ فون پر میڈم سے اپنی ڈیوٹی ٹائم معلوم کر کے مقررہ وقت پر کوٹھی کے گیسٹ ہاؤ
آ جاتی ہیں۔"

"آپ ایسا غلیظ اور بدبودار پیشہ کیوں اپنائے ہوئے ہیں؟"

افراح کا دم گھٹنے لگا تھا۔ کتنا ناپاک اور گناہگار ماحول تھا یہاں کا۔

جواب میں رومانہ زور سے ہنس پڑی۔

"تم سے چند روز بعد میں پوچھوں گی۔"

میں مر جاؤں گی مگر میڈم بانو کو اُس کے مقصد میں کامیاب نہیں ہونے دوں
ں۔" افراح کے چہرے پر عزم کی سرخی تھی۔

رومانہ کے ہونٹوں پر پُر معنی مسکراہٹ کوندی تھی۔

"چلو تم بھی یہیں ہو اور ہم بھی۔ دیکھ لیتے ہیں۔"

"یہ نیچے اتنا بڑا سا ہال کس مقصد کے لئے بنایا گیا ہے؟" اچانک افراح چونک پڑی تھی۔

"میڈم بانو خاص خاص چہیتے سرکاری وغیر سرکاری شخصیات اور روسا امراء کی "دعوت شبینہ"
رتی ہے۔ مہینے میں دو تین بار یہ "رت جگا" ضرور ہوتا ہے۔ ساز و آواز' حسن و شباب اور شراب و
باب کے ہمراہ محفل کا آغاز ہوتا ہے۔ اس روز مختلف اڈوں سے "ہیرے" چن کر حاضرین کا دل
ہلانے کے لئے گھنگھروؤں کی چھنک کے ساتھ ساغر و مینا کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ ابھی پرسوں ہی
ی نیو ائیر پر ایک "شاندار" نائٹ شو برپا ہوا تھا۔

"میڈم بانو آ گئی ہیں اور اس لڑکی کو نیچے بلا رہی ہیں۔"

اس اثنا میں رعنا تیز قدموں سے اندر داخل ہوئی تھی۔

افراح کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا۔

رومانہ کے ذریعے میڈم بانو کے کارناموں کی تفصیل جان کر وہ حد درجہ دہشت زدہ ہو گئی
تھی۔

☆☆☆

رات کے آٹھ بج چکے تھے۔

شہر کا کونا کونا چھان مارا تھا۔ ہسپتال' دارالامان' ایمرجنسی وارڈز' شہر کے بازار' ہر جگہ ڈھونڈا
گیا تھا مگر نتیجہ ناکامی کی صورت میں سامنے آیا تھا۔

حارث لوگوں نے گھر واپس لوٹتے ہی ہارون کو آفس میں اطلاع دے دی تھی۔ پولیس کے
محکمے میں تھانہ مارگلہ کے ایس ایچ او سے ہارون کے ذاتی تعلقات تھے۔ دونوں نے ایک ہی کالج
سے گریجویشن کی تھی۔ ہارون کو جب بھی فرصت ملتی تھی' ایس ایچ او طارق رحمٰن سے ضرور سلام دُعا
کر لیتا تھا۔ جب کہیں سے بھی افراح کا سراغ نہ ملا تو ہارون نے طارق سے ذاتی طور پر اسے
تلاش کرنے کے سلسلے میں مدد چاہی تھی۔ طارق نے اسے یقین دلایا تھا کہ افراح کا نام اور ہارون
کے تعلقات صیغہ راز میں رکھا جائے۔

مگر ہنوز دور دور تک کوئی امکان نظر نہیں آ رہا تھا۔

دوپہر کے ایک بجے یہ غضب ٹوٹا تھا اور اب آٹھ بج چکے تھے اور کسی کے منہ میں کھیل بھر کر نہ پہنچی تھی۔

کھانے پینے کا ہوش ہی کہاں تھا۔ سب پریشان اور خوفزدہ تھے۔

"اماں جی کو کیا منہ دکھائیں گے؟ طالعہ پھپھو پر کیا بیتے گی۔" ہر ذہن سوچ کے اسی دائ
میں چکرا رہا تھا۔

رضوانہ بھابی تو جانے کب سے مصلے سے نہ اتری تھیں۔

"حارث، راشد اور توقیر اپنی اپنی جگہ اپنی کوتاہی پر شرمندہ تھے۔ اسما اور طیبہ کو رہ رہ
پچھتاوے لاحق ہو رہے تھے۔ کاش وہ افراح کو اپنے ہمراہ رکھتیں۔

"کیا ہوا ہارون...... کچھ پتا چلا؟" ہارون موبائل پر طارق رحمٰن سے بات کرنے کے بع
صوفے کی طرف بڑھا تو رضوانہ بھابی بے قرار ہو کر پوچھنے لگیں۔

"نہیں......مگر آپ حوصلہ رکھیں۔ خدا بہتر کرے گا۔" ہارون کے چہرے پر سوچ شکن
شکن جال بچھائے بیٹھی تھی۔ اس کا گم صم ذہن بار بار ایک ہی مخصوص زاویے پر بھٹک رہا تھا۔

"تم سب لوگ وضو کر کے آؤ۔" معاً رضوانہ بھابی نے اضطراری لہجے میں حکمیہ کہا۔

"قرآن پاک پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاؤ کہ اگر افراح بخیر و خوبی گھر آ جاتی ہے تو تم اس المنا
سانحے کا لاہور جا کر کسی سے تذکرہ نہیں کرو گے۔ لڑکی کی عزت کا شیشہ بڑا نازک ہوتا ہے۔ تہم
اور بدنامی کی ہلکی سی آنچ سے چٹخ جاتا ہے اور لڑکی عمر بھر کے لئے رسوائی و ذلت کی دلدل میں دھن
جاتی ہے۔"

رضوانہ بھابی کا انداز ہیجان خیز تھا۔

"یہ تو کہنے کی بات ہی نہیں ہے بھابی۔ افراح ہمارے گھر کی عزت ہے۔" ہارون
سنجیدہ و گمبھیر لہجے نے گویا سب کے دلی جذبات کی ترجمانی کی تھی۔ اس سے پہلے کہ مزید با
ہوتی، ہارون کا موبائل بج اٹھا۔ ہارون فوراً اٹھ کر کونے میں چلا گیا۔

"ہیلو۔ بھئی ہارون۔ مائی ڈیئر، کیسے ہو تم اور کہاں ہو۔ بڑے دن ہو گئے۔ میری طرف نہ
آئے۔"

مینا گل کی چہکتی ہوئی شاداب و شگفتہ آواز نے ہارون کے اعصاب جھنجھنا کر رکھ دیئے

معمول یہ انداز پذیرائی، لہجے کا لوچ، یہ لہک، یہ اپنائیت و بے تکلفی کیسے در آئی۔

"کیسے یاد کیا؟" اس نے سیدھے سادے دھیمے لہجے میں دریافت کیا تھا۔

"جیسے تم مجھے کرتے تھے۔" مینا گل نے برجستگی کا مظاہرہ کیا "نقلی صحافی بن کر۔ بھئی، بہت
ہے تم نے ہمیں۔ اپنا اصل کیوں چھپایا۔ مجھ سے دوستی مطلوب تھی تو سیدھے سبھاؤ کہا ہوتا۔
ری ذات میں اتنی کشش، اتنا سحر اور اتنی اپنائیت ہے کہ میں خوشی خوشی تمہاری رفاقت قبول کر
"

"کیا؟" ہارون کے ارد گرد پٹاخے سے چھوٹ گئے تھے۔

"اب بناؤ نہیں۔ مجھے سب معلوم ہو گیا ہے۔" وہ بڑے جوش و خروش سے بول رہی تھی۔
ں وقت میں میریٹ ہوٹل میں ڈنر کے لئے بیٹھی ہوں۔ اگر فارغ ہو تو چلے آؤ۔ تم سے کچھ
ری باتیں کرنا ہیں۔ کچھ میٹھی میٹھی، پیار بھری۔ اپنے اور تمہارے مستقبل کی۔ سنو! کیا تم عمر بھر
ے ساتھ رہ سکتے ہو؟" میں اکیلی چلتے چلتے تھکنے لگی ہوں۔ تمہارا سہارا چاہتی ہوں۔ تم جیسا
ت دار، بلند کردار، مضبوط اعصاب رکھنے والا شاندار مرد زندگی کی راہوں کو مہکا دے گا۔ یقین
و میں ڈائیلاگ نہیں بول رہی۔ یہ میرے دل کی آواز ہے اور آج مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ میں
ہارے جیسے مرد کی ہی منتظر تھی اسی لئے اب تک شادی نہیں کی تھی۔"

ہارون جیسے مسمریزم کے اثر سے پتھر کا بت بن گیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا، کانوں میں گولے
دے کے زوردار دھماکے ہو رہے ہوں۔

"کیا تم آ رہے ہو......؟" وہ بیتابی سے پوچھنے لگی۔

"میں پھر بات کروں گا۔" جانے کس دل سے ہارون نے جملہ مکمل کر کے موبائل آف کیا
ا۔ اس کا تنفس بے ترتیب ہو رہا تھا۔ چہرہ تانبے کی مانند سرخ تھا۔

ان سب باتوں سے قطع نظر اس کے ذہن میں بس ایک ہی بات گونج رہی تھی۔ "مجھے پتا
چل گیا ہے۔"

"آخر کہاں سے۔ یقیناً افراح ہی فوری سورس ہو سکتی ہے۔ وہ افراح کی مینا کے متعلق غلط
فہمی سے آگاہ ہو چکا تھا۔"

دوسرے ہی لمحے وہ تیزی سے ایس ایچ او طارق کے نمبر ڈائل کر رہا تھا۔

☆☆☆

"اماں جی......وہ امداد بھائی آئے ہیں۔ رضوانہ کے والد صاحب۔" صغریٰ نے
ہوئے اماں جی کے پاس بیٹھی چھالیہ کترتی ہوئی صفیہ کو دیکھا تھا۔ جن کی تیوریوں پر لاتعداد
پڑ گئی تھیں۔

"صفیہ۔ بچے مہمان آیا ہے' تمہارے گھر۔ اچھے میزبانوں کی طرح اس کا استقبال
اماں جی نے صفیہ کے تاثرات محسوس کرتے ہوئے فوراً تنبیہہ کی۔

"تم لوگ اسے بٹھاؤ۔ کھلاؤ پلاؤ۔ میں جب تک نماز ادا کرلوں۔" اماں جی تخت چھوڑ
کھڑی ہوئیں۔

"میں کچن میں چائے بنا رہی ہوں۔ صفیہ بھابی' آپ ذرا چل کر ڈرائنگ روم میں
سلام دعا کرلیں۔" صغریٰ نے لجاجت سے صفیہ کی طرف دیکھا تھا۔

وہ مارے باندھے کھڑی ہوئیں۔ بوجھل قدموں سے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئیں
نے اٹھ کر تعظیم دی۔

"کیسی ہو صفیہ بہن!"

"مت کہیں مجھے بہن۔ اپنی ماں اور بھائی کے قاتل کے منہ سے میں یہ لفظ نہیں سن
صفیہ پھٹ پڑی۔

"تم ابھی تک میرے لئے دل میں رنجش رکھتی ہو؟" امداد کی سبزی مائل بھوری آنکھ
معذرت کا احساس ہلکورے لے رہا تھا۔

"ابھی تک سے کیا مراد ہے۔ میں قیامت تک آپ کو معاف نہیں کرسکتی۔ آپ
ہنستا بستا گھر اجاڑا۔ میرے کبرو جوان بھائی کو دربدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور کردیا۔ ا
درگور کیا۔ میں آپ کے لئے دل میں اچھے جذبات کیسے رکھ سکتی ہوں' سردار امداد صاحب۔
کے لہجے میں تلخی کروٹ لے رہی تھی۔ آنکھیں بے اختیار بھیگی جارہی تھیں۔

سردار امداد احمد کے چہرے کے نقوش میں آج بھی وہی جاذبیت اور دلکشی تھی جس
گل کو دیوانہ بنایا تھا۔ میناگل جو صفیہ کے بھائی علی مراد کی بچپن کی منگیتر تھی۔ اس وقت وہ فلم
گل نہیں تھی۔ بلوکسر کے چھوٹے سے گاؤں کی الھڑ لبیلی نار تھی جسے علی مراد ٹوٹ کر چاہتا تھا۔

پھر کیا ہوا۔

سردار امداد کی گاؤں آمد اور مستقل قیام نے جیسے ہوا ہی بدل ڈالی۔

سردار امداد نے میناگل کو علی مراد سے چرایا تھا اور قدرت نے سزا کے طور پر اسے جیتے جی
ت کا نمونہ بنا دیا۔ امداد کو اچانک ہی کوئی ایسی متعدی بیماری لاحق ہوئی جس نے اس کی ایک
ں کو زہریلا کر کے گلا سڑا دیا حتیٰ کہ ڈاکٹرز کو ایک ٹانگ کاٹنی پڑی تھی۔ یوں اب وہ ایک ٹانگ
لنگڑا ہو چکا تھا اور یہ ڈیڑھ سال پہلے کی بات تھی۔

"اس کی سزا مجھے مل گئی ہے۔" امداد نے نقاہت سے کہا۔

"اور ابھی تو یہ سزا اور بڑھے گی۔" صفیہ نے نفرت سے اس کی سمت دیکھا۔ "میناگل اور
اری مشترکہ اولاد تمہاری بیٹی اس کے قبضے میں ہے' اسے کوٹھے پر بٹھا کر وہ تمہاری غیرت کا
زہ نکالنے میں فخر محسوس کرے گی۔"

سردار امداد کے چہرے پر پسینہ پھوٹنے لگا۔

"میں کئی مرتبہ اس کی کوٹھی پر گیا ہوں کہ کسی طرح مجھے اپنی بیٹی کا ٹھکانہ بتادے' اس سے ملوا
ے مگر وہ میری بات نہیں سنتی۔"

امداد کے لہجے میں شکستگی تھی۔ شرمندگی کے سبب یہ نہ بتا سکا کہ وہ جتنی مرتبہ میناگل کی کوٹھی پر
ا تھا ملازمین کے ہاتھوں بُری طرح ذلیل و خوار ہوا تھا۔ میناگل اس کی شکل دیکھنے کی روادار نہیں
ا۔

"تم اس سے بات کر کے دیکھو۔" امداد کے انداز میں لجاجت تھی۔

"کیوں' میری کیا لگتی ہے میناگل۔" وہ تڑخ کر بولیں۔

"تمہاری تو وہ سہیلی رہی ہے۔" اس نے سر جھکا لیا۔ "اور پھر تمہارے بھائی کی منگیتر بھی۔"
بے حد دھیما پڑ چکا تھا۔

"مگر آپ نے کہاں رہنے دیا تھا اُسے منگیتر۔" صفیہ کا جی چاہا' مقابل بیٹھے اس قابل نفرت
ل کا منہ نوچ لے۔ انہوں نے بڑی مشکل سے اپنی خواہش پر قابو پایا تھا۔

"میں مرنے سے پہلے اپنی بیٹی کی شکل دیکھنا چاہتا ہوں۔"

سردار امداد کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو رہی تھیں۔

☆☆☆

میڈم بانو نے موبائل فون پر میناگل سے رابطہ کر کے اسے فوراً لال کوٹھی پہنچنے کی ہدایت دی
کہ اسے اپنا ڈنر ادھورا چھوڑنا پڑا۔

"ابھی ابھی پولیس میں ہمارے ایک وفادار اور مخبر کانسٹیبل نے خفیہ طور پر اطلاع دی
کہ پولیس اس کوٹھی اور دیگر اڈوں پر چھاپہ مارنے والی ہے۔ انہیں خفیہ کے ایک آفیسر کی کزن
تلاش ہے۔" مکمل تنہائی ہونے کے باوجود میڈم بانو سرگوشی میں بات کر رہی تھیں۔ "پولیس
میں کسی خاطر میں ہی نہیں لاتی۔ لال ہرے نوٹوں اور حسن و شباب کا دانہ ڈال کر بڑے سے بڑ
افسر کو رام کرتی رہی ہوں مگر اب کے معاملہ خفیہ ایجنسی کا ہے۔ ظاہر ہے وہ اپنے آفیسر کی مکمل پش
پناہی کر رہی ہے۔"

"میرے لئے کیا حکم ہے میڈم!" مینا فوراً چوکس ہو گئی۔

"تمہاری ایف ٹین والی کوٹھی خالی پڑی ہے۔ کسی کو اُس کی تلاشی لینے کا دھیان نہیں آ
گا۔ تم ایسا کرو۔ اس لڑکی کو لے کر فوراً کوٹھی کی سمت روانہ ہو جاؤ۔ حفاظت کے لئے ڈینی کو سا
لے جاؤ۔ جب پولیس یہاں ریڈ کر کے ناکام ہو کر دوسرے اڈوں کا رخ کرے گی تو میں تمہ
موبائل پر اطلاع..... کر کے لڑکی کو یہیں بلوا لوں گی۔"

"ویسے پولیس میری کوٹھی پر چھاپہ نہیں مارے گی کیوں نہ صبح تک افراح کو وہیں
جائے۔"

"ٹھیک ہے۔ بہر حال میں فون پر رابطہ رکھوں گی۔ اب تم یہاں سے نکل جاؤ۔ ایسا نہ ہو
پولیس دھر لے۔ ڈینی سے کہو اس لڑکی کو کلوروفام سنگھا کر بے ہوش کر کے گاڑی میں ڈال د
ہوش میں رہی تو شور مچا کر راہ چلتی گاڑیوں کو متوجہ کر سکتی ہے۔"

☆☆☆

"کب تک رو رو کر ہلکان ہوتی رہو گی۔ چپ ہو جاؤ۔ شاباش۔"

اس حسن دادا کے معصوم و باحیا پیکر کو یوں حالوں بے حال ہوتے دیکھ کر مینا گل کے دل
عجیب سا دکھ بھر رہا تھا۔

"آج تک اسے کسی لڑکی پر رحم نہیں آیا تھا۔ بہت سوں نے اسی طرح اس سے منت سماجت
کی تھی۔ اس کے پاؤں چھوئے تھے، تڑپی تھیں، مچلی تھیں مگر مینا گل نے مطلق پروانہ کی تھی مگر افراح
کی کمسنی، بھولپن، شفافیت اور سادہ دلی اس کے پاؤں کی زنجیر بن رہی تھی۔ وہ ایف ٹین کی کو
میں پہنچنے کے ایک گھنٹے بعد ہوش میں آ گئی تھی اور تب سے مسلسل اس کی منت کر رہی تھی۔ اس
مینا کے استفسار پر الف تا ے اپنا فیملی بیک گراؤنڈ بتا دیا تھا کہ وہ کس کی اولاد ہے۔ کس طرح ا

ل سے کزنز کے ہمراہ سیر و تفریح کے لئے گھومتی ہوئی میڈم بانو کے ہتھے چڑھی تھی۔ مینا نے
اس کا جائزہ لیا تھا۔ افراح کے انداز و اطوار بتاتے تھے کہ وہ کسی انتہائی شریف، معزز اور دیندار
ے تعلق رکھتی ہے۔ اس کی اداؤں میں حد درجہ سادگی و بے ساختگی تھی۔

پھر ہارون کے حوالے سے بھی وہ مینا کے لئے قابل غور بن چکی تھی۔ اس کا جی نہیں چاہ رہا تھا
درجہ خاندانی و نیک نفس لڑکی کی زندگی برباد کرنے کو۔

"دیکھئے۔ اگر آپ کی کوئی بیٹی ہوتی تو وہ بھی میری عمر کی ہوتی۔ آپ مجھے وہی سمجھ لیجئے۔
! میں میڈم بانو کے متعلق اچھی طرح جان چکی ہوں۔ مر کر بھی اس غلاظت میں خود کو آلودہ
کروں گی۔ اگر میں یہاں سے نہ نکل سکی تو اپنی جان دے دوں گی مگر عزت..... نہیں..... ہرگز
ں۔" یکا یک افراح بپھری ہوئی لہر کی طرح برستی آنکھوں سمیت عزم باندھنے لگی۔

"میری بیٹی؟" مینا گل کے بدن میں بے حسی کا سلگتا ہوا لاوا اچانک ہی مدھم پڑنے لگا تھا۔
ے دل پر گھونسا پڑا۔

"مشعل..... میری جان..... میری زندگی....." پھر اس نے جھرجھری لے کر افراح کا چہرہ
ھا۔ اسے اس پر مشعل کا گمان ہوا۔ ویسا ہی مصفا، پاکیزہ اور دل موہ لینے والا چہرہ۔

"تم اپنی جان پر ظلم نہیں کرو گی۔ وعدہ کرو اور....."

مینا گل کا لہجہ کھویا کھویا سا تھا۔ "میں کوشش کرتی ہوں۔" پھر وہ فوراً ہی کمرے سے نکل گئی
۔ رات کے تین بج رہے تھے اور صبح نو بجے میڈم بانو کو افراح کو لینے آنا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر
انہوں نے "او کے" کی رپورٹ دی تھی۔

"ہوں۔ مینا..... کیا بات ہے ڈارلنگ۔ خیریت ہے ناں؟" تین چار دفعہ بیل بجنے کے
میڈم بانو نے موبائل آن کیا تھا۔

"میڈم!" مینا کا لہجہ ہیجان سے مرتعش سا تھا۔ "میں نے تا عمر آپ سے کچھ نہیں مانگا۔ کوئی
بات نہیں کی مگر آج درخواست کرتی ہوں جسے آپ کو ضروری قبولنا ہو گا۔"

"کہو مینا..... تم جانتی ہو میں اپنے آدمیوں میں سب سے زیادہ تم پر اعتماد کرتی ہوں۔"
یڈم بانو نے رسان سے کہا۔

"میڈم آ..... آپ..... افراح کو چھوڑ دیں۔" اس نے ہمت کر کے کہہ دیا۔

"کیوں.....؟" میڈم بانو کا لہجہ یکلخت سخت ہو گیا۔

"دیکھیے۔ اس میں ہمارا ہی فائدہ ہے۔ ہارون خفیہ کا بندہ ہے۔ کوئی کھڑاک بھی پیدا کر سکتا ہے۔" مینا گل نے جلدی سے بات سنبھالی تھی۔

"مگر یہ بھی تو سوچ کہ اس لڑکی کے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد لال کوٹھی کے کتنے ہی پوشیدہ راز خفیہ اور پولیس تک پہنچ جائیں گے۔ لگتا ہے' تم نے کچھ عرصے سے نیند صحیح طرح نہیں لی۔ تمہارا سیکرٹری حیات خواجہ بھی تمہاری بدلی ہوئی ذہنی رو پر حیرانی ظاہر کر رہا تھا۔ جاؤ آرام کرو......" ان کے انداز میں رکھائی' تنبیہہ اور سرزنش تھی جسے مینا گل بخوبی سمجھ سکتی تھی۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی پھیل گئی تھی' تاہم وہ اپنے موقف پر قائم رہی۔

"اسے میری التجا سمجھ لیجیے میڈم۔"

"تمہیں اس سے کیوں ہمدردی ہے؟" ان کا لہجہ غضب آلود تھا۔ مینا گل کی تھرتھری چھوٹنے لگی۔

"میڈم' وہ بہت معصوم ہے۔" وہ تھوک نگل کر بولی۔

"اس کی یہی معصومیت تو مجھے بھائی ہے۔ بہرحال میں صبح نو بجے آ جاؤں گی اور ہاں اس سے کی گئی ہمدردی تمہیں بہت مہنگی بھی پڑ سکتی ہے۔ تم مجھے اچھی طرح جانتی ہو۔" اس کے ساتھ ہی موبائل آف ہو گیا مینا گل کے ذہن میں خوف کے جھکڑ چلنے لگے تھے۔

"میں تمہاری مدد نہیں کر سکتی اچھی لڑکی۔" بالآخر وہ تھکے تھکے انداز میں چلتی ہوئی دوبارہ افراح کے کمرے میں آ گئی تھی۔

☆☆☆

صبح کے آٹھ بجے تھے۔ مشعل نماز اور تلاوت کے بعد جانماز لپیٹ رہی تھی' جب ہارون کا فون آیا۔

"میرا وجدان کہہ رہا ہے کہ ہو نہ ہو افراح میڈم بانو اور مینا گل کے قبضے میں ہے۔ اگرچہ پولیس کو غچا دے چکی ہیں مگر میرا شک بدستور قائم ہے۔ کیا تم اسی وقت مینا گل کی کوٹھی پر جا سکتی ہو؟"

ہارون نے ساری بات بتانے کے بعد آہستگی سے سوال کیا۔ چاہتا تو وہ خود بھی ظاہر ہے ساتھ مل کر خفیہ نگرانی کر کے پتا چلا سکتا تھا مگر اس میں بہت سا وقت ضائع ہو جاتا' جبکہ مشعل وہاں جا کر مینا گل سے تعلق کی بنیاد پر بے تکلفی سے اِدھر اُدھر دیکھ کر افراح کی موجودگی کی تصدیق کر سکتی

"تم ایڈریس لکھوا دو' اس نئی کوٹھی کا۔ میرے سے مس ہو گیا ہے اور ہاں پریشان نہیں ہونا۔ انشاء اللہ افراح جلد ہی مل جائے گی۔ اگر وہ مینا گل کے پاس ہی ہے تو میں ضرور ہمراہ لے کر آؤں گی بھلے سے مجھے اپنا آپ رہن رکھوانا پڑے۔"

مشعل کا دماغ بھٹی کی طرح دہک رہا تھا' وہ رش ڈرائیونگ کرتی ہوئی ایف ٹین کی کوٹھی تک [illegible]۔

"میڈم سے کہو' مشعل آئی ہے۔ صرف نام بتا دو۔ آگے وہ جو بھی کہیں گی۔" اس نے دیوہیکل چوکیدار کو اکھڑے ہوئے انداز میں مخاطب کیا تھا۔

چند ساعت بعد وہ ڈینی کے ہمراہ اندر جا رہی تھی۔

"مشعل ...... چاند...... تم یہاں کیوں آ گئیں۔" مینا بیک وقت مسرت اور خوف کے [illegible]ت سے مغلوب ہو رہی تھی۔ مشعل کو اپنے گھر کا مہمان بنانا اس کی دلی آرزو رہی مگر اس وقت میڈم بانو کسی بھی لمحے کوٹھی پر پہنچنے والی تھیں' اس کی آمد نے اسے ہراساں کر ڈالا تھا۔

"افراح کو کہاں چھپایا ہے۔" مشعل نے انتظار کیے بغیر دوٹوک بات شروع کی تھی۔ اس لہجے میں دھمکی' تندی اور قطعیت تھی۔ مینا گل بھونچکا رہ گئی۔

"تم اس وقت یہاں سے جاؤ مشعل۔ میں فون پر بات کروں گی۔" وہ اضطراری انداز میں گیٹ سے نمودار ہوتی میڈم بانو کی کار دیکھ رہی تھی۔

"میں افراح کو ساتھ لے کر جاؤں گی ورنہ مجھے بھی اس کے ساتھ نیلام کر دیجیے' عزت خریداروں کے ہاتھوں۔" وہ چیخ گئی۔

مگر مینا کے پاس اس کے سوال کا جواب دینے کا وقت نہیں رہا تھا۔ میڈم بانو سر پر پہنچ گئی تھیں اور مینا گل کی توقع کے عین مطابق مشعل کا ساحرانہ اور زہد شکن حسن دیکھ کر اُن کی رال ٹپکنے لگی۔

"ارے یہ کون ہیں بھئی۔" ان کی گہری نظریں ندیدوں کی طرح مشعل کو ٹٹول رہی تھیں۔

"یہ بس ایک ملاقاتی ہیں۔ تم جاؤ مشعل پھر بات ہو گی۔ میرے گیسٹ آئے ہیں۔"

مینا گل کا بس نہیں چل رہا تھا' جادو کے زور سے مشعل کو یہاں سے غائب کر دے۔ مشعل [illegible] انجان ہستی کے سامنے یہ معاملہ نہیں کھول سکتی تھی۔ وہ بادل ناخواستہ تھوڑی دیر بعد آنے کا

سوچ کر روانہ ہوگئی۔

"بھئی سچ پوچھو تو میں تمہاری طرف آئی تو بہت غصے سے تھی مگر اس موہنی صورت کو د
سارا غصہ ہوا ہو گیا ہے۔لو تم بھی کیا یاد کرو گی۔ میں تمہاری درخواست قبول کرتے ہوئے افرا
چھوڑنے پر آمادہ ہوں مگر شرط یہ ہے کہ پہلے اپنی اس "ملاقاتی" کو کسی طرح "لائن" پر لے آ
نام ہے اس کا مشعل۔سو تم مجھے مشعل دے دو اور میں اس کے بدلے افراح کا نقصان برد
کرنے کو تیار ہوں۔"

❤❤❤

"یہ کیسے ہو سکتا ہے میڈم۔ میں کیا جانوں' کون ہے مشعل۔بس سرسری سی سلام دعا ہے۔"
نے دھڑ دھڑاتے دل کے ساتھ مصنوعی بے پروائی طاری کرتے ہوئے جواب دیا۔

"مگر کھوج تو لگا سکتی ہو۔تمہارے لئے یہ کام نیا تو نہیں ہے۔" میڈم بانو بغور اس کا چہرہ
ہی تھیں۔مینا کے لئے اُن سے نظر ملانا مشکل ترین مہم کی طرح لگ رہا تھا۔

"میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔" وہ ٹالنے والے انداز میں گویا ہوئی۔"آپ اندر آجائیں۔افراح
کرنے پر آمادہ نہیں ہے۔آپ بھلے سے اُسے اپنے ساتھ لال کوٹھی لے جائیں۔وہ بہت
رہو رہی ہے۔جب سے آئی ہے' پانی کا گھونٹ بھی نہیں بھرا۔"

"خیر اڑیل گھوڑی کو سدھانا' ہمیں خوب آتا ہے۔"

میڈم بانو سر جھٹک کر اندر چلی گئیں۔مینا گل نے ان کے پیچھے چلتے ہوئے سکون کی سانس
لی۔

وہ کیسے جان سکتی تھی کہ اس وقت میڈم بانو کا شاطر اور ہشیار ذہن کون سے تانے بانے بن
ہے۔

افراح بستر پر بے سدھ لیٹی تھی۔سیاہ بل کھاتی زلفیں چہرے پر منتشر تھیں۔گلابی نرم اور ملیح
نیند پڑ چکا تھا۔اس نے کل دوپہر سے کوئی چیز نہیں کھائی تھی۔مینا کی لاکھ منتوں کے باوجود وہ
پینے پر بھی آمادہ نہیں ہوئی تھی۔

"اسے کیا ہوا ہے؟"

"کمزوری کی وجہ سے نڈھال پڑی ہے۔" مینا گل نے تشویش بھری نظروں سے افراح کا
بے ہوش سراپا جانچا۔

میڈم بانو کچھ دیر تک ٹکٹکی باندھے مینا گل کی سمت دیکھتی رہیں پھر کچھ سوچ کر معنی خیز انداز
ہلایا۔مینا گل اندر ہی اندر اُن کے تیوریوں سے خائف ہو رہی تھی۔

''ٹھیک ہے۔ ابھی تم اسے اپنے پاس رکھو۔ بہلا پھسلا کر کھانے پینے پر راضی کرو۔ میں
آؤں گی اسے دیکھنے۔''

وہ ٹھہرے ہوئے پُرسکون انداز میں کہہ کر باہر نکل گئی تھیں۔

مینا ششدر کھڑی اُن کے رمز سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مینا کی توقع کے عین مطابق بڑ
بانو کے جانے کے پندرہ منٹ بعد مشعل دوبارہ آن ٹپکی تھی۔

''تم یہاں کیوں آ گئی ہو۔'' مینا بے طرح ہراساں ہو گئی۔ ''جاؤ میری جان۔ گھر جاؤ۔ تم
یہاں آنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔'' مینا کو یہ سوچ سوچ کر ہول آ رہا تھا کہ اگر میڈم بانو کو
کے اور مشعل کے رشتے کی حقیقی نوعیت معلوم ہو گئی تو وہ مشعل کو چیل کی طرح جھپٹ لے گی۔

''میں تو مرنے سے پہلے بھی وصیت کر کے مرتی کہ آپ کی رہائش گاہ سے سو گز کے فا
سے میرا جنازہ لے جایا جائے۔ آپ کے پاس آنا' آپ کو دیکھنا' آپ سے ملنا تو کجا میں آ
سوچنا بھی گناہ سمجھتی ہوں۔ آپ نے اس ملک کے ساتھ' بھولی بھالی لڑکیوں کے ساتھ او
میرے ساتھ جو زیادتی کی ہے' اس کا ازالہ آپ کی جان لے کر بھی نہیں کیا جا سکتا۔ مجھے تو
مجبوری کھینچ لائی ہے۔ اس معصوم و مظلوم لڑکی کو آپ کے چنگل سے چھڑانے کے لئے مجھے آ
قتل بھی کرنا پڑا تو اس سے دریغ نہیں کروں گی۔''

''اُف اتنی نفرت' اتنی حقارت' اتنا غضب۔''

وہ اسے یوں دیکھ رہی تھی جیسے وہ مینا گل کی بجائے کوئی خوفناک عفریت ہو۔ کوئی بھیا
اور کریہہ شیطانی چہرہ ہو۔ مینا اس کے لبوں سے پھوٹتے تیزابی جملے سہار نہ سکی۔

''بس کرو۔ خدا کے لئے بس کرو۔ اگر تمہیں پتا چل ہی چکا ہے تو ایسی سنگدلی تو نہ برتو۔''

مینا گل پر رقت طاری ہو گئی۔ اس کا لہجہ بھرّایا ہوا تھا۔

''آپ جیسے بھی خدا کے نام لیوا ہوتے ہیں؟ خدا کو یاد کرنے کی نوبت کیونکر آ گئی ما
مشعل نے جیسے پتھر سے پھوڑے۔ اس کا لب ولہجہ قطعی بے رحم اور سنگدلانہ تھا۔

''تم یہاں سے جاؤ اور دیکھو دوبارہ اِدھر نہ آنا۔ اسے میری درخواست سمجھو لو۔'' مینا
ہوئے انداز میں اس کی سمت دیکھا تھا۔

''میں افراح کو لیے بغیر نہیں جاؤں گی۔'' مشعل نے کھردرے لہجے میں مخاطب کیا۔
بے بسی سے ہونٹ چبانے لگی۔ وہ سمجھ چکی تھی کہ وہ اسے بے وقوف نہیں بنا سکتی تھی۔

''کیا وہ تمہاری دوست ہے یا؟'' مینا کو تجسس ہوا۔

''میری جاننے والی ہے۔'' اس نے بگڑے ہوئے انداز میں جواب دیا۔ ''باتوں میں وقت
نہ کریں۔''

''تم نہیں سمجھ سکو گی۔ یہ ناممکن بات ہے۔ تم اس معاملے میں ہاتھ نہ ڈالو۔ اگر اسے رہائی
لن ہوتا تو میں ضرور ایسا کر گزرتی۔''

''سوچ لیں۔'' مشعل نے چیلنجنگ انداز میں اُس کی طرف دیکھا۔ ''ہو سکتا ہے۔ آپ کا یہ
یرے دل پر چھائی نفرت کی کائی کو کچھ کم کر دے۔ اگر آپ چاہتی ہیں کہ میرے دل میں
کے لئے کوئی گنجائش نکل آئے تو میرا مطالبہ ماننا ہوگا۔''

مینا جانتی تھی اگر وہ ایسا کر گزری تو میڈم بانو اسے زندہ نہیں چھوڑیں گی مگر مشعل کی محبت' اس
ردری حاصل کرنے کے لئے وہ اس پل صراط کو عبور کرنے کی کوشش کر سکتی تھی۔

''تو...... تو کیا واقعی پھر تم مجھے معاف کر دو گی' اپنے ماضی کو بھلا کر میرے سینے سے لگ جاؤ
مجھ سے نفرت نہیں کرو گی۔''

مینا گل کی آنکھوں' چہرے اور لہجے میں جیسے زندگی کی چمک در آئی۔ اُس نے بے قراری
شعل کے شانوں کے گرد بازو ڈال کر اُسے اپنے کلیجے میں سمونے کی سعی کی تھی۔

مشعل اس کے ہاتھ جھٹک کر پرے ہٹ گئی۔

''آپ سے نفرت کرنا میری سزا بن چکی ہے۔ اسے تو بھگتنا ہی ہوگا۔''

مشعل کا لہجہ بے اعتنائی کی گرد سے اٹا ہوا تھا۔ وہ کبیدہ خاطر سی ہو کر بولی۔ ''اور میں آپ کو
ف کرنے کا حوصلہ بھی خود میں نہیں پاتی۔'' مینا گل کا چہرہ بجھ گیا۔ ''ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ افراح کو
ڑانے کے بعد میں آپ کو اتنی گھناؤنی اور کریہہ شخصیت تصور نہ کروں۔ میں سمجھوں گی' کم از کم
ڑی سی انسانیت تو بہرحال موجود ہے آپ میں۔''

مینا گل کا جی چاہا' دونوں بازوؤں میں مشعل کا وجود جکڑ کر اُسے جھنجوڑ ڈالے۔

''میں اکیلی ہی قصوروار نہیں ہوں۔ اس پاپ میں اور بھی بہت سے لوگ شریک ہیں۔ تم مجھ
ے کیوں شاکی ہو۔ تمہیں وجود میں لانے والا' تمہارا باپ بھی اس کھیل میں آخر تک ساتھ رہا
ہے۔ مجھے اپنے لفظوں سے چھلنی نہ کرو' اپنی نفرت کی برچھیاں میرے دل میں اُتار کر مجھے قتل نہ
کرو۔''

"میں افراح سے ملنا چاہتی ہوں۔" وہ اپنی بات پر اڑی ہوئی تھی اور مینا گل کا دل کرب سے پھٹا جا رہا تھا۔

"مجھے کچھ سوچنے کی مہلت دو۔" مینا گل نے لجاجت سے اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ "اس یہاں سے چلی جاؤ اور سنو کسی سے کوئی تذکرہ نہ کرنا۔ میں تمہیں خود فون کروں گی، تھوڑی د شاباش، جاؤ میری بچی۔"

☆☆☆

میڈم بانو مینا گل کی لاہور کی رہائش گاہ کے نمبر ملا رہی تھیں۔

"کون، عذرا۔ کیا حال ہے بھئی۔ ذرا حیات خواجہ کو فون دو۔ ہاں حیات، کیا حال تمہارے ذمے ایک کام لگا رہی ہوں۔ کل سے خود کو ڈیوٹی پر سمجھو۔" اُن کے لہجے میں تحکم تھا

"جی میڈم" "آپ حکم کریں۔" حیات خواجہ مؤدب و مستعد ہو کر بولا۔ عذرا اور حیا میڈم بانو کے پرانے نمک خوار تھے۔ حقیقت میں میڈم بانو نے ہی انہیں مینا گل کی خدم لیے اس کوٹھی پر تعینات کیا تھا۔

"تم نے مینا گل کا پیچھا کرنا ہے۔ وہ کیا کرتی ہے، کس سے ملتی ہے، کہاں جاتی ہ سے فون پر بات کرتی ہے، تمہیں یہ سب کچھ دھیان میں رکھنا ہے اور مجھے ہر ہفتے رپورٹ چا عذرا کو بھی سمجھا دینا۔ تعاقب ہوشیاری سے کرنا ہے۔ اُسے بالکل بھی شبہ نہیں ہونا چاہیے اور گل کی سیف میں کچھ اہم خفیہ فائلیں پڑی ہیں، وہ مجھے پہنچا دو۔"

"آپ بے فکر ہو جائیں میڈم۔ میں اپنا کام سمجھ چکا ہوں۔" حیات خواجہ نے تا سے کہا۔

میڈم بانو نے فون رکھ دیا۔

"میرے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ تم نے میری طاقت کا اندازہ لگانے میں غلطی ک ڈارلنگ۔ پہلی بار تمہارے اندر مجھ سے وفاداری کے بجائے کسی کی طرف داری کا جذبہ جاگ اس جذبے کو کچلنا ہی پڑے گا ورنہ آگے چل کر بساط اُلٹ سکتی ہے۔" میڈم بانو کے چہ اسرار تاثرات رقم تھے۔

☆☆☆

مینا گل سخت پریشان تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ ایک طرف بیٹی کی خوش

ا اور دوسری طرف میڈم بانو کی حکم عدولی کا خوف۔

"نہ جانے ابھی زندگی کو مجھ سے کتنی اور آزمائشیں مطلوب ہیں۔" اس نے ٹھنڈی سانس "سوچا تھا، ہارون سے شادی کر کے فلمی دنیا سے مکمل کنارہ کشی کر لوں گی۔ میں ایک پُرسکون زندگی کے خواب دیکھنے لگی تھی مگر اب پھر دوراہے پر آن کھڑی ہوئی ہوں۔"

شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے اور مینا گل اپنے بیڈروم میں مقید اپنے حال و ماضی کا جائزہ لے رہی تھی۔

"سچ تو یہ ہے کہ میرے ساتھ جو کچھ ہوا، وہ میرے اعمال کا نتیجہ ہے۔ مجھ جیسی عورت کے ہی ہونا چاہیے تھا۔ نفس اور شہرت کے پجاری اسی انجام سے دوچار ہوتے ہیں۔"

وہ اپنے ماضی کی کڑیاں ملا رہی تھی۔ دور بہت دور اُس کا ماضی یاد کے اندھیروں سے طلوع تھا۔

☆☆☆

موجودہ دور میں نئی نسل کی بے راہ روی کا الزام میڈیا کے سر تھوپنا بڑا آسان ہو گیا ہے مگر ے تین چار دہائیاں قبل جب دیہاتوں میں ٹی وی، فلم، اخبارات و رسائل اور ادب کے منتے ائے جاتے تھے، اس وقت قبل از وقت آگہی کہاں سے آتی تھی۔

یہ سوچنے کی بات ہے مگر ہمارے یہاں کوئی ان حقائق کا کھوج لگانا پسند نہیں کرتا کہ بزرگوں لطیاں کون پکڑے اور کس میں اتنی جرأت ہے۔

آج کے دور کے بزرگ ٹھسے سے میڈیا کو اخلاقی زوال کا سبب ٹھہرا کر کوسنے دے کر ہاتھ ُتے ہوئے اپنے تئیں فارغ ہو جاتے ہیں۔

ٹی وی معاشرے کو بگاڑ رہا ہے۔ اخبارات اخلاقیات مسخ کر رہے ہیں۔ رسائل بے حیائی اخلاق باختگی سکھا رہے ہیں۔ فلمیں اور ڈش نے نئی نسل تباہ کر کے رکھ دی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

مگر یہ بزرگ حضرات اپنے گریبانوں میں جھانکنے سے گھبراتے ہیں۔ اُن کے زمانوں میں بڑا کی کرشمہ سازیاں ناپید تھیں مگر بگاڑ بدستور موجود تھا۔ اس کا ذمے دار کون ٹھہرا۔ نسل نو کی تباہی بادی کا ذمے دار تو بقول ان کے میڈیا کی چمک دمک ٹھہری مگر پرانی نسل کی اخلاقیات کو کس ے تباہ کیا؟ اس زمانے میں بھی جنس کا اور سفلی خواہشات کا شعور بدرجہ اتم موجود تھا۔ ذہنی بالیدگی کی بدستور نمایاں تھی۔ لوگ بہکتے تھے، راہ سے بھٹکتے تھے، ظلم و زیادتی کے سلسلے رواں دواں تھے۔

اخلاقی تنزلی کے نشان سلامت تھے۔ ہوس پوری کرنے کے جملہ لوازمات سے مکمل واقفیت کی لہو
ولعب میں پڑ کر خاندانی شرافت ونجابت کا جنازہ نکالنے والوں کی کسی دور میں کمی نہیں رہی ہے پھر
عہد حاضر ہی کو کیوں معتوب ٹھہرایا جاتا ہے!!!

پُرانے زمانے میں میڈیا کی پوسٹ گھریلو ماحول نے سنبھالی ہوئی تھی۔ خاص طور
دیہاتوں میں فطری وجبلی تقاضوں کے متعلق قبل از وقت آگہی کا بڑی معصومیت سے اہتمام کیا
جاتا ہے اور یہ سب کچھ بے خبری کے عالم میں ہوتا رہا تھا۔ کسی کو شعور ہی نہیں تھا کہ یہ گھریلو طریقہ
کار نئی نسل کے لئے کس درجہ نقصان دہ اور ضرر رساں ہو سکتا ہے (اور کچھ علاقوں میں تو شاید اب
بھی نہیں ہے)

دو کمروں کا چھوٹا سا آنگن جس میں بے شمار لوگ پرورش پا رہے تھے۔ رات کو ایک کمرے
میں میاں بیوی سوتے۔ ان کے ہمراہ نو ماہ کی عمر سے لے کر دس بارہ برس کے عمر کے بچے بھی اپنی
چھوٹی چھوٹی پلنگڑیاں ڈال کر ماں باپ کے کمرے میں سوتے تھے۔ اس یکجائی کے عالم میں فطری
تقاضے جوش مارتے تو ملگجے نیم تاریک ماحول میں رات کے پہر طلب و رسد کا سلسلہ شروع ہو
جاتا۔ آنکھ کھلنے پر گیارہ بارہ برس کی بیٹی یا اس عمر کا لڑکا ماں باپ کو جذبوں کی آنکھ مچولی کرتے
دیکھتا تو بے وجہ پورے پنڈے میں سنسنی اور ہیجان دوڑ جاتا۔ تصور عجب رنگ برنگے خاکے کھینچنے
لگتا۔

اس کے علاوہ دن بھر میں گاؤں کی بڑی بوڑھیاں' بیاہی عورتیں اپنی محفل سجاتیں تو کچی عمر کی
لڑکی بالی شوق سے پاس آ بیٹھتی۔ آنگن میں کھیلتے بچے بھی ماؤں' بھابیوں کی بیباک اور رنگین آپ
بیتی سن کر چسکے لیتے اور یوں قبل از وقت آگہی اُن کے ذہنی وجسمانی ہیئت میں تباہ کن تبدیلیوں کا
سبب بن جاتی تھی۔

بیاہی عورتوں نے کبھی یہ سوچنے کی زحمت ہی نہیں کی تھی کہ وہ جو سرعام اپنے ازدواجی تجربوں
کی روئیداد پرلذت آمیز انداز میں اپنی ہمسائی' بھابی' بہن یا ماں کو بچوں کے بیچ بیٹھ کر سنا رہی ہیں' ذہن
خیز عمر کے لڑکے لڑکی کے اندر کسی طرح قبل از وقت جوانی کا بارود بھر رہی ہیں۔

ہر شے اپنے وقت پر ہی اچھی لگتی ہے۔ نو عمر بچوں کو ایسے ماحول' کتابوں' رسالوں اور فلموں
سے دور رکھنا چاہیے جو نوجوان نسل کے لئے ترتیب دیے جاتے ہیں۔

آگہی بُری چیز نہیں ہے۔ برائی قبل از وقت آگہی سے پیدا ہوتی ہے۔ ظاہر ہے' نوخیز ذہن

ر جو سبق اپنی طبعی عمر سے پہلے چوری چھپے بڑوں سے سن گن لے کر یا ڈائجسٹوں سے بڑھ کر
کریں گے وہ اُن کے لئے نقصان دہ تو ہو گا کیونکہ وہ چیز تو انہیں جوان ہو کر شعور کی منزلوں پر
ھ کر سیکھنی چاہیے تھی۔

بلوکسر چکوال کا ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ یہاں ابھی علم کی روشنی تو اتنی نہیں پھیلی تھی کہ ٹی وی'
اور رسائل کو مورد الزام ٹھہرا کر والدین اپنی ناقص تربیت پر پردہ ڈالتے' البتہ یہ ضرور تھا کہ
ں کے لئے پرائمری اور لڑکوں کے لئے مڈل اسکول بن چکا تھا۔ شروع شروع میں تو اسکول
والے بچوں کی کل تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی تھی پھر آہستہ آہستہ تعداد میں اضافہ ہونے لگا
موعی اعتبار سے ماحول میں جہالت وغفلت کا عنصر بدرجہ اتم موجود تھا۔ وضع دار گھرانے تو خیر
ٹڑی پر چل رہے تھے مگر بیشتر گھروں میں ذہنی پسماندگی نے عجب گل کھلا رکھے تھے۔

مینا گل کا گھرانا بھی اُن میں سے ایک تھا۔

وہ کل سات بہن بھائی تھے۔ مینا کا نمبر آخری تھا۔ اس لحاظ سے اس نے اپنے تین بھائیوں
ین بہنوں کی اُٹھتی جوانیوں کے سارے ہی پوشیدہ راز ماحول سے چُرا لئے تھے۔ کھلی ڈلی فضا
دو بھابیاں آ چکی تھیں اور دو بہنوں کا بیاہ ہو چکا تھا۔ بس مینا اور مینارہ گئی تھیں۔ مینا اس سے
سال بڑی تھی۔ اس کی بات پکی ہو چکی تھی۔ آج کل میں وہ پیا دیس سدھارنے والی تھی۔ خود
کی بھی بچپن میں ساتھ والے گاؤں میں ابا کے جاننے والوں کے ہاں منگنی ہو چکی تھی۔ ابا کا منجھلے
کی شادی کے بعد انتقال ہو گیا تھا۔

علی مراد کا گھرانا بڑا دیندار' شریف اور سلجھا ہوا تھا۔ اس کا باپ شوکت علی آٹھ جماعتیں پاس
اس نے اپنے بیٹے علی مراد کو بھی بڑے شوق سے تعلیم دلوائی تھی۔ جب علی مراد آٹھویں میں تھا تو
کت علی سانپ کے کاٹے سے چل بسا۔ تب گھر کی ذمے داری علی مراد پر آ گئی۔ اس نے پڑھائی
ہوڑ کر زمینیں سنبھال لیں۔ بہر حال گزر بسر ہونے لگی۔

یوں بھی اتنا بڑا کنبہ تو تھا نہیں۔ ماں' چھوٹی بہن صفیہ اور وہ خود۔ صفیہ گاؤں کے اسکول سے
نچ جماعتیں پاس کر کے اپنی شہر والی خالہ کے ہاں چلی گئی تھی جہاں سے اُس نے مڈل کلاس تک
ڑھا۔ اس کے بعد علی مراد اُسے واپس گاؤں لے آیا تھا۔ اماں کی طبیعت خراب رہنے لگی تھی۔ وہ
ہت نحیف ہو گئی تھیں اور گھر کے کام کاج میں دشواری پیش آتی تھی۔ علی مراد کی طرح صفیہ بھی ایک
گی ہوئی' باشعور اور پاکیزہ ذہن کی لڑکی تھی۔ اُسے سوائے کام کاج اور پڑھائی کے کسی چیز سے

دلچسپی نہیں تھی۔ خالہ نے اسے میٹرک کی کتابیں لے کر بھجوادی تھیں اور اب وہ پرائیویٹ تیاری
رہی تھی۔ دونوں بہن بھائی کی نیک سیرتی' شرافت اور حیاداری کی مثالیں دی جاتی تھیں۔

گو کہ مینا گل صفیہ کی ہونے والی بھاوج تھی مگر مینا کی اُس سے زیادہ نہیں بنتی تھی۔ اسے ا
ٹھس چپ چاپ اور سیدھی سادھی لڑکیاں اچھی نہیں لگتی تھیں۔

''یہ تو ہر وقت منہ میں گھنگھنیاں کیوں ڈالے رہتی ہے۔'' مینا گل اس سے ملنے آتی تو اس
کم گوئی پر تیوری چڑھا کر پوچھتی۔

وہ نٹ کھٹ سی' چلبلی اور شوخ وشنگ حسینہ جس کی جوانی پارے کی طرح تھرکتی تھی' صفیہ
سنجیدہ سادہ لب ولہجے کو کہاں خاطر میں لاتی تھی۔

''تیرے پاس تو بات کرنے کو کوئی قصہ ہی نہیں ہوتا۔'' مینا حسین پیشانی پر بل ڈال کر ا
پھلالیتی۔

''کیا بولوں۔'' صفیہ سادگی سے مسکرادیتی۔

''لے۔ لڑکیوں کے پاس تو ان گنت قصے ہوتے ہیں۔ آج گاؤں کے کس جیالے نے
چلتے ہاتھ پکڑ ایا آنکھ ماری۔ کس کے ساتھ کماد کی فصل میں گھس کر چھپیاں ڈالیں۔ کس کے بلا
پر آدھی رات کو کوٹھے پھلانگ کر راز ونیاز کیے۔ ارے بھئی' لڑکیوں کی تو اتنی بہت سی باتیں ہو
ہیں۔''

''چھی چھی۔ یہ سب گندی باتیں ہیں۔ کنواری لڑکیوں کو زیب نہیں دیتیں۔'' صفیہ فوراً تو
تلا کرتی۔

''تیرے اندر تو بڈھی روح بیٹھی ہوئی ہے۔ ان کتابوں نے تیرا مغز خشک کر دیا ہے۔
پڑھا کر اتنا۔ دیکھ تو شکل پر کیسی زردی کھنڈ گئی ہے۔ سنا ہے' زیادہ پڑھنے سے بال چٹے ہو جا
ہیں۔''

مینا اپنی بڑی بڑی سنہری خواب ناک آنکھیں پھیلا کر ''اقوال زریں'' سناتی۔ وہ
پانچویں میں فیل ہو کر گھر بیٹھ گئی تھی۔ پڑھائی میں اس کا جی لگتا ہی کہاں تھا۔ اوپر سے اتھری جوانی
وہ الھڑ ڈاچی کی طرح یہاں سے وہاں ٹھمکے مارتی پھرتی۔

گھر پہ کوئی پوچھنے تاچھنے والا تھا نہیں۔ بھائی سارا دن کھیتوں میں مصروف رہتے۔ بھابیاں
اپنے ڈھیروں ڈھیر بچوں کو سنبھالنے میں دن گزار دیتیں اور ماں کو یہاں وہاں آس پڑوس

ردوں میں گھس کر یا کنوئیں پر بیٹھ کر حقہ پینے اور اِدھر اُدھر کی غیبتیں کرنے سے فرصت نہیں ملتی
پھر وہ آخر کی اولاد تھی جو زیادہ بہن بھائیوں میں اس طرح رل کھل کر خودرو پودے کی طرح
پھولتی جارہی تھی۔ اماں بچے پال پال کر سارے ارمان نکال چکی تھیں۔ سو مینا کی باری میں
جوان بیٹیوں اور بڑی بہو کی گود میں ڈال کر بے فکر ہو گئی تھیں۔ اسی ہجوم میں وہ بھی پل گئی۔

مگر ایسے کہ اُس کا ذہن گندی نالی کے کیڑے کی طرح نفسی وجنسی غلاظتوں سے لتھڑ چکا

اس نے بھائی اور بھاوجوں کے درمیان ازدواجی رشتے کی بہت سی ''بے احتیاطی'' حرکتیں
ی سے تاڑی تھیں پھر بہنوں کے بے باک اور بیہودہ بیانیہ انداز نے اس شوق کو مزید مہمیز کیا۔
وہ تیرہ چودہ برس کی عمر میں ہی اندر سے ''پکی'' عورت بن چکی تھی اور بذات خود تجربے کی چاہ
تی تھی۔

اس نے بارہا علی مراد کے اندر طلب کی آگ بھڑکا کر اسے اپنی ''لائن'' پر لانے کی کوشش کی
ی مگر علی مراد کے سنجیدہ معصوم اور شریف اطوار مینا گل کا سارا جوش سرد کر دیتے تھے۔

مزید دو تین برس گزرے تو اُس کے اندر جوانی کا ٹھاٹھیں مارتا آتش فشاں پوری طرح
کروٹ لے کر بیدار ہو گیا۔ جنس مخالف سے اتصال کے اسرار ورموز سے وہ اپنی بھابیوں' بہنوں
اور بیاہی سہیلیوں کی بدولت بڑی حد تک واقف ہو چکی تھی۔ اب وہ لفظی وتصوراتی مزے کے
بجائے عملی کیف حاصل کرنے کی جستجو میں تھی۔

وہ اٹھارہ برس کی ایک جیتی جاگتی قیامت بن چکی تھی۔

☆☆☆

ضلع چکوال سے بارہ کلومیٹر شمال کی طرف واقع گاؤں بلوکسر کے باہر سے گزرنے والی
طویل پکی سڑک پر بالآخر اس کے سفر کا اختتام ہوا۔ گاڑی رکتے ہی امداد سوٹ کیس سنبھالتا ہوا
نیچے اُتر آیا۔ یہ طویل سڑک راولپنڈی تک جاتی تھی' اس سے دو چھوٹی سڑکیں بلوکسر کے دائیں اور
بائیں نکلتی تھیں۔ اس نے ٹھہر کر اِدھر اُدھر کسی تانگے یا ویگن کے لئے نظریں دوڑائیں جو نا کام
لوٹ آئیں۔ اس نے پسینے کے قطرے رومال میں جذب کرتے ہوئے کچھ سوچ کر دائیں سڑک کا
انتخاب کیا اور پیدل گاؤں کی طرف چل پڑا۔

دوپہر ڈھل رہی تھی مگر فضا میں ابھی تک تپش تھی۔ یوں بھی گرمیوں میں ڈھلتی دوپہر میں

سورج کی کرنیں زیادہ چبھتی ہیں اور جبکہ وہ عادی بھی نہیں تھا۔ اس نے محض مڈل اسکول تک ہ میں پڑھا تھا اور اب گزشتہ پانچ سال سے شہر میں مقیم تھا۔ پڑھائی کی مصروفیات کم ہی گاؤں لگانے کی اجازت دیتی تھیں۔

کچھ وہ شروع سے بھی نازک مزاج اور نفاست پسند رہا تھا' سو کچھ ہی فاصلہ طے کر بعد اسے بُری طرح گرمی ستانے لگی۔ مٹی' دھول' اور گرد وغبار سے اس کا جی مکدر ہونے لگا۔ سڑک پختہ تھی مگر بیل گاڑیاں' تانگے' ریڑھے اور مال مویشی وغیرہ کے زیر استعمال ہونے سے اس کی ظاہری حالت میں خاطر خواہ تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں۔ جگہ جگہ گڑھے بنے تھے۔ اردگرد کے کھیتوں کھلیانوں سے اُڑ اُڑ کر آنے والی مٹی کی موٹی دبیز تہہ کچھ اس طرح سڑ بچھ گئی تھی کہ ''کچا راستہ'' معلوم پڑتی تھی۔

اس کی سفید براق قمیض پشت پر سے پسینے سے تربتر ہو چکی تھی۔ اس نے تاحد نظر پھیلے کھیتوں اور ان کے عقب میں چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کے طویل سلسلے پر طائرانہ نگاہ دوڑاتے ہ رک کر سوٹ کیس نیچے رکھا اور اپنے گریبان کے دونوں اوپری بٹن کھول دیے۔ اسے سا پانی کی شدت سے طلب محسوس ہو رہی تھی۔

اس نے کچھ کوفت اور تھکن سے چور جھلائے ہوئے انداز میں اپنی دائیں طرف د سڑک کے ساتھ ساتھ مویشیوں کے لئے چارے کی فصل لگی ہوئی تھی۔ اس کے اختتام پر کیکر جامن کے درختوں کا چھوٹا سا جھنڈ تھا جس کے بیچوں بیچ سائے میں کنواں بنا ہوا تھا۔

''تھینکس گاڈ۔'' اس نے بے اختیار تشکر کے جذبات کا مظاہرہ کرتے ہوئے تپتے ہ آسمان کی طرف دیکھا اور پھر سوٹ کیس اُٹھا کر سڑک چھوڑ کر فصل کے ساتھ ہی چکنی مٹی کی پگ ہولیا سیدھی درختوں کے جھنڈ کی طرف جاتی تھی۔

بلو کسر کے باہر چاروں اطراف میں کنوئیں بنے ہوئے تھے' جہاں گاؤں کے بچے بڑ خواتین ڈیرا جمائے بیٹھے ہوئے بکثرت نظر آتے تھے مگر اس کنوئیں کے پاس اسے کوئی بندہ بش نہیں آ رہا تھا۔ وہ تیز تیز قدموں سے چھاؤں کی طرف آیا اور پھر سکون کا سانس لیتے ہوئے کنو کی منڈیر کے قریب آ کھڑا ہوا۔

اب وہ اس رسی کی تلاش میں تھا جس کے دوسرے سرے پر پانی کا ڈول بندھا ہوتا ہے جسے کنوئیں کے اندر لٹکا کر پانی بھر کر باہر نکالتے ہیں۔ باہر رسی تو بندھی نظر آ رہی تھی مگر ڈول کہ

نہیں دیا۔ وہ غالباً کنوئیں کے اندر تھا۔ وہ منڈیر پر بیٹھ گیا اور رسی کھینچتے ہوئے ڈول کی ن معلوم کرنے کے لئے جونہی اس نے کنوئیں کے اندر جھانکا' اس پر حیرتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ ایک لمحے کو تو اسے اپنی بصارت پر یقین نہ آیا۔ جو کچھ اندر دیکھا تھا' آنکھ کا دھوکا محسوس ہوا۔

اس نے دوبارہ اندر جھانکا اور جیسے اس کی سٹی گم ہونے لگی پھر وہی نظارہ سامنے تھا۔

''ناقابل یقین۔'' وہ تحیر کے عالم میں بڑبڑایا۔ وہ دم بخود سا کنوئیں کی تہہ پر نظر جمائے ی کرتی ہوئی اس ''شے'' کو دیکھ رہا تھا۔

''ہو سکتا ہے' کوئی بھوت پریت ہو۔ کوئی چڑیل وغیرہ ہو۔'' پہلی نظر میں اسے یہی خیال آیا

کنواں چاروں طرف سے پکا تھا' اس کی گولائی میں سرخ پکی اینٹیں لگی ہوئی تھیں۔ کنوئیں اترنے کے لئے بانس کی ایک مضبوط لمبی سیڑھی کنوئیں کی دیوار کے ساتھ لگی ہوئی تھی اور کنوئیں ہ کے پاس لکڑی کی اس سیڑھی کے آخری ڈنڈے پر امداد کو وہ ''مخلوق'' نظر آئی تھی۔

چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا' البتہ سرخ سوتی لباس' پشت پر پڑی موٹی سیاہ لمبی چوٹی اور پانی میں اِدھر حرکت کرتے گورے گورے گداز ہاتھ پوری طرح نمایاں تھے۔

گو کہ کنواں انسانی ہاتھوں کا بنا ہوا تھا اور پھر گہرائی بھی کچھ زیادہ نہیں تھی پھر بھی کسی ذی نفس ھا جوان جہان لڑکی کا یوں تن تنہا کنوئیں میں اُترنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

''یقیناً یہ چڑیل ہے یا پھر پری ہو گی۔'' امداد نے قیاس لگایا۔

اور پھر یہ سوچ کر اس پر گھبراہٹ سی طاری ہونے لگی۔ ہزار وہ مضبوط اعصاب کا قوی اور چھلا گبرو مرد سہی مگر مقابلہ تو کسی غیر انسانی شے سے تھا جس کا وار بھی دکھائی نہیں دیتا' سو شان ہونا فطری امر تھا۔

اُسی دم اس ''مخلوق'' نے پانی پر تیرتی کسی شے پر گرفت کرنے کے بعد اوپر دیکھا اور پھر بے اختیار بول اُٹھی۔

''ارے یہ تو انسانی آواز ہے۔'' وہ چونک پڑا۔ آواز چونکہ کنوئیں میں گونج کر رہ گئی تھی اس کے بول سمجھ میں نہیں آئے۔

''مگر چڑیلیں اور جن بھوت وغیرہ بھی تو انسانی آوازوں کا روپ دھار سکتے ہیں۔'' اس کے اندر کلبلاتے خوف اور خدشات نے فوراً اسے پیشتر دوسری ''دفاعی'' توجیہہ پیش کر دی۔

"اے......تم کون ہو......؟ انسان کہ بھوت؟" وہ بلا ارادہ کنوئیں کے اندر جھانک کر پوچھ بیٹھا۔

جواب میں اس نے کچھ کہا جو اس کے پلے نہیں پڑا۔ ہاں یہ ہوا کہ وہ بانس کی سیڑھی طے کرتی ہوئی اوپر آنے لگی۔

"اللہ میاں جی! میں بہادری کی زرّیں روایات قائم کرتے ہوئے اپنے قدموں پر یہیں کھڑا رہوں گا۔ دیکھ لیتے ہیں اس "شے" کو بس تو ہی بچا سکتا ہے مجھے اس بلا سے۔" وہ جل تو جلال تو کا ورد کرتا ہوا آنے والی ماورائی مخلوق کے اوپر آنے کا انتظار کرنے لگا۔

"دیکھو بھئی! سب سے پہلے اپنے پاؤں اور پنجے چیک کراؤ اور پھر یہ یقین دلاؤ کہ تمہارے جسم میں "انسانی" جگر ہی فٹ ہے۔" جونہی وہ آخری سیڑھی طے کر کے منڈیر پر "لینڈ" ہوئی امداد نے گویا سوالات کی گولہ باری کر ڈالی۔

ساتھ ساتھ وہ اس کا جائزہ بھی لے رہا تھا۔ حلیے اور انداز سے وہ گاؤں کی کوئی لڑکی ہی معلوم پڑ رہی تھی۔ اس کی اس درجہ بے نڈری اور بے خوفی نے حقیقت میں امداد کو حیران و پریشان کر ڈالا تھا۔

"وہ جی...... بات یہ ہوئی کہ میرا گلاس کنوئیں میں گر گیا تھا۔ اس کو نکالنے کے لئے کنوئیں میں اُترنا پڑا۔" اس نے کچھ ٹھٹک کر اس "شہری بابو" جیسے حلیے والے خوبرو سے نوجوان پر نگاہ ڈالتے ہوئے جھجکتے ہوئے سراسیمہ لہجے میں جواب دیا۔

"یا الٰہی! صرف ایک گلاس کے لئے اپنی جان جوکھوں میں ڈالی۔" امداد تو دنگ رہ گیا۔ اس کے متعجب لہجے میں غصے اور برہمی جی جھلک تھی۔

اس نے پیشانی پر مچلتے سیاہ ریشمی بال ہٹاتے ہوئے پریشانی کے عالم میں سبزی مائل بھوری آنکھوں والے اس پُرکشش نوجوان کی سمت دیکھا اور پھر انگلیاں مروڑتے ہوئے سر جھکا کر جھجک سے انداز میں بولی۔

"وہ جی...... بات کیا ہوئی کہ یہ گلاس مجھے بہت عزیز ہے۔ وہ میری سہیلی نہیں ہے صفیہ، وہ جو ساتھ والے پنڈ میں رہتی ہے۔ اُس نے مجھے تحفہ دیا تھا۔ اس طرح کے پورے چھ گلاس ہیں ساتھ میں جگ بھی ہے اسی طرح کا۔ خاص آرڈر دے کر بنائے گئے تھے۔ بڑا نازک کام ہے ان پر۔"

کیا سادگی تھی اور کیا لوچ تھی کہ امداد دم بخود رہ گیا۔

اس کے سفید بھری بھری ہتھیلیوں والے گداز ہاتھوں میں گلاس جکڑا ہوا تھا۔ امداد نے سلور اسٹیل کے اس گلاس پر نہایت باریک سنہری سرخ پھولوں والا نازک ڈیزائن کندہ تھا ی ساخت بھی بڑی اسٹائلش اور نفیس تھی۔

"تم ہو کون؟" امداد نے اب اُسے اپنی اور اُس کی عمر کے حساب سے گہری کھوجنے والی نگاہ ھا۔ چند ثانیے کو نظر جم سی گئی۔

سرخ لباس میں اُس کا سپید گلابیاں چھلکاتا حسین مکھڑا غضب ڈھا رہا تھا۔ سراپا کیا تھا، بھرا نار تھا، گویا کوئی چھوٹی ہوئی مہتابی، قدرت کی صناعی کا جیتا جاگتا شاہکار۔ وہ الف تا ی کے خزانوں سے مالا مال تھی۔

"میں مینا گل ہوں جی مگر سب مینا مینا کہہ کر بلاتے ہیں۔"

وہ اس نوجوان کی بھرپور جانچتی نگاہ کے لمس سے چھوئی موئی سی بن گئی تھی۔

دونوں ہاتھ مروڑتی ہوئی وہ کبھی ڈھلکا آنچل اور ادھ کھلی چٹیا سے نکلتے بال درست کر رہی تھی اتھ میں دبائے گلاس کی سطح ناخن سے کھرچنے لگتی۔ امداد نے اس کی کیفیت محسوس کر ہٹالی۔

"دیکھو بھئی! کیا نام ہے تمہارا۔ مینا گل عرف مینا۔ اگر اس گلاس پر کوئی "جناتی اثر" نہ ہو تو اسے اچھی طرح دھو کر ایک گلاس پانی پلا دو۔ سخت پیاس لگ رہی ہے۔"

نا گویا اس کے "آرڈر" کے انتظار میں تھی۔ جھٹ پٹ ڈول کنوئیں کے اندر ڈال کر باہر اس سے پانی گلاس میں اُنڈیل کر اس کے قریب چلی آئی۔

ریبان کے بٹن کھولے آستینیں کہنیوں تک فولڈ کر کے پاؤں سے بوٹ اور جرابیں اُتار یا گرمی کے جھلسا دینے والے حبس آلود احساس کا مداوا کر رہا تھا۔ سرخی مائل بھرے بھرے بوں پر گھنی سیاہ مونچھیں تک پسینے سے بھیگ رہی تھیں۔ مینا نے ایک نظر اس کی مردانگی سے پور سراپے پر ڈالی۔ نجانے کیوں اُس کی نظریں جھک سی گئیں۔ گلاس اسے تھماتے ہوئے اتھ خفیف سے لرز کر رہ گئے تھے۔

"آ...... آپ کن کے پروہنے (مہمان) ہیں جی۔" اس نے قدرے ہچکچا کر اپنی سرخ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دھیمے انداز میں پوچھا۔

"پروہنے۔" امداد نے بھویں اُچکا کر نا گواری سے اُسے دیکھا۔ "میں یہاں کا باسی ہوں

محترمہ اور یہیں پلا بڑھا ہوں۔'' اس نے جتلانے والے انداز میں کہا۔

''پر جی۔ آپ کو دیکھا نہیں ہے میں نے۔'' اُسے بہر حال تجسس تو تھا۔

امداد کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ وہ اس طرح کے سوال و جواب کا عادی نہیں تھا۔

''مجھے آپ کی آنکھ کی پٹی اُتارنے پر مامور نہیں کیا گیا محترمہ۔'' وہ خشک انداز میں کہ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ مطلب یہ تھا کہ تمہاری آنکھوں پر پٹی بندھی ہوگی جو مجھے یہاں آتے جاتے کبھی نہیں دیکھا۔

''اور...... ہاں۔ سنو......!'' وہ یکدم کچھ یاد آ جانے پر پلٹا تھا۔ وہ سہمے ہوئے انداز میں اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کے اکل کھرے انداز نے اس کی خوداعتمادی اور فطری روانی پر جیسے بند باندھ دیے تھے۔

''تم نے اپنا پورا تعارف تو کروایا ہی نہیں۔ اس پوری اسٹیٹ میں صرف ایک ہی شہزادی گل پائی جاتی ہیں کیا؟'' وہ حد درجہ طنزیہ لہجے میں گویا ہوا۔

مینا گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ اس کے تفتیشی انداز نے اس کی رہی سہی طراری بھی ختم کر دی تھی۔

''وہ جی...... میں رفیق علی کی بیٹی ہوں۔'' اس نے پھنسی پھنسی آواز میں جواب دیا۔

اُسے اس رعب داب والے تیز مزاج نوجوان سے ڈر لگنے لگا تھا۔

''اوہ...... اچھا۔'' امداد نے چونک کر دوبارہ اس پر نظر ڈالی۔ وہ بہت نروس سی دکھائی دے رہی تھی۔ رفیق علی اُن کی زمینوں پر مزارع کا کام کرتا تھا۔ بلوکسر میں ہی رہتا تھا۔ مالی حالت خاصی خستہ اور کم تر تھی۔ کچھ عرصہ پہلے اُس کا انتقال ہوا تھا اور اب اس کی جگہ اس کے بیٹے نے کام سنبھال لیا تھا۔

''تم اس وقت یہاں کیا کر رہی تھیں۔ چلو گھر۔''

اب انداز قطعی طور پر سخت اور حکمیہ ہو گیا تھا۔

''آؤ نا۔ کھڑی سوچ کیا رہی ہو۔'' وہ سوٹ کیس اُٹھا کر چل پڑا۔ پلٹ کر دیکھا تو وہیں گم صم کھڑا دیکھ کر جیسے برس ہی تو پڑا۔

''وہ...... وہ جی۔ میں ساگ توڑنے آئی تھی۔'' وہ تھوک نگلتے ہوئے ڈرے ڈرے انداز میں صفائی دینے لگی۔

''تو پھر......'' وہ زچ سا ہو کر اُس کے اگلے جملے کا انتظار کرنے لگا۔

''ساگ توڑنا باقی ہے کیا؟''

''نہیں جی۔ وہ میں نے ایک کپڑے میں گٹھری بنا کر لپیٹ دیا تھا۔'' وہ بدحواس ہو گئی تھی۔ ''وہ اُدھر پٹری پر پڑا ہے۔''

''تو پھر جا کر اُٹھا لاؤ۔ کھڑی مُنہ کیا دیکھ رہی ہو۔'' اس نے بنا لحاظ کیے اسے ڈانٹ دیا۔

وہ جیسے ''اذن'' کی ہی منتظر تھی۔ تیر کی طرح فصل کی پٹری پر رکھی ساگ کی گٹھری اُٹھا لائی اور اس کے قریب آ کر منتظر نظروں سے اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔

''کیا پورے گاؤں کے لئے ساگ پکانا ہے؟'' امداد نے گٹھری کا پھیلاؤ ملاحظہ کرتے ہوئے حیرانی سے دریافت کیا۔

''نہیں جی۔ یہ تو بس گھر والوں کے لئے ہی پورا پڑے گا۔'' مینا کو اُس کی حیرانی پر حیرت ہوئی۔

''دراصل۔ اس میں سے بہت ساری شاخیں، پتے اور پھول وغیرہ نکل جائیں گے تو خود بخود چھانٹی کے بعد کم ہو جائے گا۔''

وہ امداد کے پیچھے چلتی ہوئی اپنی دانست میں اُس کی حیرت دور کر رہی تھی۔

''آپ کا گھر کدھر ہے جی؟'' اب کے وہ سلیقے سے کام لے کر گھما پھرا کر وہی سوال کر رہی تھی۔

''ماشاء اللہ اتنی جلدی کیوں خیال آ گیا۔'' وہ بھناتے ہوئے بولا۔ ''اگلی صدی میں دریافت کرنا تھا۔'' وہ سفر کی تھکن کے باعث اس قدر چڑچڑا اور ''بے رحم'' سا لگ رہا تھا یا تھا ہی ایسا۔ مینا کچھ اندازہ نہ لگا پائی تو اُلجھن بھرے انداز میں اس کی چوڑی پشت دیکھنے لگی۔

''سردار رحیم کا گھر تو جانتی ہی ہوگی۔ اُن کا بیٹا ہوں میں۔''

اس نے جیسے ترس کھا کر اُس کی اُلجھن ختم کر دی۔ اُلجھن تو ختم ہو گئی مگر بوکھلاہٹ میں اضافہ ہو گیا۔

سردار رحیم کا گاؤں میں بڑا نام تھا۔ سب سے زیادہ زمینوں کا مالک تھا۔ گھر تو گاؤں کے دوسرے لوگوں کی طرح روایتی طرز پر تعمیر کیا گیا تھا مگر صحن بہت کھلا تھا۔ سب سے زیادہ روشن اور کھلا گھر تھا اُن کا جہاں گاؤں کے معززین سے لے کر کمین تک ہر وقت گھسے رہتے تھے۔

رشتے داروں میں بھی کوئی اُن کے ہم پلہ نہیں تھا۔

وہ مزید رعب میں آ گئی۔

''اچھا آپ سردار جی کے بیٹے ہیں۔'' خوشی تو بہت تھی اُس کے گاؤں کا باسی ہونے کی مقابل کا سرد برفابی رویہ اسے محتاط ہونے پر مجبور کر رہا تھا۔ جواب میں وہ محض ہنکارا بھر کرا مخصوص نپے تلے انداز میں قدم اُٹھانے لگا۔ چال میں بے نیازی' نخوت اور بیزاری نمایاں تھ وہ چپ چاپ اس کا فالو کر رہی تھی۔ جب اچانک پیر رپٹا اور بے توازن ہو کر گرتے گر سہارے کے لئے اُس نے اُس کا بازو پکڑنا چاہا۔ اسی اثنا میں وہ بھی پلٹ چکا تھا۔ بہ سرعت ا بازو تھام کر اسے گرنے سے روکا اور پھر قدموں پر کھڑا ہونے میں مدد دی تھی۔

جوانی کی سانسوں میں نشہ پگھلاتی حدت سے بھرپور دو وجود ایک دوسرے کے نزدیک آئے گویا چقماق جل اُٹھے۔

امداد کے جسم میں جیسے کسی نے چار سو چالیس وولٹ کی برقی رو دوڑا دی تھی۔ مینا کے ہی وہ اضطراری انداز میں اس کا گداز گدرایا ہوا سڈول بازو چھوڑ کر بے اختیار دو قدم پیچھے گیا۔ ایک لمحے کو وہ دم بخود اُسے دیکھتا رہ گیا۔

''سنبھل کر چلو۔ تمہارے آگے ''ریڈ کارپٹ'' نہیں بچھا ہوا۔'' وہ اپنی اُلجھی ہوئی سانسوں پر قابو پا کر مخصوص اکھڑ لہجے میں کہہ کر آگے بڑھنے لگا۔

مینا پتھرائی ہوئی کیفیت میں جہاں کی تہاں کھڑی رہ گئی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اُ تھیں۔ دھک دھک کرتے دل پر ہاتھ رکھے وہ ششدر سی اس بانکے چھبیلے' مغرور اور آن والے شہزادوں جیسے نوجوان کے نقش قدم دیکھ رہی تھی۔

''کتنوں کے دل پر یہ قدم پڑتے ہوں گے۔'' اس کے پیچھے سر جھکائے ہوئے چل جیسے کھڑے کھڑے لُٹ گئی تھی۔ گاؤں کا رہائشی علاقہ قریب آ گیا تھا۔

☆☆☆

''کیوں ری...... کیسی گزری......'' مینا بیاہ کے بعد سہاگ رات گزار کے میکے آئی تو بھاوجوں اور سہیلیوں نے بے تکلفی سے قہقہے لگاتے' اسے کہنیاں مارتے ہوئے ساری دا پوچھ ڈالی۔ جسے بظاہر بھولے اور انجان منہ بنائے ارد گرد کھڑی کنواری بالیوں نے بھی بعد کان لگا کر سنا تھا۔

مینا تو ویسے بھی بہن ہونے کے ناطے اس کے گھٹنے سے لگی بیٹھی اُس کی تفصیلی ''داستان'' سن رہی تھی۔ دل میں جانے کیسے کیسے ارمان پھوٹ رہے تھے۔ بڑی بوڑھیاں بھی پاس بیٹھی تھیں اور اپنے تجربات دہرا کر یک گونہ مسرت حاصل کر رہی تھیں۔

ایک بے تکلف زنانی محفل تھی جہاں پر بیاہتا' نو بیاہتا اور عمر رسیدہ ہر دوسری عورت کھلے کھلے انداز میں تبصرے فرما رہی تھی۔

جوان لڑکے صحن میں دیگوں کے لئے بنائے گئے عارضی چولہے پاٹتے' تنبو کی کیلیں اُکھاڑتے' آتے جاتے بڑے آرام سے اس معلوماتی پروگرام سے محظوظ ہو رہے تھے۔

یہی ریت مردوں کی مجلسوں میں بدرجہ اتم نبھائی جاتی تھی۔ جہاں چار مرد جمع ہو جاتے' اپنی جوانی کے لذت بھرے قصے شوق سے دہرانے بیٹھ جاتے جسے نوخیز عمر کے لڑکے انہماک سے سنتے۔

قطرہ قطرہ یہ زہر نئی نسل کی اخلاقیات تباہ کر رہا تھا اور کسی کو اس ''واردات'' کی خبر نہیں تھی۔ اُن کے لئے یہ معمول کی باتیں تھیں۔ عام سی' بے ضرر اور ہنسی مذاق والی۔

☆☆☆

''السلام علیکم۔ خالہ گھر پر ہیں؟''

سفید گھسے ہوئے پیوند لگے کرتے پاجامے میں ملبوس تیل لگے چمکتے ہوئے بالوں کو سلیقے سے کنگھا کیے سنولائے ہوئے جفاکش چہرے اور دُبلے پتلے اکہرے بدن کے مالک علی مراد نے دروازہ بجا کر صحن میں قدم رکھتے ہوئے بڑے محتاط اور متین انداز میں مینا گل سے دریافت کیا تھا۔

وہ نیم کے پیڑ کے نیچے کھڑی بان کی چارپائی بچھائے اُونگھ رہی تھی۔ دروازہ بجنے کی آواز سن کر سست روی سے اُٹھ کر بیٹھی تھی۔ نیلے پھولدار شلوار کُرتے میں اُس کا سونا سا بدن چمکارے مار رہا تھا۔ دوپٹا جانے لاپروائی میں کہاں اُٹھا کے رکھا تھا۔ آنکھوں میں کچی نیند کا خمار ہلکورے لے رہا تھا۔ موٹی سی سیاہ ناگن چٹیا کے تقریباً سارے ہی بل کھل کر شانوں اور گردن کے اطراف بکھر گئے تھے۔

علی مراد نے بس ایک ہی نظر اس کے ہوش و خرد سے بیگانہ کرتے لش لش کرتے سراپے پر ڈالی تھی پھر قدرے رخ موڑ کر نظریں فرش پر جما دی تھیں۔ مینا گل کو اس کی نظر انداز کرنے والی پالیسی پر سخت تپ چڑھا۔ ''اُونہہ بڑا آیا پارسا۔''

"اماں بڑی بھاوج کے ساتھ اس کے میکے گئی ہیں۔ چھوٹی بھاوج اپنی بہن سے ملنے گئی ہے اور بہنیں سب اپنے سسرال میں ہیں۔" مینا نے دھیرے سے تفصیل بتا کر آس بھری نظروں سے علی مراد کی طرف دیکھا۔

"اوہ...... اچھا...... میں چلتا ہوں پھر آ جاؤں گا۔" وہ شائستگی سے مڑنے کو تھا۔

"ایک منٹ کو میری بات سن لو۔ میں تمہیں کھا نہیں جاؤں گی۔" وہ لال بھبوکا چہرہ لئے چار پائی سے اُٹھ کر عین اس کے مقابل تن کر کھڑی ہو گئی۔

"کیا ہوا...... مجھ سے غلطی ہو گئی کوئی۔" وہ سبک نظروں سے اسے دیکھ کر دھیرے سے مسکرایا۔

"میں تمہیں اتنی ہی بُری لگتی ہوں تو اپنی اماں سے کہہ کر بات ختم کیوں نہیں کرا دیتے۔" وہ بھو کی شیرنی کی طرح غرائی۔

"اس طرح مجھے پل پل سُلگا تڑپا کر کون سا مزہ ملتا ہے تمہیں...... بولو۔"

"مینا...... کیسی باتیں کرتی ہو۔" وہ بے حد نرمی و روانی سے مخاطب ہوا۔ لہجے میں ... کی شیرینی تھی۔ "تم چاہتی ہو میں گاؤں کے دوسرے لڑکوں کی طرح لُک چھپ کے تم سے ملنے کی سبیلیں کروں۔ فصلوں میں بلاؤں، راتوں کے اندھیرے میں گھر سے باہر نکلنے کی ترغیب دوں؟ ...... میں تجھے کس زبان میں سمجھاؤں، پیار چوری اور بددیانتی نہیں سکھاتا۔ تو میری اپنی چیز ہے۔ ہمیشہ کے لئے ہم ایک دوسرے کے نام لکھ دیے گئے ہیں۔ ایک دن ایک ہو ہی جائیں گے پھر میں تجھے وہ سارے پیارے بھرے لمس اور لمحے دوں گا جن کی تم ابھی آرزو کر رہی ہو۔ مجھے تھوڑا سا وقت دو۔ اگلے سال کپاس کی فصل اچھی ہو گی تو مجھے اتنی آمدنی ہو جائے گی جس سے میں اپنے کچے گھر کو پکا کرا لوں گا۔ تیری ڈولی پکے آنگن میں اُترے گی۔ ملن کے دن زیادہ دور نہیں ہیں۔ بس صبر سے کام لینا شرط ہے۔"

اپنے تئیں اس نے بڑی محبت، چاہت اور پیار سے اُسے سمجھایا تھا مگر مینا کو محبت کے ایسے سوکھے سڑے، روکھے پھیکے اظہار زہر سے بھی زیادہ بُرے لگتے تھے۔

"اس سے تو اچھا تھا، تم مولوی بن جاتے۔ عادتیں تو ساری وہی پائی ہیں۔" وہ تنک کر اسے دیکھنے لگی۔

علی مراد بیحد سبھاؤ سے مسکرا دیا۔ آنکھوں میں بیحد تحمل سی نرمی تھی۔

"اگر تجھے پتا چل جائے کہ تو مجھے کتنی عزیز ہے، میں تیرے لئے کتنا پاگل رہتا ہوں تو ایسی ...رنی چھوڑ دے۔"

"تو پھر بتاؤ ناں کہ میں تمہیں کتنی پیاری لگتی ہوں۔" وہ عین اس کے سامنے دو قدم کے فاصلے ...ذ کھڑی ہو گئی۔ گدرایا ہوا شعلہ ساماں سراپا جوانی کی ساری باغیانہ اور سرکش ادائیں لئے ...تھا۔ ایک لمحے کو علی مراد کا تنفس تیز ہوا پھر اس نے اپنی مضبوط قوتِ ارادی سے نفس کے ...ے کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے نظر چرا لی۔

"بتاؤں گا مگر ابھی نہیں۔ بیاہ کے بعد۔ تجھ پر پکے حقوق حاصل کر کے۔" وہ ایک دم پلٹ کر ...ے باہر چلا گیا تھا۔

"اونہہ۔ ایسے زاہد خشک کو کون سمجھائے۔ کہاں میرا پھولوں کی ڈال سا لدا پھندا سراپا اور ...یا آنکھ کا اندھا۔"

☆☆☆

"اماں، میں بھی چلوں گی......" ماں کو سردار رحیم کے ہاں جانے کے لئے تیار ہوتے دیکھ ...ناشوق بھرے لہجے میں مخاطب ہوئی تھی۔

"تو کیا کرے گی وہاں۔ مجھے تو سردارنی نے رضائی میں ڈورے ڈالنے کے لیے بلوایا ... تجھے تو سوئی پکڑنی بھی نہیں آتی۔"

اماں چلنے کو تھیں۔

"تو کیا ہوا...... تجھے دیکھ کر کام سیکھ لوں گی۔ لے چل ناں اماں۔" اس کے اندر آتش شوق ...رہی تھی۔ سردار رحیم کی چار دیواری میں اسے رنگ ہی رنگ بکھرے نظر آ رہے تھے۔ آج ...سردار امداد چھٹیوں پر گھر آیا ہوا تھا۔ وہی امداد جس سے اولین ٹاکرے نے اُس کے دل کی ...تیں زیر و زبر کر دی تھیں۔

"چل پھر آ جا جلدی سے۔" ماں کے راضی ہوتے ہی وہ جھٹ پٹ اپنی دھانی چنریا اوڑھ ...ہکی ڈولتی ان کے پیچھے لپکی تھی۔

"سلام سردارنی جی۔"

سردارنی صحن میں لگے گندم کے ڈھیر کے پاس پیڑھی جمائے بیٹھی تھی۔ مینا کے اشتیاق آمیز ...ام پر اٹھا کر ہلکے سے مسکرائی۔

"آؤ......دھیئے......کیسی ہو؟ ماشاءاللہ تو تو گلاب کی ڈال کی طرح ہری بھری اور لال
ہوگئی ہے۔ جوانیاں مانو۔ خیر خیریت سے اپنی گھر کی ہو۔ اللہ نصیب اچھے کرے۔"

سردارنی نے اپنی فطری حلیمی' بردباری اور شفقت کا مظاہرہ کیا تھا۔ اماں چھاج سنبھال
گندم کی چھان پھٹک کرنے بیٹھی تو سردارنی نے نرمی سے منع کر دیا۔

"رہنے دے حلیمہ۔ یہ تیرے کرنے کے کام نہیں ہے۔ ابھی رجو امداد پُتر کو ناشتا د
فارغ ہوتی ہے تو وہ کر دے گی۔ تو میرے ساتھ اندر والے کمرے میں آ۔ پیٹی میں روئی
رضائیاں رکھی ہیں۔ انہیں نکال کر ڈورے ڈالنے کے لئے اوپر چھت پر بچھا دیتے ہیں۔ ا
دھوپ بھی اچھی آئے گی اور جگہ بھی کھلی ہے۔"

سردارنی اُٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"تو یہاں بیٹھی کیا رہی ہے۔ چل ایسا کر' باورچی خانے میں جا کر رجو کا ہاتھ بٹا۔" اماں
سردارنی کے پیچھے قدم جماتے ہوئے چوکی پر بیٹھی مینا کو لتاڑا۔

"ارے رہنے دے حلیمہ۔ بچی پہلی مرتبہ یہاں آئی ہے۔ اب کیا آتے ہی کام پہ لگا
گی۔"

"جن کا کھاتے ہیں ان کا کام بھی کریں گے' خوشی سے چل اُٹھ جا۔"

اماں نے عاجزی دکھائی۔ مینا گل بھی خوشی خوشی اُٹھ گئی کہ کام من پسند تھا۔ وہ باورچی خا
میں آگئی۔

"رجو......نی رجو۔ سردارنی نے مجھے کہا ہے' چھوٹے سردار کا ناشتا لے جانے کو۔ بتا تو
کمرا کون سا ہے؟" وہ رجو کو ہاف بوائلڈ انڈا' دلیا' کباب اور سادہ روٹی ٹرے میں سلیقے
سجاتے دیکھ کر لہک کر گویا ہوئی۔

رجو نے مڑ کر مسکراتی نظروں سے اُسے دیکھا۔

"ٹھیک ہے ری۔ تو ہی چلی جا۔ ویسے قسم اللہ کی۔ کیا سوہنی سوہنی مورتیں تیرتی پھرتی
پردے پر۔ یہ رنگ برنگے تنگ تنگ کپڑوں میں ناچتی گاتی گوری چٹی میمیں ہیں۔"

"اری کہاں پر۔ کیا اول فول بک رہی ہے۔"

"چھوٹے سردار کے کمرے میں وی سی آر پر فلم چل رہی ہے۔ ساری رات دیکھتے رہ
ابھی بھی اُٹھ کر لگالی ہے۔" رجو نے رازداری سے قریب ہو کر بتایا۔

"ہیں......سچی سے۔" مینا گل کے دل میں ہلچل سی مچ گئی۔

اس زمانے میں ٹی وی' وی سی آر صرف بڑے شہروں میں دیکھنے کو ملتے تھے۔ قصبوں'
ں میں خال خال ہی دکھائی دیتے تھے۔ وہ بھی کسی وڈیرے' جاگیردار' چوہدری یا ملک کی حویلی
ڑکے بالے شوق پورا کرنے شہر کے سینما چلے جایا کرتے تھے۔ ہاں کبھی جوئے یا چوری کے
ھ آجاتے تھے ایک رات کے لئے مل ملا کر وی سی آر کرائے پر لے آتے تھے۔

مینا گل کو فلموں کا بہت شوق تھا۔ گو کہ سینما تو بچپن میں ایک آدھ بار ہی بھائی بھابی کے ساتھ
ا مگر اس کا نشہ اسے برسوں سے تھا۔ اتنی امیر کبیر' حسین و طرحدار ہیروئن جس پر دیومالائی ہیرو
جان نچھاور کرتا ہے۔ اس سے پیار محبت جتاتا ہے۔ دونوں بانہوں میں بانہیں ڈال کر دو عالم
بیگانہ ہو کر ناچتے گاتے ہیں۔

ایسے تصورات مینا گل کے بدن میں کیف آمیز سنسنی پھیلا دیتے تھے۔ بارہا اس نے تخیل
اس ہیروئن کی جگہ خود کو پایا تھا۔

ٹرے تھام کر وہ جوش بھرے قدموں سے امداد کے کمرے میں آئی تھی۔

"سلام جی۔"

ساگوان کے کشادہ دیدہ زیب پلنگ پر شنیل کا لحاف ٹانگوں پر ڈالے ڈھیلی ڈھالی ہلکی خاکی
رٹ میں ملبوس گاؤ تکیے پہ سر رکھے وہ وی سی آر پر چلتی فلم میں گم تھا۔ نزاکت و لطافت سے لبریز
انی مہک نے اچانک ہی اسے مینا گل کی طرف متوجہ کر دیا تھا۔

"تم......" وہ بے اختیار اُٹھ بیٹھا۔ نظروں میں واضح بے یقینی تھی۔

"وہ میں اماں کے ساتھ آئی تھی۔" مینا گل نے جھجک کر پلکیں جھپکالیں۔

"ہوں......" وہ ٹرے سامنے رکھ کر ناشتا کرنے لگا۔

مینا گل نے چوری سے اس کا لانبا وجیہہ سراپا دیکھا پھر شوق آمیز نظریں وڈیو پر جمادیں۔

"وہ جی......یہ زنانیاں فلم میں آنے کے لئے کیا کرتی ہیں؟"

اس کی خواب ناک آواز اُبھری۔ نظریں اسکرین پر چپک سی گئی تھیں جہاں ایک مشہور
ہیروئن ہیرو کے ساتھ مل کر گانے کے بول دہرا رہی تھی۔

"کیوں......" وہ زور سے چونکا اور سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھنے لگا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"میرا مطلب ہے جی کہ فلمی ہیروئن کیسے بنتے ہیں؟"

"کیا تو بھی فلم اسٹار بننا چاہتی ہو۔" امداد نے کچھ سوچتے ہوئے بغور اُس کا شوق و حسرت
جوش کے رنگوں سے سجا حسین چہرہ تکا۔

"میں...... ہاں جی۔" اس کے اندر جیسے بجلی سی دوڑ گئی۔ "میرا بڑا جی کرتا ہے مشہور ہونے
نام چمکانے کو۔ فلمی ایکٹریسوں کی کیا شان ہوتی ہے۔ ہر کوئی قدموں میں بچھ بچھ جاتا ہے۔ ایک
عالم اُن کا دیوانہ ہوتا ہے اور پھر مجھ میں تو ساری خوبیاں بھی ہیں۔ یہ جو اسکرین پر ناچ رہی ہے اُس
سے تو ہزار درجے زیادہ خوبصورت ہوں، جملوں کو جما جما کر ادا کر سکتی ہوں۔ ناچ گانا بھی چلو بندہ
سیکھ ہی لیتا ہے۔"

اونچی اُڑان کا نشہ، اپنے حسن و شباب کی بڑے پیمانے پر تشہیر کی ہوس اور مردوں کے دلوں
پر راج کرنے کی نفسانی خواہش نے ہی مینا گل کی زندگی برباد کی تھی۔ وہ نمائش پسند، سطحی مزاج اور
تصنع و بناوٹ سے لبریز لڑکی تھی۔

امداد لمحوں میں تاڑ گیا کہ یہ آتش فشانی حسن رکھنے والی ناری اپنے حسن کا خراج چاہتی ہے،
خود کو منوانا چاہتی ہے۔ اپنے جسم کے بل بوتے پر ایک عالم کو اپنے سامنے جھکا ہوا اور درخواست
گزار دیکھنا چاہتی ہے۔ ناموری کی سیڑھیاں طے کرنے کی چاہ رکھتی ہے۔

امداد پرانا پاپی تھا۔ عورت کا وجود اس کا لمس، اس کی قربت اُس کے لئے نئی نہیں تھی۔ بلکہ
گاؤں کے دوسرے لڑکوں کے برعکس وہ گاؤں کی کچی، ادھ پکی، ادھ کتری یا خزاں رسیدہ جوانیوں
سے چوری چھپے کھل کھیلنے کا روادار نہیں تھا۔ شہر کی تازہ ہوا میں پلا بڑھا تھا، سو مزاج میں بھی نفاست
نزاکت بدرجہ اتم موجود تھی۔ اس لئے وہ شہر کی بازاری عورتوں سے ربط ضبط رکھتا تھا۔ اس زمانے
میں بازار حسن کے کوچے سخت تادیبی کارروائیوں اور قانونی موشگافیوں کی بدولت ابھی "شجر ممنوعہ"
قرار نہیں دیے گئے تھے۔ کوٹھے والیاں پولیس کو باقاعدہ بھتہ دے کر دھڑلے سے شرفاء و غرباء کی
دلبستگی کا سامان مہیا کر رہی تھیں۔ اس لئے امداد کو گاؤں کے مٹیالے حسن کو خاطر میں لانے کی
ضرورت ہی نہیں تھی۔

مینا گل وہ پہلی لڑکی تھی جس کے سرخ و سپید اور سنہری لہریں مارتے مکھڑے، سیاہ ناگن جیسی
اور ریشم و مخمل سے بنے جسم کے پیچ و خم نے امداد کو اُلجھا لیا۔ حالانکہ اس کی منگنی بچپن سے ہی
سردارنی کے بھائی کی آٹھ جماعتیں پڑھی خوش شکل بیٹی زرقا سے ہو چکی تھی مگر مفت ہاتھ آ جائے تو

ہے۔
پھر بھونرے کا تو کام ہی منڈلانا ہے۔ اُس کے جذبات مچل کر بھٹکنے پر آمادہ ہو گئے۔

"سنو...... میں تمہیں فلموں میں کام دلوا سکتا ہوں۔ اُدھر شہر میں اپنے بہت سے واقف
" امداد اب گہری بھرپور نگاہ سے اُسے تول رہا تھا۔

"ہیں جی...... سچ۔" وہ اُچھل پڑی۔ "مم...... مگر کیسے......"

"تمہیں اپنے ساتھ شہر لے جا کر۔" ناشتا کر کے برتن ایک طرف رکھتے ہوئے وہ اُٹھ کھڑا ہوا
اُس کے مقابل آ گیا۔

"مگر جی اماں اور بھائی کیسے مانیں گے؟" وہ حیرت کی تصویر بن گئی تھی۔

"مان جائیں گے۔ کوئی محفوظ حل ڈھونڈ لیں گے۔ فی الحال تم مجھ پر توجہ دو۔" امداد نے بے
سے اس کا بازو پکڑ کر اپنی طرف جھٹکا دیا۔ اس کی آنکھوں میں نشہ تیر رہا تھا۔

مینا کے بدن میں شرارے سے دوڑ گئے۔ وہ ایسے معنی خیز اشارے، کنایے بخوبی سمجھتی تھی۔
کچھ کہتی ہوئی، بولتی ہوئی گرفت اسے سارے اسرار و رموز سمجھا گئی اور دوسرے لمحے وہ پکے
پھل کی طرح امداد کے بازوؤں میں تھی۔

"تم گاؤں کی دوسری لڑکیوں سے بہت مختلف ہو۔ اس لئے میں نے سوچا کہ تم سے دوستی
کرنی چاہیے۔" امداد اس کے کانوں میں سرگوشی کر رہا تھا۔ مینا گل پر ایک کیف سا طاری ہو چکا
وہ ان دوڑتے بھاگتے شوخ و شریر لمحوں کے نشان اپنے روئیں روئیں میں جذب کر لینے کی
ش مند تھی۔ ایسے ہی پُر جوش اور مستحکم آہنی حصار کی تو وہ علی مراد سے خواہاں رہی تھی۔

"رات کو کیکر والے کنوئیں پر میرا انتظار کرنا۔ اچھا......"

باہر سے کھٹکے کی آواز سن کر امداد نے اُسے چھوڑتے ہوئے سرگوشی میں پیغام دیا تھا۔ مینا گل
لا کر سرشار قدموں سے باہر آ گئی۔

☆☆☆

"یہ سردار امداد تمہاری راہ میں زیادہ ہی نہیں آنے لگا۔ اگر یہ اتفاق ہے تو نہایت نرالا اور
ب ہے۔"

صفیہ کی ماں کو کسی ضروری کام سے چند دن کے لئے گجرات جانا تھا، وہ جانے سے پہلے
مینا گل کے گھر چھوڑ گئی تھیں، سو صفیہ کافی دنوں سے یہیں تھی اور مینا کے رنگ ڈھنگ ملاحظہ کر

رہی تھی۔ اُس کے ساتھ آتے جاتے اُس نے کئی مرتبہ سردار امداد کو آس پاس منڈلاتے دیکھا تھا۔ صفیہ کی سردار امداد کے بارے میں رائے اچھی نہیں تھی۔ وہ جانتی تھی کہ ایسے لاابالی شہری بابو بظاہر حقیقت اندر سے بے حد خطرناک ہوتے ہیں اُن سے میل ملاپ اور سلام دعا بڑی نقصان دہ ہوتی ہے اور خاص طور پر لڑکیاں تو بسا اوقات اپنی عزت اور جان سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہیں۔ وہ اشارتاً کئی ہی مرتبہ مینا گل کو سمجھا چکی تھی۔

"بس ہو جاتا ہے ایسا کبھی کبھی۔ تو کیا بال کی کھال اُتارنے بیٹھ گئی ہے۔" مینا گل نے اُس کے لہجے میں سرسراتی تفکر کی پرچھائیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے ناک بھوں چڑھائی تھی۔

"کل تم اس سے ملنے ڈیرے پر گئی تھیں ناں؟" صفیہ مشکوک اور قدرے تند نظروں سے اسے جانچ رہی تھی۔

مینا گل کھسیا سی گئی تھی تاہم شیر ہو کر تڑخ گئی۔

"تجھے کیوں پیٹ میں مروڑ اُٹھ رہے ہیں۔" امداد کے پُرجوش ساتھ نے اسے دنیا و مافیہا سے بیگانہ کر دیا تھا اور اسی میل ملاپ میں وہ اپنا گوہر عصمت بھی گنوا بیٹھی تھی مگر عجب بے حسی و ضمیری تھی کہ ایک پل کو شرمندگی اور خوف اُمڈا بھی تو خود کو یہ سوچ کر بہلا لیا کہ اب تو اس کا سردار امداد کا پکا ساتھ ہے۔ اس نے وعدہ کیا ہے ساری عمر سنگ رہنے کا اور پھر جب وہ امداد کی سے فلمی صنعت میں وارد ہو گی تو اس کے حسن وادا اور فنکاری کی واہ واہ میں ماضی کی ہر لغزش گرد کی طرح بیٹھ جائے گی۔

"تم علی مراد بھائی کی امانت ہو۔ یہ بات تمہیں سوتے میں بھی نہیں بھلانی چاہیے۔" صفیہ سنجیدگی سے اُسے دیکھتی ہوئی سپاٹ آواز میں بولی۔ وہ یہ بات پرسوں راستے میں اچانک سردار امداد سے ٹاکرے پر اُسے بھی جتا گئی تھی۔

"اُونہہ۔ تیرا بھائی بھی بھلا کوئی مرد ہے۔ بے حس، ٹھس، بزدل......" مضحکہ و استہزاء اُس کے لفظ لفظ سے ٹپک رہا تھا۔

صفیہ آنکھیں پھاڑے دکھ اور افسوس کے عالم میں اُسے دیکھتی رہ گئی۔

"یاد رکھنا شہرت اور دولت کی ہوس میں رشتے، اخلاقیات اور اقدار کو ٹھوکر پر رکھنے والے آخر میں خیر کی ایک گھڑی اور سکون کے ایک سانس کے لئے ترسا کرتے ہیں۔"

"جاؤ...... جاؤ...... بی بی، سنبھال رکھو اپنی اخلاقیات۔" مینا گل نے ہاتھ ہلا کر بیزاری سے

ا۔

☆☆☆

انکشاف کے زہریلے ناگ نے اچانک ہی مینا گل کو ڈس کر پیلا پھٹک بنا دیا تھا۔ امداد ں میں گاؤں آیا تو اُس نے پہلی فرصت میں اُسے یہ ہولناک خبر سنائی کہ وہ ماں بننے والی وہ بھی اُلجھ کر رہ گیا۔ عیاشی کا یہ انجام تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ مینا گل نے ے ذوق سے کہا تھا کہ اب کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ تیسرا مہینہ شروع ہو چکا ہے اور وہ وقت قریب پہتا ہے جب اُن کی مشترکہ لغزشوں کا بھانڈا رسوا کن انداز میں لوگوں کے سامنے پھوٹ ے گا۔ اب وہ اس حال میں یہاں نہیں رہ سکتی تھی اور نہ ہی اس عالم میں اسے قبول کیا جا سکتا تھا ں کی بے حیائی کا ثبوت اُس کے پیٹ میں پل رہا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ تم کل رات تیار رہنا۔ میں تمہیں شہر لے چلوں گا۔ تمہیں وہاں اپنے ایک فلم یوسر دوست کے پاس چھوڑ کر صبح صبح واپس گاؤں لوٹ آؤں گا تاکہ گاؤں والوں کو مجھ پر شک رے پھر دو تین دن بعد تمہارے پاس چلا آؤں گا۔ ہم چپکے سے نکاح کر لیں گے پھر تم دانہ فلموں میں کام کرنا۔"

خواب بہت نشہ آور تھے، مینا گل کا کمزور ایمان، اس کے نفس کی سحر انگیز پکاریں اُسے انتہائی اٹھانے پر آمادہ کر گئیں اور اگلی رات وہ گھر سے بھاگ کر امداد کے ساتھ شہر آ گئی۔ امداد اسے ے دوست قادر بخش کے پاس چھوڑ کر واپس چلا گیا۔

پھر کبھی نہ آنے کے لئے۔ شوخ تتلی کے سارے ہی رنگ اُس کی ہتھیلیوں میں جذب ہو ے تھے۔ مستی بھری شراب کو اتنا پیا تھا کہ اب طبیعت سیر ہو گئی تھی سو اُسے واپس لوٹنے کی چاہ ہوں کر ہوتی۔

قادر بخش اصل میں ایک معمولی سا کیمرا مین تھا جو لاہور میں کسی فلم ڈائریکٹر کے لئے کام کر تا تھا۔ امداد نے اپنی بلا اُس کے سر منڈھ دی تھی کہ اس کا جو جی چاہے کرو۔ مجھ سے کوئی واسطہ نہیں ہے گا۔

سو قادر بخش نے حسن کی بہتی گنگا میں ایک دو ہفتے خوب ہاتھ دھوئے۔ مینا گل بے بس ی کی طرح جال میں گرفتار تھی اور اُس کے اشاروں پر ناچنے پر مجبور تھی۔ وہ روز ہی دلاسے دیتا تھا کہ آج کل میں اُسے لاہور اپنے ساتھ لے چلے گا اور فلموں میں کام دلوائے گا۔

پھر وہ حسب وعدہ اُسے لے کر لاہور آ گیا۔

فلموں میں کام تو کیا دلوانا تھا' قادر بخش کے پاس پیسہ کمانے کی مشین ہاتھ آ گئی۔ وہ روزانہ نئے مردوں کو گھر لے آتا۔ انہیں فلمی دنیا کے اہم ستون کے لقب سے متعارف کروا کر مینا گل انہیں خوش کرنے کو کہتا۔ مینا کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ ان مالدار گاہکوں سے قادر بخش روزانہ کتنے پیسے وصولتا ہے۔ وہ فلمی دنیا میں وارد ہونے کے لئے چپ چاپ آنے والوں کو عیاشی کا سامان مہیا کر دیتی تھی۔

پھر چار ساڑھے چار ماہ بعد قادر نے ایک روز اسے ایک ادنیٰ درجے کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر سے ملوا ہی دیا۔ ڈائریکٹر بھی اپنی طرز کا کائیاں اور شاطر بندہ تھا حسب سابق اس نے بھی مینا گل کے حسن کو خراج پیش کیا پھر اسے بچے کی ڈلیوری کے بعد کام دلوانے کا بہلاوا دیا۔

''ابھی تمہارا جسم بے ڈول اور بھاری ہو رہا ہے۔ ایسی حالت میں فلم کی کاسٹ میں شامل کرنے میں خطرہ ہے۔''

پھر ایک روز ایک سرکاری اسپتال میں اس نے بیٹی کو جنم دیا۔ اسسٹنٹ ڈائریکٹر جعفر علی نے اس موقع پر سارا خرچا اُٹھایا اور اُس کی صحت یابی تک ساتھ ساتھ رہا۔ اس بچی کو لاوارثوں کے ادارے میں چھوڑ آؤ۔ یہ تمہارے کیریئر کی راہ میں رکاوٹ بن جائے گی۔ ایک بیاہی اور بچے والی ہیروئن کی کوئی مارکیٹ ویلیو نہیں ہوتی۔ اگر تمہیں آگے بڑھنا ہے' نام کمانا ہے تو بچی کی بخ الگ کر ہوگی۔

مینا گل کے کلیجے پر ہاتھ پڑا تھا۔ شروع شروع میں تو اُس نے بچی کو جدا کرنے سے سختی سے انکار کر دیا تھا مگر پھر روشن و درخشاں' نیر و تاباں مستقبل کی خوش آئند جھلک نے اُس کے ممتا بھرے سینے پر بے حسی کی سل رکھ دی۔ یوں بھی ایسی بچی جس کی ولدیت کا خانہ جائز رشتے سے محروم ہو اُس کا معاشرے میں ویسے بھی کوئی مقام نہیں ہوتا۔

ایک اندھیری رات کو وہ اس گل گوتھنی سی ننھی منی سنہری آنکھوں اور سنہرے سیب جیسے گالوں والی پندرہ دن کی بچی کو بچوں کے ایک رفاہی ادارے کے گیٹ پر چھوڑ آئی۔ اس وقت وہ ماں نہیں' خونی بلا بن گئی تھی جو اپنی ہی کوکھ سے جنے اپنے جگر کے ٹکڑے کو کھا جاتی ہے۔

شاید اس کے ستارے گردش میں تھے کہ انہی دنوں اسسٹنٹ ڈائریکٹر جعفر علی کا فلم پروڈیوسر سے جھگڑا ہو گیا اور فلم ساز نے اُسے اپنی یونٹ سے خارج کر دیا۔ وہ کوئی منجھا ہوا ڈائریکٹر تو تھا نہیں

ختم ہوتے ہی اختیار کے غبارے سے ہوا نکل گئی۔ مینا گل قادر بخش کا گھر چھوڑ کر جعفر علی کے
دوں کے مکان میں رہ رہی تھی۔ جعفر علی کو اپنی جان کے لالے پڑے تو مینا گل کی کشش صفر ہو
ایک دن جی بیزار ہوا تو اُسے لاہور کے بازار حسن میں میڈم بانو کے ہاتھوں بیس ہزار روپے
چ آیا۔

ہیں سے مینا کی زندگی کا نیا باب شروع ہوا۔ میڈم بانو نے کچھ عرصہ اُسے کوٹھے کے درو
ے مانوس کرنے کے لئے ضروری تربیت دی پھر جب وہ رقص اور گانے میں ماہر ہو گئی تو
اپنے ہمراہ اسلام آباد لے آئی۔

''میں تمہیں جلد ہی چوٹی کی ہیروئن بنا دوں گی۔ میرے ایک اشارے پر منجھا ہوا مشہور و
ف ڈائریکٹر دوڑا چلا آئے گا۔ میں تمہارے لئے اپنی ذاتی فلم میں سرمایہ لگا سکتی ہوں مگر اس
بدلے تمہیں میرا کام ایمانداری سے کرنا ہوگا۔''

گل کی تو یہ کیفیت تھی کہ وہ اپنے خوابوں کی تعبیر پانے کے لئے سر کے بل بھی کھڑی ہو
ا۔

''آپ حکم کریں میڈم۔''

''اس کوٹھی میں مالدار اسامیوں کے علاوہ بڑی بڑی کرسیوں پر بیٹھنے والے حکومت کے اہم
یدار اور سرکاری افسران دل بہلاوے کے لئے آتے ہیں۔ کچھ رابطہ کر کے اپنی مطلوبہ جگہ پر
بلوا لیتے ہیں۔ تمہارا کام یہ ہے کہ تمہیں جس متعلقہ افسر کی خدمت میں بھیجا جائے اُس سے
ا کے محکمے کے بارے میں کچھ خفیہ راز معلوم کرو۔ ان خفیہ معلومات کے متعلق تمہیں تفصیلی بتا دیا
ے کہ کیا کیا دریافت کروانا ہے۔ تم کسی طرح ادا و ناز اور عشوے وغمزے سے کسی ہوم سیکرٹری'
ریٹری' چیئرمین' انفارمیشن آفیسر یا بذات خود کسی وزیر موصوف سے خفیہ فائلوں کے بارے میں
لوائی ہو' یہی تمہارا فن جانچنے کا ذریعہ ہوگا۔''

مینا گل کی موٹی کھوپڑی میں یہ بات نہیں آ سکتی تھی کہ میڈم بانو اُسے اپنے ملک و قوم سے
داری کا سبق پڑھا رہی ہیں۔ حکومتی مشینری کے اہم ترین پرزوں کو اُلو بنا کر ان سے قومی راز لینا
ور پھر اسے ملک دشمن عناصر کے حوالے کر دینا غداری کی نچلی سطح تھی مگر اُسے تو آم کھانے سے
ام تھی نہ کہ پیڑ گننے سے۔

اس نے میڈم کے حکم کی تعمیل کی اور میڈم نے اس کے من کی خواہش پوری کر کے اسے

ہمیشہ کے لئے اپنا غلام بنالیا۔ ایک سال کے اندر اندر وہ فلم اسٹار بن گئی۔ حسن و زیبائش کی تو پہلے
ہی کمی نہ تھی اس پر مستزاد اُس کی قدرتی فنکارانہ صلاحیت نے اپنا لوہا منوالیا۔

اب شہرت سچ مچ اُس کے قدموں کے نیچے آ چکی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ فلم انڈسٹری
معروف ترین اداکارہ بن گئی۔ میڈم بانو کی پشت پناہی ہر قدم پر اُس کے ساتھ تھی۔ اب وہ
چال' ناز و انداز اور حسن و شباب میں ہر لحاظ سے "پالش" ہو چکی تھی۔ اگلے تین چار برس مزید عر
کا باعث بن گئے تھے مگر ایک خلش' ایک کمی اسے رہ رہ کر ستاتی تھی۔ ماضی کے ہر نقش کو وہ ذ
سے کھرچ چکی تھی۔ حتیٰ کہ جب ایک روز امداد اس سے ملنے اسٹوڈیو آیا تو اُس نے پہچاننے
انکار کرتے ہوئے سختی سے جھڑک کر اُسے سیٹ سے باہر نکالنے کا حکم دیا تھا مگر وہ معصوم سا ننھا
وجود اُسے رات کے کسی پہر گدگدانے لگتا۔

اس نے خفیہ طور پر مذکورہ رفاہی ادارے سے رابطہ کیا۔ مختلف مراحل سے گزرنے کے
علم ہوا کہ اُسے کوئی بانجھ بیوہ مسز مجتبیٰ اپنی بیٹی بنا کر لے گئی تھیں' پچھلے برس اُن کا انتقال ہ
ہے۔ انہوں نے مرنے سے پہلے اسے آیا اماں راشدہ خاتون کو سونپ دیا تھا۔ اپنی کوٹھی بچی کے
کر دی ہے اور آیا اماں کو اس کا مختار بنایا گیا ہے۔

مینا گل ایڈریس ڈھونڈ ڈھانڈ کر بالآخر راشدہ تک پہنچ ہی گئی۔ سات سالہ حسین و
خوابناک آنکھوں والی متین سی مشعل کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں ٹھنڈ پڑ گئی تھی۔ اس نے مختص
اماں کو اپنا اور مشعل کا رشتہ بتا کر اس بات کو خفیہ رکھنے کی ہدایت کی تھی۔ راشدہ نے عہد نبھایا او
زبان نہ کھولی۔ علی مراد کے بارے میں یہی اطلاع ملی تھی کہ وہ اسے ڈھونڈتا ہوا جانے کہاں
تھا۔ اس کی جدائی میں اس کی ماں چل بسی اور صفیہ اپنی شہر والی خالہ کے ہاں بیاہ کر گاؤں چھ
مکمل طور پر شہر میں سیٹ ہو چکی تھی۔

☆☆☆

"اُف۔" مینا گل نے ماضی کی اُلجھی بگڑی پیچیدہ راہوں سے واپس لوٹتے ہوئے
جھری سی لی تھی۔ کتنی دیر سے فون بج رہا تھا اور وہ ماضی کے دُھندلکوں میں کھو کر ساعتوں
توڑ بیٹھی تھی۔

"ہیلو۔" اس کا لہجہ شہد بھرا تھا۔

"تمہاری خوش قسمتی تھی جو اتنی گولیوں کے باوجود بچ گئیں۔ دھیان رکھنا۔ اب کی با

ظا نہیں ہوگا۔ آخر ایک نہ ایک دن مجسم بدی خون میں نہائے گی۔ تمہارا میرے ہاتھوں مرنا
ا گیا ہے۔" سالار خان کا چیتے کی طرح غراتا ہوا لہجہ اُس کے کان سے ٹکرایا تھا۔

"تمہیں جرأت کیسے ہوئی مجھے فون کرنے کی۔" وہ تپ کر بولی۔

"پٹھان ہوں' میں ذات کا اور ہم جرأتیں دوسروں سے اُدھار نہیں مانگا کرتے۔ یہ ہمارے
جذب ہوتی ہیں۔" وہ جیسے شعلے کی طرح دہکا ہوا تھا۔ "بہرحال اتنا یقین دلا دوں' اس بار
کا پیغام فائر کے ذریعے نہیں ملے گا۔ ہم دوسرا طریقہ کار اختیار کریں گے۔ تمہیں تمہارے
شان موت فراہم کی جائے گی۔"

فون ایک جھٹکے سے رکھ دیا گیا تھا۔ مینا دل ہی دل میں ہراساں ہونے لگی۔ اُف۔ یہ عذاب
ب زندگی۔ آخر کیا پایا میں نے اپنا سب کچھ گنوا کر۔ احساسِ زیاں کے زہریلے ناگ اُس کو
ہے تھے۔

بہرحال اب کچھ نہ کچھ تو کرنا تھا۔ وہ ذہن میں کڑیاں ملاتے ہوئے اُٹھی اور موبائل فون
لے کر باتھ روم میں بند ہو کر مشعل کا نمبر ملایا۔

"میں آ رہی ہوں تمہارا مطلوبہ "گفٹ" لے کر ہوشیار رہنا۔"

اس کی آواز سرگوشی سے بھی کچھ کم ہی ہو گی پھر فوراً ہی موبائل آف کرنے کے بعد باہر نکل
ب اس کا رخ افراح کے کمرے کی طرف تھا۔

"افراح ...... افراح۔" وہ بمشکل اُسے بار بار ہلا جلا کر ہوش و حواس کی دنیا میں لائی تھی۔
ت کی وجہ سے افراح کو آنکھیں کھولنا بھی ایک مشقت کی طرح لگ رہا تھا۔ وہ دو دن سے
ا پیاسی تھی۔

"یہ بتاؤ اگر تمہیں تھوڑی دیر کے لئے کار کی ڈکی میں بند ہونا پڑے تو اتنی گھٹن برداشت کر لو
ینا اُس کے کان میں سرگوشی کر رہی تھی۔ افراح آنکھیں پھاڑے اُسے دیکھتی رہ گئی۔

"میرا یقین کرو۔ میں تمہیں نجات دلانے کے لئے پلاننگ کر رہی ہوں۔"

اس کی پتھرائی ہوئی منجمد کیفیت دیکھ کر مینا نے اس کے کندھے جھنجھوڑتے ہوئے جوشیلے مگر
لہانہ انداز میں یقین دہائی کرائی۔

"میں رہائی کے لئے اپنے ہاتھ پاؤں کٹوانے کو بھی تیار ہوں۔" بالآخر افراح کی بھرائی
ہی کمزور آواز اُبھری۔ وہ خشک ہونٹوں پر بے چینی سے زبان پھیر رہی تھی۔ اس کی

آنکھوں میں بجھی ہوئی جوت واپس آنے لگی تھی۔ بکھرے ہوئے بالوں اور ملگجے کپڑوں میں وہ کوئی
بھٹکی ہوئی پریشان حال روح لگ رہی تھی۔

"چلو پھر اُٹھو۔ وقت کم ہے۔" مینا نے عجلت میں گھڑی دیکھی۔ رات کے دس بج رہے
تھے۔ کسی بھی لمحے میڈم بانو خود آسکتی تھیں یا کال کر کے صورتِ حال سے باخبر ہوسکتی تھیں۔

افراح سے اُٹھا نہیں جا رہا تھا پھر بھی کسی طرح گھسیٹتے ہوئے باہر پورچ میں آئی۔ اس کوٹھی
پر مینا نے کوئی کل وقتی ملازم نہیں رکھا تھا۔ ایک ماسی تھی جو دن کے اوقات میں صفائی ستھرائی کر جاتی
تھی۔ یوں بھی مینا کم کم ہی یہاں ٹھہرتی تھی۔ وہ بھی ایک دو پہر کے لئے۔ کھانا ہوٹل سے کھاتی
تھی۔ اس لئے ملازمہ کا ٹنٹا پالنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔

افراح کسی طرح سکڑسمٹ کر ڈگی میں لیٹ گئی۔ مینا نے احتیاط سے ڈگی کو بند کیا اور پھر اندر
جا کر انٹر کام پر ڈینی سے رابطہ کیا۔ ڈینی گیٹ کے باہر مستعد کھڑا تھا۔

"میں آدھے گھنٹے کے لئے جا رہی ہوں' ڈنر کے لئے۔ تم دھیان رکھنا۔ لڑکی اندر کمرے
میں بند ہے۔ ہوشیاری سے کوٹھی کے اردگرد پہرہ دینا۔"

"آپ بے فکر رہیں میڈم۔" ڈینی کا مخصوص کھردرا' کھڑکھڑاتا ہوا بھاری بھرکم لہجہ مؤدب
تھا۔

مینا گل نے باہر آکر ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ ڈینی نے فوراً ہی
گیٹ کھول دیا تھا۔ مینا ریش ڈرائیونگ کرتی ہوئی آندھی طوفان کی طرح مشعل کی کوٹھی پر پہنچی تھی۔
مشعل باہر گیٹ کے پاس ہی کھڑی تھی۔ گاڑی رُکتے ہی اس سمت لپکی اور پھر اکیلے مینا کو باہر نکلتے
دیکھ کر آس و نراس کے عالم میں اُسے دیکھنے لگی۔ مینا مبہم سا مسکرائی اور ڈگی کا لاک کھولنے لگی۔

"اسے سہارا دے کر اندر لے جاؤ۔ میں ایک سیکنڈ رُکنے کا رسک بھی نہیں لے سکتی۔"

وہ مشعل کے تاثرات نوٹ کئے بغیر کار واپس لے اُڑی۔

ڈینی بدستور گیٹ پر مستعد تھا۔ مینا نے ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے گاڑی پورچ میں
کھڑی کی اور اندر چلی گئی پھر پلاننگ کے مطابق پانچ منٹ بعد چیختی ہوئی باہر آئی تھی۔

"ڈینی...... ڈینی...... وہ لڑکی کہاں ہے؟"

"میڈم' وہ اندر ہی ہوگی۔" ڈینی اُس کا ہراساں چہرہ دیکھ کر گھبرا گیا۔

"وہ اندر نہیں ہے ڈینی۔ ضرور کوئی اسے یہاں سے لے اُڑا ہے۔" خوف سے اس کی

اُبلی پڑ رہی تھیں۔ بڑی جاندار اداکاری کر رہی تھی۔

"یہ نہیں ہوسکتا میڈم۔ ڈینی کی موجودگی میں پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا۔ آئیں' اندر دیکھتے
ینی کے لہجے میں تیقن تھا۔ کوٹھی کا ایک ایک کونا چھان مارا مگر نتیجہ ڈھاک کے وہی تین پات

"میرے خدا۔ میڈم بانو تو مجھے شوٹ کر ڈالیں گی۔" وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ ڈینی کا اپنا چہرہ
کا اشتہار بن گیا تھا۔

"آپ کا اس میں کیا قصور میڈم۔ غفلت تو مجھ سے ہوئی۔ آپ بے فکر رہیں' میں میڈم بانو
نے آپ کی صفائی پیش کر دوں گا۔ سزا کا حق دار میں ہوں۔ آپ نہیں۔ میڈم آپ کو کچھ
گی۔"

☆☆☆

"آرام سے...... سج سے پاؤں رکھو......" مشعل نرمی سے لڑکھڑاتی ہوئی افراح کو سہارا
بدقت اندر لائی تھی۔ لان میں بے چینی سے چکر کاٹتا ہارون اُسے دیکھتے ہی گولی کی طرح
لپکا تھا۔ مشعل نے مینا گل کی خفیہ کال کے فوراً بعد ہارون کو اپنی کوٹھی پر بلوا لیا تھا۔ وہ غالباً
پہلی مرتبہ اس گھر کا گیٹ عبور کر کے اندر آیا تھا۔

"ہارون بھائی۔" افراح کے رہے سہے خوابیدہ حواس بھی جھٹکا کھا کر بیدار ہوگئے تھے۔ وہ
کاری کے ساتھ ہارون کے قریب آئی اور بے اختیارانہ لپٹ گئی۔ آنسو سیلاب بلاخیز کی
ل اُبل کر ہارون کا شانہ بھگونے لگے۔

"ریلیکس۔ ریلیکس۔" ہارون بے چارہ اس اچانک "حملے" سے بُری طرح بوکھلا گیا۔ گھبرا
ہاتھ اس کے سر پر رکھ کر تسلی دینے والے انداز میں تھپتھپاتے ہوئے آہستگی سے اُسے
الگ کر دیا۔

مر کر دوبارہ زندہ ہوئی ہوں' ہارون بھائی۔" وہ بھل بھل رو دی۔

میں تمہاری کیفیت سمجھ رہا ہوں اور اس بھیانک حادثے کا ذمے دار بھی میں ہوں۔ تم
میری حفاظت میں بھیجے گئے تھے۔" ہارون کا لہجہ شکستہ اور دھیما تھا مگر اس کے اندر قہر کی
کروٹ لے رہی تھیں۔

چلیں۔ میں آج اور اسی وقت تم لوگوں کو واپس لاہور بھجوا رہا ہوں۔ اس کے بعد

معاملہ زیر تفتیش لاؤں گا۔"

"کون سے گھر ہارون بھائی۔ لڑکی ایک رات کے لئے بھی گھر سے بے گھر ہو جائے تو وہ
کے لئے پرائی اور بُرائی بن جاتی ہے۔ گھر والوں کے لئے بھی اور معاشرے کے لئے بھی۔"
افراح کے بھیگے لہجے سے تلخی جھلک رہی تھی۔

"اس شہر میں تم اجنبی ہو۔ کوئی تمہارے بارے میں نہیں جانتا اور لاہور تک اس واقعے
بازگشت کسی صورت بھی نہیں پہنچ سکے گی۔ ہم اسے مکمل طور پر راز رکھیں گے۔ کسی کی زبان پر
نہیں آئے گا۔ تم مطمئن رہو اور یہ بھی تسلی رکھو کہ جب تک میں زندہ ہوں' تمہیں اس حال
پہنچانے والے ایک ایک فرد کو پس زنداں ڈال کر رہوں گا۔" اس کا مدھم لہجہ اندرونی خلفشار
اشتعال سے لبریز تھا۔

"ہم چلتے ہیں۔" ہارون اب تک ساکت وصامت کھڑی مشعل کی طرف مڑا اور ایک
کو ممنونیت سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ "میں شکریہ ادا کر کے تمہاری نیکی کا حسن گھٹانا نہیں
چاہتا۔ میں اپنی زندگی کی سب سے قیمتی شے تمہاری نذر کر دینا چاہتا تھا مگر ہمیشہ یہی سوچ کر
مسوس کر رہ گیا ہوں کہ تمہارے شایان شان چیز میرے پاس موجود ہی نہیں ہے۔" اس کا لہجہ
حد درجہ گمبھیر اور جذباتی تھا۔ افراح بے اختیار چونکی۔

"طنز نہیں کرو۔" وہ پھیکے پن سے مسکرائی۔ "اگر ایمرجنسی نہ ہوتی تو میں افراح
میزبانی کر کے دلی خوشی محسوس کرتی۔ کبھی دوبارہ اچھے موسموں میں آنا ہو تو باقی بہنوں کے
ضرور آنا۔" مشعل افراح سے مخاطب ہو کر شفقت سے اسے دیکھنے لگی۔

"تم اندر جاؤ۔ گیٹ چوکیدار بند کر لے گا۔ اتنی ٹھنڈ ہو رہی ہے اور تم نے فقط ایک
اوڑھی ہوئی ہے' کوئی سویٹر جرسی کیوں نہیں پہنی۔"
ہارون کی ڈانٹ میں اپنائیت آمیز خفگی شامل تھی۔ افراح عجیب سے احساس سے
ہونے لگی۔

"ٹھنڈ سے انسان مر نہیں جایا کرتے۔" مشعل تکلیف دہ انداز میں مسکرائی۔

"اللہ نہ کرے۔ کیسی بدفال منہ سے نکال رہی ہو۔" ہارون نے بے ساختہ ہی ا
تھا۔ جیسے وہ ایسی کسی صورت حال کا تصور کرنا بھی محال سمجھتا ہو۔ "چلو اندر اور ہاں رات کا کھانا
سونا۔ مجھے یقین ہے صبح سے تمہارا کھانا پینا چھوٹا ہوا ہو گا۔ خالی پیٹ سونا نقصان دہ ہوتا

تے جاتے بھی نصیحت کرنا نہیں بھولا تھا۔

"اچھا ڈاکٹر صاحب' حالانکہ اب مزید کیا نقصان ہو سکتا ہے۔"

☆☆☆

حالانکہ مینا گل کا خوف کے مارے دم نکلا جا رہا تھا مگر اُس کی توقع کے برعکس میڈم نے
ہ غیظ و غضب کا مظاہرہ نہیں کیا۔ سرد مہری سے اُس کی زبانی ساری واردات تفصیلاً سنی۔ ڈینی کا
لیا اور پھر اسے بھی سخت سُست کہنے کے بعد بگڑے موڈ سے اُٹھ کھڑی ہوئیں۔

"بہر حال جو ہونا تھا' ہو چکا مگر اب تمہاری ذات میرے لئے قابل بھروسا نہیں رہی۔ بہت
وا۔ تمہاری غفلت نے ہمیں اندھے کنوئیں میں دھکیل دیا ہے۔ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ بڑے
نے پر کارروائی کی جا سکتی ہے۔ مجھے تمہاری نااہلی کا علم ہوتا تو۔ خیر تم لاہور سدھارو۔ میں دیکھ
گی' سب معاملہ۔"

جان بچی سو لاکھوں پائے کے مصداق مینا گل کو اُن کی تلخ و ترش باتیں چنداں ناگوار نہ
ریں۔ وہ اسی پر شکر کر رہی تھی کہ میڈم بانو نے اسے عبرت ناک سزا کا مستحق نہیں ٹھہرایا۔
سو وہ اگلے دن لاہور چلی آئی پھر وہی مصروفیات شروع ہوئیں۔ اُس کا فلمی عروج زوال کی
ف رواں دواں تھا۔ اب اُس کے شباب کا سورج دھیرے دھیرے ڈھلنے لگا تھا کہ عمر کا تقاضا
تھا۔ نئے نئے چہرے فلم انڈسٹری میں قدم جما رہے تھے۔ مینا گل کے لئے یہ ایک دھچکا ہی
۔ اُس نے برسوں فلم انڈسٹری پر بے تاج حکومت کی تھی۔ اس سال اس کی تقریباً ساری فلمیں بُری
ح فلاپ ہوئی تھیں۔ وہ سخت ڈپریشن کا شکار تھی۔ اس نے سنجیدگی سے اپنے مستقبل کے بارے
سوچنا شروع کر دیا تھا۔ اسی ارادے سے اُس نے اُس روز ہارون کا موبائل نمبر ملایا تھا۔

"اُمید ہے' تم اب تک اچھی طرح سوچ چکے ہو گے۔"
وہ نرمی اور سبھاؤ سے مخاطب ہوئی۔

"کس بارے میں؟" وہ اچنبھے میں پڑ گیا۔

"مذاق نہ کرو۔ میں سنجیدہ ہوں۔ بھئی میرے اور اپنے بارے میں۔"

"اوہ۔" ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے ہارون نے اپنی عقل پر ماتم کیا تھا۔

"مادام! بہتر ہوتا کہ ہم آمنے سامنے بات کرتے مگر موجودہ سچویشن میں' میں خود میں اتنی
سکت نہیں پاتا کہ آپ کا اتنا گھٹیا' اتنا مکروہ اور گھناؤنا روپ دیکھوں۔" ہارون کے لہجے میں

ہزاروں اژدھوں کی پھنکاریں تھیں۔" "آپ کو یہ سنگین غلط فہمی کیونکر لاحق ہوئی کہ میں خدانخواستہ
آپ کے حسن کی طلب میں آپ کے پیچھے خوار ہوتا رہا ہوں؟ میرے نزدیک آپ کی حیثیت ایک
جسم فروش اور غدار وطن عورت کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔ اسی ٹوہ میں آپ سے میل ملاپ رکھ
رہا ہوں۔ مجھ جیسا بندہ جو سانس بھی ازروئے شرع و دین لیتا ہے' بھلا شریکِ حیات کے انتخاب
میں ایسی فاش بلکہ فحش غلطی کیونکر کر سکتا تھا۔"

وہ حرف حرف جیسے کالے ناگ کے زہر سے انجیکٹ کر کے اس کے جسم و جاں میں اُتار رہا
تھا۔

"مشعل کو جانتی ہیں ناں۔ اگر آپ کی کوئی بیٹی ہوتی تو اُسی کی عمر کی ہوتی۔ اُس کی پاکیزگی
کے طلسم نے مجھے برسوں سے اسیر کر رکھا ہے۔" اس نے ایک ہی جملے میں مینا گل کے حواس ٹھ
ادیے تھے۔

"کیا......!" اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا۔ اپنا آپ غلاظت و گندگی سے
لتھڑا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ اپنی ہی نظروں میں گر گئی تھی۔

"ایک سراپا حیا و دیندار عورت ایسی اہمل اور بے سروپا بات کہنے کی کبھی جرأت نہیں کر سکتی
لیکن معاملہ یہ ہے کہ آپ نے اپنے اندر کی عورت کا ہر روپ بڑے اہتمام سے تباہ کر ڈالا ہے۔ نہ
کبھی شریف بیٹی بن کے رہ سکیں' نہ محبوبہ و منکوحہ۔ نہ بہن اور نہ ماں۔" اُس کے جملوں نے انجانے
میں مینا گل کے زخموں کے ٹانکے اُدھیڑ دیے تھے۔

"اسی لئے ایسی بات بے حجابانہ کہہ گزریں۔" ہارون کے الفاظ پتھر برسا رہے تھے۔

"بہر حال آئندہ اپنی عمر سے آدھے بندے کو پرپوز کرنے سے پہلے مشعل کا تصور ضرور کر لیجئے
گا۔" ہارون نے کچھ جتاتے ہوئے فون پٹخ دیا تھا۔ کیا جتایا تھا' یہ مینا گل سمجھنے کے باوجود سمجھنا نہیں
چاہتی تھی۔

☆☆☆

"میں نے تمہیں بلا کم و کاست اپنی داستان سنا دی ہے جانو۔ اب تو میری سزا میں کچھ
تخفیف کر ڈالو۔" مینا گل نے گم صم بیٹھی مشعل کے گھٹنے ہلا کر لجاجت سے کہا تھا۔ "آیا اماں بھی پاس
بیٹھی تھیں۔ وہ تو پہلے ہی کافی حد تک مینا گل کے ماضی سے واقف تھیں۔ البتہ مشعل کے لئے مینا
گل کی زبانی' اپنی مینا گل اور سردار امداد کی اصلیت واضح پا کر اسے مینا گل کے ساتھ ساتھ خود سے

کراہیت آنے لگی تھی۔

وہ ایسی عورت کی کوکھ سے پیدا ہوئی تھی جس نے شعور کی دنیا میں قدم رکھتے ہی گناہ آلود تخیل
تنہائیاں سجائی تھیں۔ جو حرص و ہوس میں اندھی ہو کر اپنے ماں باپ کے سر پہ خاک ڈال آئی

"اور ان بدنصیبوں کا کیا ہوا جنہیں غلطی سے آپ کے سگے بہن بھائی اور ماں ہونے کا
ز حاصل تھا۔" تلخی اُبلتے ہوئے چشمے کی طرح مشعل کے لہجے میں سنسنا رہی تھی۔

مینا گل نے بے اختیار شکوہ کناں انداز میں اس کے بے رحمانہ استفسار پر اُس کی سمت دیکھا

برسوں پہلے صفیہ سر راہ ملی تھی۔ وہ شادی کے بعد شہر آ گئی تھی۔ اسی سے پتا چلا کہ بڑے بھائی
طیش میں آ کر امداد پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ وہ تو بچ گیا مگر بھائی کو جیل ہو گئی۔ اس رسوائی اور ذلت
بعد دوسرے بھائیوں نے اماں سے مشورہ کر کے ایک روز چپکے سے گاؤں چھوڑ دیا اور کہیں اور
ے۔ مینا گل اُن کے لئے مر چکی تھی۔ وہ اس کے کارنامے کی تصویریں اخبار اور رسالوں میں
کر نفرت سے یوں منہ پھیرتے تھے' جیسے بھوت دیکھ لیا ہو۔ خود صفیہ نے سختی سے تنبیہ کی تھی۔
ئندہ مجھے پہچان کر آواز نہ دینا۔ میرے سسرالی بڑے شریف گھرانے کے لوگ ہیں۔ وہ
ریوں اور طوائفوں سے تعلق بڑھانا اپنی غیرت کا خون سمجھتے ہیں۔

علی مراد در بدر بھٹک رہا تھا۔ کہاں۔ یہ کسی کو علم نہیں تھا۔ جانے جنون اسے کن منزلوں کی
ں میں لے اُڑا تھا۔

مینا نے صفیہ کے ذریعے امداد کو پیغام پہنچایا تھا۔ "اُسے کہنا' تمہاری بیٹی تین برس کی ہو گئی
ہے۔ جب تیرہ کا سن لگے گا تو ماں کی گدی سنبھال لے گی۔"

یہ محض اشتعال و انتقام پر مبنی جملہ تھا مگر سردار امداد کی رگ رگ میں آگ دہکا گیا تھا۔ وہ بار
اُس کی کوٹھی پر آیا تھا۔ اپنی بیٹی کا پتا دریافت کرنے کے لئے اُسے ہر ممکن طریقے سے رام کرنے
کوشش کی تھی۔

"اب میں کوئی معمولی چیز نہیں ہوں چھوٹے سردار۔ چاہوں تو تمہیں تمہارے اونچے
رے سمیت ذلیل و خوار کر کے گھر سے باہر پھنکوا سکتی ہوں۔ اب میں نادان دبوبی غلامانہ فطرت
رکھنے والی مینا نہیں رہی جسے تم اپنے اشاروں پر نچاتے تھے۔"

"وہ بھی اللہ کی زمین پر کہیں آباد ہوں گے۔" میناگل نے طویل وقفے کے بعد اُس کے سوال کا جواب دیا تھا۔ "بہر حال اب وہ میرے لئے نہیں ہیں اور میں اُن کے لئے مر چکی ہوں۔"

تفصیلات جان کر اپنے وجود پر رہا سہا مان بھی ختم ہو گیا تھا۔ مشعل کے اندر آتش فشاں پھ کو تھا۔ وہ تو سرتا پا غلاظت میں لتھڑا ہوا کوڑا ہوا کوڑا کباڑ تھی۔ ایک ایسی ماں کی اولاد تھی جس بدن کے اسرار سے اب تک سینکڑوں ہزاروں عیاش مرد واقفیت حاصل کر چکے تھے۔ ایک ا باپ کی اولاد تھی جس کی عمر کا زیادہ تر حصہ رنڈیوں اور کوٹھے والیوں کی آغوش میں گزرا تھا۔

اپنا اصل اپنی جڑ اپنی شناخت ہی تو ذریعۂ افتخار و اعزاز ہوا کرتی ہے۔ اسی پر بندہ مان گمان خوش رنگ عکس سجاتا ہے۔

"تم ہارون کو جانتی ہو مشعل۔" میناگل نے بہت نرمی سے اُس کا چہرہ کھوجتے ہوئے د لہجے میں بغور اُسے دیکھتے ہوئے اچانک پوچھ ڈالا۔

مشعل کے چہرے پر زلزلے کے سے آثار اُمڈ آئے۔ میناگل ٹکٹکی باندھے اسے دیکھ ر تھی۔

"کیا کروں گی جان کر۔ وہ میری دنیا کا نہیں ہے اور میں اُس کی پاک و پوتر نورانی دنیا باسی نہیں بن سکتی۔" نہ چاہتے ہوئے بھی مشعل کے منہ سے سرد آہ نکل گئی۔

"میرے لئے اس چار دیواری کے باہر ہر چیز اجنبی ہے۔ ہر رشتہ ناقابل رسائی ہے۔ جیسے تو بس اپنی ہی قید میں جکڑے رہنے والے لوگ ہیں۔"

میناگل کا پورا جسم پسینے میں غرق ہونے لگا۔ جس حقیقت کو وہ نہیں پا سکتی تھی وہ اس سے پ اُس کی بیٹی پا چکی تھی۔

"میں تو تم جیسی پاکیزہ و مصفا لڑکی کی ماں کہلانے کے لائق بھی نہیں ہوں۔ مجھے معاف دینا میری جان۔" مشعل کو گلے لگا کر اس کی پیشانی چومتے ہوئے کتنے بہت سے آنسو سیلا ریلے کی طرح مینا کے میک اپ زدہ چہرے پر لُڑھک آئے تھے۔

مشعل بے حس و حرکت کھڑی رہی۔ دل کی پتھریلی دیواریں جذبات کی ہر یلغار کے جواب میں خشک و سرد اور منجمد رہتی تھیں۔

☆☆☆

"لگتا ہے اسلام آباد کے ٹرپ نے کچھ زیادہ ہی تھکا دیا ہے تم لوگوں کو اتنا عرصہ ہو گیا

ہوئے مگر ابھی تک گھر میں امن سکون ہے۔ نہ شور شرابا ہے نہ لڑائی جھگڑے اور نہ چھینا جھپٹی ران ہونے والی چیخ و پکار۔"

احمد بھائی مسکراتی ہوئی نظروں سے اُن کے چہرے جانچ رہے تھے۔ وہ سب کے ساتھ آباد نہیں گئے تھے۔ آفس سے چھٹی نہیں مل سکی تھی حالانکہ رضوانہ بھابی نے اپنا پورا زور لگایا یں ہمراہ لے جانے کے لئے۔

"کبھی کبھی سنجیدہ بھی رہ لینا چاہیے۔ صحت کے لئے اچھا ہوتا ہے۔" رضوانہ بھابی پھیکے سے یں مسکرائیں۔

اصل میں افراح کی اچانک گمشدگی اور بازیابی کا سانحہ اس درجہ اعصاب شکن اور ہوش اُڑا نے والا تھا کہ وہ لوگ لاہور واپس آ کر بھی اس شدید جھٹکے کے اثر سے باہر نہ نکل سکے تھے۔

"ارے بھئی ہم تھکن اُتار رہے ہیں۔ ذرا زبان کو آب دے لینے دیجیے پھر دیکھیے گا ہماری ن کی دھار۔"

توقیر ماحول کی گمبھیرتا توڑنے کے لئے ہلکے پھلکے انداز میں گویا ہوا۔

"میرا تو خیال ہے گھر میں کوئی ہلا گلا ہونا چاہیے۔ مثلاً کسی کی شادی خانہ آبادی۔ یہ جمود تو ٹے۔ کیوں اماں جان۔" احمد بھائی نے تائید طلب نظروں سے اماں جی کی طرف دیکھا۔

"اے بچے۔ شادی کرنی ہے کوئی تماشا تھوڑی ہے جس سے جی بہل جائیں گے۔ مناؤ تا ون کو تم لوگ۔ وہ تو پٹھے پر ہاتھ بھی نہیں دھرنے دیتا۔"

اماں جی اپنی جگہ ملال کھا رہی تھیں۔

چپ چاپ گھٹنوں میں سر دیے مانند تصویر ساکت بیٹھی افراح کے اندر اچانک سناٹا ٹوٹ اور وہ چونک کر پہلو بدلتے ہوئے اماں جی کی صورت تکنے لگی۔

"آخر وہ کون سی حسینہ عالم ہیں جن کے قبضے میں ہارون بھائی کا دل ہے؟" اسماء نے ہاتھ لتے ہوئے جوش و تجسس سے خود کلامی کی تھی۔ افراح کے دل میں آگہی کا دیا سا روشن ہو گیا۔

"وہ یقیناً میناگل نہیں ہو سکتی تو پھر وہ بھلا کون ہے؟"

"افراح باجی آپ کو ہارون بھائی بلا رہے ہیں۔ کہہ رہے ہیں فارغ ہو کر میری بات سنتی گا۔ وہ اپنے کمرے میں ہیں۔"

طیبہ تیز تیز قدموں سے اندر داخل ہوئی تھی۔ افراح سنتے ہی جلدی سے اُٹھ کھڑی ہوئی
جب کمرے کے دروازے پر پہنچی تو اسے دروازے کی سمت پشت کیے کسی سے فون پر مصروف گفتگو
پایا۔

"تمہارے پاس میرا نمبر سالوں سے محفوظ پڑا ہے اور تم نے آج زندگی میں پہلی بار میرے
گھر پر مجھے کال کیا ہے۔ میں خود کو ہواؤں میں اُڑتا محسوس کر رہا ہوں۔ بھلے سے افراح کی طبیعت
پوچھنے کے لئے کیا ہے مگر کیا تو۔"

ہارون کا لہجہ قدردانی' اپنائیت اور محبت کے گداز ترین جذبوں میں گندھا ہوا تھا۔ افراح
کے قدم ٹھٹک کر رک گئے۔ ہارون اس کی آمد سے بے خبر ترچھے رخ کھڑا فون سن رہا تھا۔

"کیسی ہو تم ......؟ ہوں۔ مجھے یاد کیا تھا۔" لفظوں سے گویا ساتوں سُر پھوٹ رہے
تھے۔ عجب از خود رفتہ سی نغمگی' رچاؤ اور دلنوازی تھی لہجے میں۔ "تم فکر نہ کرو۔ میری تو صبح بھی
تمہاری یاد سے ہوتی ہے اور شام بھی۔ مشعل' میں سوچتا ہوں' کیا واقعی کسی شخص کی یاد میں اتنی تاثیر
ہوتی ہے کہ محض نام لینے سے سارے جہاں کے گلابوں کی خوشبو اور ٹھنڈک دل میں اُتر جاتی ہے۔
روح سرشار ہو جاتی ہے اور جذبے پرواز کے لئے بے تاب ہونے لگتے ہیں۔ میں سارا دن کولہو
کے بیل کی طرح کام میں مصروف رہتا ہوں مگر کیا تم یقین کر سکو گی کہ کسی ایک لمحے بھی تمہاری یاد
سے غافل نہیں ہو پاتا۔ تم ہر ہر ساعت میرے ساتھ ہوتی ہو۔ میں کام کرنے لگتا ہوں تو تم اپنی
نگاہوں کے خمار سے مجھے حوصلے کے جام پلاتی ہو۔ تھکنے لگتا ہوں تو تمہاری مرمریں انگلیاں میری
پیشانی پر مسیحائی کا جادو جگانے لگتی ہیں۔ کھانا شروع کرتا ہوں تو تم میرے مقابل کرسی پر بیٹھ کر میرا
ساتھ دیتی ہو۔ سونے لگتا ہوں تو تم تصور کے دریچے سے چپکے سے میرے کمرے میں' میری
سانسوں میں' میرے دل کی دھڑکن میں اُتر آتی ہو۔ صبح ہوتی ہے تو تمہارے گیسوؤں کا ریشم
میرے چہرے پر پھیلا' سرسراتا ہوا مجھے بیدار کرنے لگتا ہے پھر بھلا تم مجھ سے کس طرح دور ہو سکتی
ہو۔ دور رہ سکتی ہو۔ تمہاری یاد' تمہارا تصور میرے لہو میں' میری دھڑکنوں میں' میری سوچ میں حتیٰ
کہ میری سانسوں میں تحلیل ہو چکا ہے۔"

"اوہ خدایا۔" افراح پاگل ہونے لگی۔ جذبوں کی یہ انتہا' یہ انداز۔ کیا یہ ہارون بھائی ہی
ہیں۔ سنجیدہ و متین' کلف میں اکڑے' خشک و سرد مزاج کے حامل!!"

"نہیں......نہیں۔ یہ تو کوئی دیوانہ بول رہا ہے۔ کوئی سرپھرا' جانثار و جانباز' عشق کی منزل کا

ں وجنونی مسافر!!! یہ ہارون بھائی نہیں ہو سکتے۔"

"اُونہوں۔ میرے احساسات کو جذباتیت کا نام دے کر ان کی پاکیزگی اور استقلال مجروح
رو۔ چھ برس گزر چکے ہیں' اسی دشت کی سیاحی میں اور اگر تم ساتھ نہیں دو گی تو چھ مزید بھی گزر
یں گے مگر میرے دل کی رُتوں کو تمہارا پیار بہار وجود ہی سرسبز کرے گا۔ یہ طے ہے۔

ہم محبت میں بھی توحید کے قائل ہیں فراز
ایک ہی شخص کو محبوب بنائے رکھنا

ہارون سرمستی و جذب سے گنگنایا تھا۔

"اچھا بابا اچھا۔ ناراض نہ ہو۔ نہیں کرتے ہم اپنے پاگل جذبوں کا اظہار۔ ایک تو یہ بڑی
بیت ہے۔ جونہی میں اپنے دل کی کیفیات بیان کرنے لگتا ہوں' میڈم کے مزاج شاہانہ برہم ہو
تے ہیں۔" وہ بہت چاہ اور دل سے ہنسا تھا۔

"سنو۔ کیا تمہارے ہاں بھی بارش ہو رہی ہے؟ ادھر لاہور تو سارا ہی جل تھل ہوا پڑا ہے اور
تی ہو اس حسین و فتنہ گر موسم میں میرا کیا جی چاہتا ہے؟ جی چاہتا ہے' تم میرے روبرو ہو۔ میری
ٹھوں کے عین سامنے اور میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر تمہیں تکتا رہوں۔ نگاہ کے ذریعے دل
ں اُتارتا رہوں۔ تمہارا ایک ایک نفس اپنے ذہن کے حفاظ میں محفوظ کرتا جاؤں تاکہ جب تم مجھ
ے دور ہو تو تمہارے ساحر سراپے کی ایک ایک ادا' ایک ایک نقش میرے تصورات کی دنیا کو سجا کر
رے لمحوں کو رنگین بنا دے۔ میرے دل کی تنہائی مٹا دے۔ مشعل' تمہارا وجود اتنا مقناطیسی کیوں
ہے کہ میرا دل کھنچتا ہی چلا جاتا ہے۔ تمہاری سرد مہری اور بیگانگی کے باوجود پسپا نہیں ہوتا۔ کسی
ری راہ پہ چلنے کے لئے گامزن نہیں ہوتا۔ آخر ایسا کیا ہے' تم میں جو برسوں سے تمہارا اسیر بنا
ٹھا ہوں۔ تم مجھے اپنے طلسم سے' اپنی کشش کے سحر سے' آزاد کیوں نہیں کر دیتیں۔ مجھ میں اس
طرح کیوں سما گئی ہو کہ تمہیں دل سے نکالنے کا سوچوں تو رگیں کھنچنے لگتی ہیں۔ سانسیں ٹوٹنے لگتی
یں۔ ایسا کیوں ہے مشعل۔ کچھ تو کہو۔ کچھ بتاؤ؟"

وہ بے قراری و بے تابی سے کہتا ہوا بے خیالی سے مُڑا تھا' اب اس کا جذبوں کے رنگ
سے تمتماتا ہوا روشن چہرہ افراح کے سامنے تھا۔

کیا کچھ نہیں تھا اس چہرے پر۔
عشق کی انتہا' وفاؤں کے جھلملاتے چراغ' ثابت قدمی' پرستش' محبوبانہ ذمک۔

ہر رنگ، ہر جگنو، ہر جذبہ اُس کی آنکھوں، اُس کے چہرے، اس کی آواز سے آبشار کی مانند
موسلا دھار بہہ رہا تھا۔

یہی رنگ، یہی جذبے افراح نے اُس دن بھی دیکھے تھے، جب وہ مشعل کی کوٹھی پر افراح کو
لینے آیا تھا۔ وہ اس وقت بھی چونک سی گئی تھی۔

''میں اپنی زندگی کی سب سے قیمتی چیز تمہاری نذر کر دینا چاہتا تھا مگر ہمیشہ یہی سوچ کر دل
مسوس کر رہ جاتا ہوں کہ کوئی چیز بھی تو تمہارے شایان شان نہیں ہے۔'' افراح کو ہارون کا کہا ہوا
جملہ یاد آ گیا۔

''اتنی ٹھنڈ ہو رہی ہے اور تم نے کوئی جرسی سوئیٹر نہیں پہنا۔'' کیسا اپنائیت جگاتا فکر مندانہ
تشویش زدہ لہجہ تھا۔ افراح کو مشعل کی قسمت پر رشک آنے لگا۔

''اللہ نہ کرے۔'' مشعل کے مر جانے کی بات پر وہ کس درجہ دہل کر خفگی سے گویا ہوا تھا۔
افراح کو ہارون کے خیال رکھنے کی ایک ایک ادا یاد آنے لگی۔ کس طرح تاکید کر رہا تھا' کھا
کھانے کی' اندر جانے کی' اب سمجھی۔'' وہ ''م'' مینا گل نہیں مشعل تھی۔

'میں کس درجہ احمق خاتون ہوں۔ بھلا مینا گل جیسی بُری اور غلیظ فحش عورت ہارون بھائی کی
آئیڈیل کیسے ہو سکتی تھی۔'

'جتنے وہ خود شاندار ہیں' اتنی ہی ظاہر ہے' ان کی پسند بھی ہونا چاہیے تھی اور واقعی ایسا ہی ہوا
انہوں نے اپنے جیسی فطرت کی سمجھ دار' پُر وقار' بلند کردار اور مصفا و پاکیزہ لڑکی کو اپنے من مندر کی
دیوی بنا کر بلند ترین مقام پر فائز کیا۔'

'اور کچھ غلط بھی نہیں کیا۔'

'واقعی مشعل کی شخصیت ایسی ہے کہ اس تمکنت و متانت' سادگی و بے ساختگی اور معصومیت
شفافیت کی پیکر پر فدا ہو جانے کو جی چاہنے لگتا ہے۔'

'مجھے خوشی ہے کہ ہارون بھائی کی پسند بہت اعلیٰ ہے لیکن لیکن...... یہ دل کیوں ڈوبا جا رہا
ہے...... یہ میرے اندر اندھیرے کیوں پھیلتے جا رہے ہیں...... میری آنکھوں میں گرم پانیوں کا
سیلاب کیوں اُتر رہا ہے۔ اندر ہی اندر یہ کانچ سا کیوں ٹوٹ رہا ہے۔'

''آیئے افراح۔ کھڑی کیوں ہیں۔ مجھے آپ سے کچھ ضروری بات کرنا ہے۔'' فون رکھ کر
وہ فوراً ہی اُس کی طرف متوجہ ہوا تھا اور پل بھر میں خود کو سنبھال کر پھر اُسی ازلی مکلف و متین روپ

ں آ چکا تھا۔

فراح کسی نہ کسی طرح خود کو گھسیٹتی ہوئی اُس کے مقابل بیٹھ گئی۔

''میں نے دانستہ آپ سے اب تک کچھ نہیں پوچھا تاکہ آپ اچھی طرح ریلیکس ہو
میرا خیال ہے' اب آپ خود کو سنبھال چکی ہیں۔ تفصیل سے مجھے بتائیے' آپ نے میڈم
ٹھی میں کیا کچھ دیکھا۔ کس کس سے ملیں۔ عمارت کے اندر کتنے کمرے تھے۔ کیا سامان تھا'
تیب تھی۔

وہ پوری طرح سنجیدہ ہو چکا تھا۔ جب مشعل کی کوٹھی سے اُسے واپس لا رہا تھا تو اُس نے
یں اُسے سختی سے ہدایت کی تھی کہ باقی لوگوں کو اس حادثے کے متعلق کچھ نہیں بتانا۔ اُنہیں
بتایا گیا تھا کہ ایک جرائم پیشہ گروہ نے تاوان کی خاطر اُسے اغوا کیا تھا۔

افراح اپنے حواس اور حافظہ بیدار کر کے ایک ٹک ساری تفصیلات فراہم کرتی گئی۔ ہارون
ے ایک فائل پر نوٹ کر رہا تھا۔ اس فائل کے باہر ٹائٹل پر مینا گل کا نام درج تھا جسے بہت
یکرا افراح کو یہ غلط فہمی ہوئی تھی کہ وہ مینا گل کو پسند کرتا ہے۔

''او کے۔ تھینک یو۔ اب آپ جا کر آرام کریں اور ہاں' یہ باتیں صرف میرے اور آپ
یان ہی رہنی چاہئیں۔'' ہارون فائل بند کر کے اُٹھ کھڑا ہوا۔

''صد شکر کہ کچھ نہ کچھ میرے اور آپ کے درمیان آیا تو۔'' وہ حسرت و کرب سے ہونٹ
ل ہی دل میں سوچتی ہوئی باہر آ گئی۔ صحن میں رضوانہ بھابی اور صفیہ بیٹھی تھیں' ساتھ میں
ی تھیں۔

''ارے ہاں رضوانہ۔ جب تم لوگ اسلام آباد میں تھے تو امداد بھائی آئے تھے۔ تمہارے ابا
''مغریٰ کو اچانک یاد آیا تو بہو کو بتانے لگیں۔

''اچھا۔ کیسے ہیں' وہ اور سب گھر والے۔ ادھر بلوکسر میں تو سب ٹھیک تھے ناں۔ وہ رُکے
نہیں میرے آنے تک۔'' رضوانہ بھابی اشتیاق و مسرت سے چونک کر بولیں۔ افراح نے
ے دیکھا۔ صفیہ کی پیشانی پر لاتعداد لکیریں بچھ گئی تھیں۔ اس نے اکثر نوٹ کیا تھا' مینا گل کی
بلا اور رضوانہ بھابی کے والد صاحب کو دیکھ کر صفیہ تائی ہمیشہ برہم ہو جاتی تھیں۔ بھلا اس
پیچھے کیا راز ہے؟

''امی...... میری نیلی پتلون تو نہیں دیکھی آپ نے؟'' ہارون اِدھر آتے ہوئے صفیہ سے

مخاطب ہوا تھا۔

"ڈرائی کلین کے لئے دی ہے بیٹے۔" صفیہ نے بیٹے کی تسلی کرائی تھی۔

☆☆☆

مینا گل اب کے بار اسلام آباد لال کوٹھی میں میڈم بانو سے ملنے آئی تو حیرت انگیز طور پر ا
کے انداز میں واضح سرد مہری، تشکیک اور تلخی تھی۔ وہ سیدھے منہ بات نہیں کر رہی تھیں۔

میاں وجہ جانتی تھی اس لئے اُن کا تکلیف دہ روّیہ برداشت کر گئی۔ ظاہر ہے افراح جیسی
سنہری خوش رنگ چڑیا کا یوں "ڈھلے ڈھلائے" مصفا انداز میں مٹھی میں آئے بغیر جال سے نکل
جانا کوئی معمولی واقعہ تو نہیں تھا۔

میڈم بانو تو ہاتھ ملتی رہ گئی تھیں۔

اُنہیں اس حسن و رعنائی کے مجسمے کے روپ میں جانے کتنے اہم "پراجیکٹس" کی تکمیل
فتحمندانہ عکس نظر آئے تھے۔

مگر اب پرندے کے پھر سے اُڑ جانے کے بعد وہ منصوبے ادھورے رہ گئے تھے۔ زیا
افسوس شاید اس لئے بھی تھا کہ اب وہ مینا گل کے ڈھلتے شباب کے زور پر زیادہ عرصہ بے فکر
کر نہیں بیٹھ سکتی تھیں۔

ہیرے تو کہیں برسوں بعد جھب دکھلاتے ہیں۔ ایسے نایاب ہیرے جو مدتوں اپنے لازوا
حسن و شباب کے ٹکسال سے سونے کے سکوں سے بھی قیمتی معلومات ڈھالتے رہیں، بھلا کہاں ملتے
ہیں۔ ہاں سولہ برس قبل میڈم بانو کو مینا کے روپ میں ہاتھ لگا تھا، ایسا ہیرا جس کو تراش خراش
انہوں نے ایسا درخشاں و تاباں بنایا تھا کہ برس ہا برس تک اپنی آب و تاب سے آنکھوں والوں
پاگل کرتا رہا تھا۔ بلکہ کر رہا تھا مگر تا بکے۔

ایک روز تو اس ہیرے کو بڑھاپے کی آنچ سے کوئلہ ہونا تھا۔ لڑکیاں تو بہت تھیں بلکہ تھوک
کے حساب سے عیاشی کے ہر اڈے پر دستیاب تھیں مگر جو حیثیت و مقام اور اہمیت مینا گل کی تھی،
میڈم بانو کسی کو نہ دے سکی تھیں۔ کہ مینا وہ سکہ تھی جو ہر دشوار اور سرد ترین موسم میں بھی چل جاتا تھا۔

میڈم بانو کو ایسی ہی صورت و سیرت اور انداز و اطوار کی ایک اور ماتحت درکار تھی جو جوانی
کے صحن میں قدم رکھتی ہوئی چڑھتے سورج کی طرح ہر دیکھنے والی آنکھ کو چندھیا کر رکھ دے۔
افراح اُن کے معیار پر پوری اُترتی تھی اور اُن کی پلاننگ یہ تھی کہ اُسے خاص تربیت دے

دو برسوں میں گروہ کے لئے ایک اور مینا گل تیار کر دی جائے گی۔
وئی کوئی لڑکی ہی اُن کے اعلیٰ ترین معیار پر پورا اُترتی تھی۔
راح کے بعد مشعل کو دیکھ کر وہ ایسا پھڑکیں کہ اُس کے بدلے افراح کو غیر مشروط طور پر
بر آمادہ ہو گئی تھیں۔
مر مینا گل ٹھان چکی تھی کہ وہ کسی قیمت پر مشعل کو میڈم بانو کے ہتھے نہیں چڑھنے دے گی۔
ں نے بالا ہی بالا ایک پرائیوٹ سیکورٹی ایجنسی سے بات کر کے دو مسلح گارڈز مشعل کی
ا پر متعین کروا دیے تھے۔
الانکہ مشعل نے سخت ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔
آئی کہ کوئی نہیں ٹال سکتا میڈم۔ آپ مجھ پر یہ احسان نہ کریں۔ حفاظت تو بڑے معزز یا
لکھنے والے لوگوں کی کی جاتی ہے، ہم سے نام و نسب بندوں سے مخلوق خدا کو کیا لینا دینا۔"
ں نے سختی سے منع کیا تھا مینا گل نے آیا اماں کے ذریعے دباؤ ڈلوا کر اُسے راضی کر ہی لیا
کا ہر وقت اُدھر ہی دھیان لگا رہتا تھا۔
ہارون سے سامنا کرنے سے کتراتی تھی ورنہ اُسے اشارتاً کہہ کر مشعل کی سیکورٹی پر مامور
وہ تو جی جان سے راضی ہو جاتا۔
مر وہ خود ہی اُس سے نظریں ملانے کی جسارت نہیں کر پا رہی تھی۔
شعل اور ہارون کے مابین تعلق کے انکشاف نے کس کس طرح نہ اسے عرق انفعال میں

ورہ کر اپنی بوٹیاں نوچنے کو جی چاہتا تھا۔
کہیں ایسا بھی کوئی کرتا ہے......؟
ں درجہ......؟ اس انتہا تک......؟ کہ بیٹی کی عمر کے بندے سے بیاہ رچانے کا سپنا بُن لیا۔
رات کی تنہائی میں ندامت کے سمندر میں جی بھر کر ڈبکیاں لگاتی تھی۔ خود سے نگاہ ملاتے
یا آئی تھی۔
ہوس زن، ہوس زر اور ہوس نام۔ تینوں کیا کیا رنگ دکھاتے ہیں۔ کس کس طرح ذلیل و خوار
ہیں۔ اس کے بارے میں مینا گل سے بہتر کون جانتا تھا کہ اسی دشت کی سیاحی میں تو عمر کی
بہاریں گزری تھیں۔ اس طرح کہ مال کار کچھ ہاتھ نہ آیا۔

نہ تن کا آرام

نہ جی کا چین

اور نہ من کی شانتی۔

ہر سُو بے کلی تھی، بے چینی تھی، فکریں تھیں، پریشانیاں تھیں۔

ایک طرف مذہبی تنظیم کے سالار خان کی دھمکیوں نے خون خشک کر رکھا تھا۔ دوسری طرف میڈم بانو کے تُند و تیز تیور اور بگڑا ہوا جارحانہ موڈ۔

"جانتی ہو، اس لڑکی نے اس خفیہ کے بندے کو میرے تمہارے بارے میں کوئی پکا ثبوت دے دیا تو کیا ہوگا۔ تمہاری کوتاہی سے وہ فرار ہوئی، تمہاری ذاتی کوٹھی سے۔ مجھے معلوم ہوتا کہ تم اس درجہ لاپروا اور بودی ہو تو کبھی اُسے تمہاری تحویل میں نہ دیتی۔"

میڈم بانو کو شک تھا کہ وہ اپنی مقصد کے لئے افراح کو بطور خاص اپنی کوٹھی پر لے کر گئی تھی۔ وگرنہ لال کوٹھی سے اس کا فرار ہونا ناممکنات میں سے تھا۔

میڈم بانو نے براہِ راست اُس سے کچھ باز پرس نہ کی تھی مگر ان کی نظروں سے جھلکتی بے اعتمادی اور معنویت نے مینا گل کو محتاط ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔

مینا گل اس بلی چوہے کے کھیل سے تنگ آ گئی تھی۔

کبھی تو وحشت و بے بسی کے عالم میں یہ تک سوچ لیتی کہ ہارون کو میڈم بانو اور بگ باس کے کچے چٹھے اور ثبوت و شواہد کے متعلق دستاویزات پیش کر کے میڈم کا تختہ ہی اُلٹ دے۔

مگر پھر دوسرے ہی لمحے وہ ہوش میں آ کر خود کو سرزنش کرنے لگتی۔ وہ جو کچھ تھی، جس پوزیشن میں تھی، بہر حال میڈم بانو ہی کی وجہ سے تھی۔ وگرنہ اُسے کون پوچھتا تھا۔

مینا گل لال کوٹھی کے ایک بیڈ روم میں اس وقت میڈم بانو ہی کی منتظر تھی۔ اُسے آج لاہور واپس فلائی کرنا تھا۔ شام کی فلائٹ تھی۔ وہ فلائٹ سے تین گھنٹے قبل یہاں آئی تھی۔ میڈم دوسرے کمرے میں کسی گاہک سے ڈیل کر رہی تھیں۔

خدا خدا کر کے فارغ ہو کر اِدھر آئیں تو پیشانی پر شکنیں جال کی طرح بچھی ہوئی تھیں۔

مینا گل تعظیماً بیڈ سے اُٹھ کر کنارے پر بیٹھ گئی۔

"کیا بات ہے میڈم۔ تھکی تھکی لگ رہی ہیں؟"

"ہونا کیا ہے...... خاک......!" اُن کا سرخ و سفید چہرہ بیزاری کی کاٹ سے زرد ہو رہا تھا۔

"میرا دھیان تو اسی خفیہ والے بندے کی طرف لگا رہتا ہے۔ بگ باس کو بھی صورت حال سے آگاہ کر دیا ہے۔ اُس نے محتاط روی اپنانے کا حکم دیا ہے۔ اچھا یہ بتاؤ، موصوف آج کل کدھر ہوتے ہیں......!" اشارہ ہارون کی طرف تھا۔

"لاہور میں ہی ہے ان دنوں۔"

"ٹھیک ہے۔ تم ایسا کرو، لاہور پہنچ کر اُس سے دوستی کی پینگیں بڑھانا شروع کرو۔ اُسے کسی طرح اپنے قریب لاؤ، ٹٹولو، اُگلواؤ اور پھر ان رنگین لمحات کی تصویریں اور وڈیو بنا کر اس کے ذریعے بلیک میل کر کے منہ بند رکھنے کی ہدایت دو۔"

میڈم بانو عجلت میں اسے کام بتا کر اُٹھ کھڑی ہوئی تھیں مگر مینا گل نے فق بلکہ لق دق چہرے سے آگے بڑھ کر انہیں روک لیا۔

"ایک منٹ...... میڈم۔ میں یہ کام نہیں کر سکتی۔ آپ کسی دوسری لڑکی کو یہ ڈیوٹی سونپ دیں۔" اُس نے سر جھکا لیا۔

جواب میں وہ کتنی ہی دیر سانس روکے گہری نظروں سے اُس کی طرف دیکھتی رہیں، جیسے چھ... کا ارادہ ہو۔ مینا گھبرا گئی۔ اُسے اُن کی پُراسرار دہشت ناک خاموشی سے بہت خوف آتا

♥♥♥

"اوکے۔ تم جاسکتی ہو۔" اچانک ہی میڈم سرد لہجے میں کہہ کر خاموشی سے کمرے سے
نکل گئیں۔ مینا گل کے ہاتھوں پیروں سے جان نکلنے لگی۔ "میڈم ضرور ناراض ہوگئی ہیں۔" وہ اُن
ایک ایک ادا سے واقف تھی۔

بہرحال وہ لاہور واپس آگئی۔ اُس کی طبیعت مضمحل سی رہنے لگی تھی۔ چوبیس گھنٹے ایک
سے حواس پر طاری رہتی۔ "میڈم۔ آپ نے کہا تھا ناں کہ میں اپنی مدد کے لیے کوئی ملازمہ رکھ لوں
یہ لڑکی اسی مقصد سے آئی ہے۔ آسیہ نام ہے اس کا۔" عذرا کے ہمراہ بیس بائیس سالہ گھبرائی گھبر
ہاتھ مروڑتی کچھ نروس سی گہرے سانولے رنگ کی جوان لڑکی اندر داخل ہوئی تھی۔

مینا گل بغور نووارد لڑکی کو دیکھنے لگی۔

"کہاں سے آئی ہو تم؟"

"میں جی۔ وہ پنڈی میں کچی بستی میں رہتی ہوں۔" شتابی جواب آیا۔

"کس نے بھیجا ہے تمہیں؟" مینا گل کا لہجہ خشک تھا۔

"وہ......جی۔" لڑکی گھبرا کر عذرا کا منہ دیکھنے لگی۔ عذرا نے اُس کا کندھا تھپتھپا کر تسلی دی

"اتنی گھبرا کیوں رہی ہو۔ مالکن بہت اچھی ہیں۔ آرام سے جواب دو۔ ویسے میڈم مجھے
ایمان دار اور پھرتیلی معلوم ہوتی ہے۔ چالاک بھی نہیں ہے اگر آپ اوکے کردیں تو اسے رکھ لوں؟
عذرا کے سفارش پر مینا گل کے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔

"ٹھیک ہے۔ اگر تمہیں مناسب لگی ہے تو رکھ لو مگر دھیان سے۔" مینا گل کوئی خطرہ مول
کی تیار نہیں تھی۔ وہ اس لیے بھی متردد تھی کہ کہیں یہ سالار خان کی کوئی چال تو نہیں۔ ہوسکتا ہے ا
نے پہلے ملازمہ کے روپ میں اُس کے لیے یہ موت کا پروانہ بھیجا ہو مگر عذرا کی یقین دہانی پ
مطمئن ہوگئی۔

☆☆☆

رون کا جی تو نہیں چاہ رہا تھا اُس فتنہ باز عورت سے بات کرنے کو مگر مجبوری تھی۔ کیس کا
نے اور معاملے کو آگے بڑھانے کے لیے اُسے مینا گل سے رابطہ کرنا ہی تھا۔

الگ بات تھی کہ اب اخباری نمائندے کی بجائے اپنی اصل شناخت کے ساتھ اُس سے
ہا تھا۔

ں نے مینا گل کی لاہور والی مستقل رہائش گاہ کا نمبر ملایا تھا۔

فاق سے براہ راست مینا گل نے ہی اُٹھایا تھا۔

ہارون بات کر رہا ہوں۔"

ں نے تمہید میں وقت ضائع کرنے کی بجائے دوٹوک سپاٹ انداز میں مختصراً تعارف کروایا۔

اوہ......تم......" جواب میں وہ کچھ تامل اور ہچکچاہٹ کے عالم میں چونک کر بولی تھی۔

میں نے فقط یہ باور کرانا تھا کہ میڈم بانو اینڈ کمپنی کا عنقریب یوم حساب آرہا ہے۔ تمام
مکمل ہیں۔ ہمیں بہت سے شواہد مل چکے ہیں اور مزید ملنے کی توقع بھی ہے۔ جونہی ہم نے
ئع سے تفتیش مکمل کی اُس کے فوراً بعد ریڈ ہوجائے گا۔ نہ میڈم بانو بچیں گی نہ اُن کے بگ
یہاں کے مقامی گرگے۔ اس لیے ابھی بھی وقت ہے ہمارے ساتھ تعاون کرتے ہوئے
ی معلومات ہمارے حوالے کردیں۔ جو ثبوت ہیں ہم تک پہنچا دیں۔ اس طرح اس کیس
سلطانی گواہ بن جائیں گی اور عدالت آپ کا قانون سے تعاون دیکھتے ہوئے یقیناً آپ
رعایت کرے گی اور آپ کی سزا میں زیادہ سے زیادہ تخفیف کی جائے گی۔"

اب میں دوسری طرف ماؤتھ پیس پر سناٹا چھایا رہا۔

کاش! ایسے ثبوت میرے پاس ہوتے۔" توقف کے بعد وہ آہ بھر کر بولی۔ "کچھ عرصہ پہلے
نے حیات خواجہ کے ذریعے مجھ سے وہ تمام دستاویز منگوالی تھیں جو پہلے میری تحویل میں
ا۔"

کیوں؟" وہ چونک سا گیا۔

انہیں کسی حساب کتاب میں ان کی ضرورت تھی۔"

کس سلسلے میں؟"

یہ تو میں نہیں جانتی لیکن ایک بات وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ میڈم اپنی جانب بڑھتے ہوئے
اچاپ قبل از وقت سُن لیتی ہیں اسی لیے مسئلے کے خطرے کے نشان تک پہنچنے سے پہلے ہی

وہ اس کا تدارک کر لیتی ہیں۔ شاید یہ احتیاط بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہو۔ وہ راز داری کے معا
میں کسی پر سو فیصد اعتماد نہیں کرتی ہیں حتیٰ کہ میں جو اُن کی نائب تصور کی جاتی ہوں' مجھ پر بھی اُن
ذات کے بہت سے پہلو غیر واضح ہیں۔ وہ ترپ کا پتا اپنے پاس ہی رکھتی ہیں۔''

مینا گل کے لہجے سے تھکن' شکستگی اور بے دلی برس رہی تھی۔

''پھر بھی' آپ اُن کی دست راست ہیں۔ یقیناً ایسی تمام چھوٹی بڑی باتوں سے واقف ہو
گی جو میڈم بانو کی آرگنائزیشن اور عیاشی کے اڈے سنبھالنے والوں کو بھی نہیں معلوم۔ آپ مجھے
کے ملکی و غیر ملکی ساتھیوں کی مکمل تفصیل فراہم کر سکتی ہیں۔ کاغذی ثبوت ہم خود تلاش کر لیں گے آ
کی معلومات کی روشنی میں۔ ہمیں ہر صورت میڈم بانو اور اُن کے بگ باس کی اصلیت کا کھوج
ہے۔''

''بتانے کو تو میں تمہیں بہت کچھ بتا سکتی ہوں۔''

وہ اچانک ہی پُر جوش ہو گئی۔

ہارون کا دل بلیوں اُچھلنے لگا۔

کتنی ریاضت کے بعد یہ گھڑی آئی تھی کہ مینا گل ''کھلنے'' پر آمادہ ہو گئی تھی۔

کتنی تپسیا کے بعد سرا ہاتھ لگا تھا۔ وہ بڑی حد تک مطمئن تھا۔ مینا گل میڈم بانو کا اتنا اہم
تھی کہ اس سے حاصل کی گئی معلومات میڈم بانو کو تختہ دار پر پہنچا سکتی تھیں۔ وہ سولہ برس سے م
بانو کے ساتھ تھی۔ اُن کے ہر اہم ''پراجیکٹ'' میں شامل رہی تھی اور ہارون کو پختہ یقین تھا کہ اگر
گل نے دروغ گوئی سے کام نہ لیا تو اُسے ''میڈم بانو اینڈ کو'' کے متعلق ۹۵ فیصد معلومات حاصل
جائیں گی پھر اس گروہ کو پھانسی کے پھندے تک پہنچانا گویا چٹکی بجانے کا کام تھا۔

''میں تین دن کے لیے کراچی جا رہی ہوں۔ ساحل سمندر پر شوٹنگ ہے۔ اتوار کو دوپہر تک
لوٹ آؤں گی۔ آرام کے لیے شام گھر پر گزاروں گی۔ تم اگلے دن یعنی پیر کو صبح دس بجے میری کوٹھی
آ جانا پھر بات ہو گی اور ہاں' میرا ایک مسئلہ تو حل کر دو۔ مجھے کچھ عرصے سے محسوس ہو رہا ہے' جیسے
لوگ میرا تعاقب کر رہے ہیں۔ جہاں جاتی ہوں' میرے پیچھے پیچھے رہتے ہیں۔ ابھی تک نقصان
نہیں پہنچایا مگر میں بہت خوف زدہ ہوں۔ ایک مذہبی تنظیم کی طرف سے آئے دن فون پر دھمکیا
ملتی رہتی ہیں۔ اس سالار خان مردود نے میرا جینا حرام کر رکھا ہے۔ مجھے شک ہے' کہیں وہ اسی
بندے تو نہیں جو میرا پیچھا کر رہے ہیں۔ تم پلیز' اپنے ذرائع سے چیک کرو۔ اب تو مجھے مشعل

اتے ہوئے بھی خوف آتا ہے کہ کہیں وہ اُس کی کوٹھی تک پہنچ کر اُس کو نقصان نہ پہنچا دیں۔''

او کے' میں دیکھوں گا۔ ویسے میں نے سادہ لباس میں دو آدمیوں کی ڈیوٹی وہاں لگائی ہوئی
ی کی نظر میں آئے بغیر مشعل کی نگرانی کر رہے ہیں۔''

رون چاہتا تو اس سے مینا گل کی ذات سے پردہ اُٹھا کر اسے جتا سکتا تھا کہ بہر حال تم مجھ
ن پر مشعل ہی کے سبب سے راضی ہوئی ہو۔ تم اس کی خوشنودی چاہتی ہو۔ کسی طرح اس
یں تھوڑی سی جگہ بنانا چاہتی ہو۔ اسی خاطر اپنی ہم نوالہ و ہم پیالہ میڈم بانو سے ٹکر لی ہے۔

مگر اُس نے کچھ نہیں کہا۔ حالانکہ مینا گل بھی سمجھ چکی تھی کہ ہارون یقیناً اس کے اور مشعل کے
نوعیت سے آگاہ ہو چکا ہے مگر فی الوقت دونوں ہی اس موضوع پر بات کرنے سے احتراز
تھے۔ اپنی اپنی جگہ مناسب الفاظ نہ ملنے کے باعث چپ سادھ چکے تھے۔

ھر بات بھی کیا کرتے۔

شتہ ہی اس درجہ مسخ ہو چکا تھا۔

ینا گل ہارون کے لیے ایک متنازعہ' ناپسندیدہ اور قابل شرم رشتے میں سامنے آئی تھی۔

ہ ملک دشمن عناصر کی پشت پناہی کر رہی تھی۔

لموں میں اپنی بے باکی و بے حیائی کے سبب شریف طبقوں میں ناپسند کی جاتی تھی۔

ہ ایک ماڈرن طوائف تھی جس کے لیے نسوانی عزت و حمیت اور عصمت و عفت کے الفاظ
ے۔

ھر وہ ایک ناجائز بچی کی ماں تھی۔

کیا حیثیت دے گا معاشرہ ایسی ہونے والی ''ساس'' کو۔

خود مینا گل بھی کس منہ سے اُسے مشعل کے حوالے سے پاکیزہ رشتے سے مخاطب کرتی۔

لڑکا جسے وہ خود شادی کے لیے پسند کر چکی تھی۔

جس کے سامنے اُس کا نیچ اور فحش کردار روز روشن کی طرح عیاں تھا۔

جو اُسے جیل کی سلاخوں تک پہنچانے کا کام سرگرمی سے مکمل کر رہا تھا' سو دونوں ہی مہر بہ لب
یہ پردہ گرا ہی رہے تو بہتر ہے۔

''میں پیر کی صبح پہنچ جاؤں گا۔''

ہارون نے فون رکھتے ہوئے کہا۔ ابھی ریسیور کریڈل سے نہیں چھوا تھا' جب اُس نے ہلکی سی

کلک کی آواز سنی۔

وہ بے اختیار اپنے سر پر ہاتھ پھیر کر رہ گیا۔

''یہ خیال مجھے پہلے کیوں نہیں آیا۔'' وہ خود کو ملامت کرنے لگا۔ ''جو مینا گل کے پیچھے سائے کی طرح لگے ہوئے ہیں' وہ یقیناً اس کی کالز بھی ریکارڈ کر رہے ہوں گے۔'' آواز بالکل ایسی ہی تھی جیسے کسی نے فون کے تاروں کو ٹیپ ریکارڈ کے ساتھ جوڑ کر دو طرفہ بات چیت ریکارڈ کرنے کا آٹو میٹک سسٹم چالو کر رکھا ہو۔

وہ تیزی سے اپنا اگلا لائحہ عمل سوچنے لگا۔

وقت بہت کم تھا اور اُسے ہر حال میں مینا گل کی نگرانی کرنے والے بندوں تک پہنچنا تھا۔

☆☆☆

ہارون کچھ ضروری چیزوں کی خریداری کے لیے صفیہ کے ساتھ بازار آیا تھا بلکہ لایا گیا تھا۔

''امی' بس بھی کریں ناں۔ مجھے بہت ضروری کام سے جانا ہے۔'' وہ پچھلے آدھے گھنٹے سے واپسی کے لیے اصرار کر رہا تھا۔

''بس ایک دو چیزیں اور رہ گئی ہیں۔'' صفیہ عجلت بھرے گداز لہجے میں بولیں۔ ''آؤ ادھر جنرل اسٹور کی طرف چلو۔ بس آخری شاپ ہے یہ۔''

طوعاً و کرہاً وہ اُن کے ساتھ گھسٹتا ہوا اسٹور میں داخل ہو گیا۔ صفیہ اپنے مطلوبہ شیلف سے چیزیں دیکھنے لگیں۔ ہارون اکتائے ہوئے بے زار کن انداز میں اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ معاً اس کی اچٹتی ہوئی نظر بائیں جانب سرخ و سیاہ پرنٹ کے سادہ لیلن شلوار قمیض میں ملبوس سرخ اسکارف گردن میں لپیٹے ٹوتھ پیسٹ اور باتھ سوپ باسکٹ میں ڈالتی مینا گل پر پڑی۔

''مائی گاڈ! یہ یہاں کیسے آ گئی۔ ابھی صبح ہی تو میری بات ہوئی تھی اس سے۔ اسے تو شام کو کراچی فلائی کرنا تھا مگر خیر ہو سکتا ہے رات کی فلائٹ ہو۔ یا سیٹ نہ ملنے کے سبب کل تک پروگرام ملتوی کر دیا ہو۔'' چونکہ اُس تک رسائی حاصل کرنے کی فی الحال کوئی ضرورت یا خواہش نہیں تھی اس لیے وہ سر جھٹک کر صفیہ کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

''بس اب باتھ سوپ لینے ہیں۔ چلو اس شیلف کی طرف۔'' صفیہ مصروف سے انداز میں اپنی دُھن میں مگن باسکٹ کے اندر جھانک کر چیزیں ٹٹولتی ہوئی اسی سمت آ گئیں جہاں مینا گل مصروفِ عمل تھی۔

''امی پلیز۔ یقین کیجئے' میرے پاس بالکل بھی وقت نہیں ہے۔ مجھے لازمی پہنچنا ہے آفس۔'' بے بسی سے ماں سے بحث کرتے ہارون کی آواز جونہی مینا گل کے کان میں پڑی' اُس نے سر اُٹھا کر ماں بیٹے کی طرف دیکھا۔ ہارون کو سامنے پا کر اسے قدرے حیرت ہوئی مگر جوں ہی نگاہ اس کی ماں پر پڑی اُس کے ہاتھ سے صابن کی ٹکیہ پھسل کر نیچے جا پڑی۔ صفیہ نے بھی اُس کی سمت دیکھا تھا۔

نظر کیا ملی' جیسے دونوں کے دلوں میں بھونچال برپا ہو گیا۔ صفیہ اپنی جگہ پر ساکت و صامت رہ گئی تھیں۔

''امی' کہاں کھو گئیں۔ بھئی' لیجئے ناں' اپنی مطلوبہ اشیاء۔'' ہارون حیرت کا بُت بنی ماں اور کے تاثرات نوٹ کرتا ہوا سخت اُلجھن کا شکار ہو گیا تھا۔

''ہوں۔ چلو۔ میں نے لے لی ہیں۔'' صفیہ بغیر کچھ لیے ایک دم کاؤنٹر کی طرف مڑ گئیں۔ مینا پر توجہ نہ دیتے ہوئے اُن کے پیچھے لپکا تھا۔

''او خدایا! کیا دنیا واقعی اتنی سمٹ گئی ہے۔ اتنی چھوٹی ہو گئی ہے۔'' مینا گل کے اندر جھکڑ چل تھے۔

''گویا انکشاف کی یہ قیامت ٹوٹنا باقی تھی ابھی۔'' ہارون کو صفیہ کے بیٹے کے روپ میں دیکھ کر ت و شرم ساری کے گہرے پاتال میں اُتر گئی تھی ''اور میں' میں کیا کرنے چلی تھی۔'' سوچ سوچ ٹوٹ رہی تھی۔ اس کی رات کی فلائٹ تھی' سو وہ چھوٹی موٹی چیزوں کی شاپنگ کے لیے چلی تا۔

''امی۔ آپ جانتی ہیں مینا گل کو؟'' ہارون ماں کے لیے گاڑی کو دروازہ کھولتے ہوئے ن کے مضطربانہ و بے کل تاثرات کھوج رہا تھا۔

''ایسے لوگوں کو نہ جاننا ہی بہتر ہوتا ہے۔'' وہ بڑبڑاتے ہوئے گاڑی میں بیٹھ گئیں۔ ہارون کے ئیں الارم سا بجا تھا۔

''کیا آپ کی مینا گل سے کبھی شناسائی رہی ہے؟ میرا مطلب ہے' ماضی میں۔ آپ دونوں تاثرات بتا رہے تھے کہ آپ ایک دوسرے سے اچھی طرح واقفیت رکھتی ہیں۔ کیا میں غلط کہہ ہوں۔''

''مگر یہ واقفیت اتنی قابلِ فخر نہیں رہی کہ یاد کے ایوانوں میں سجائی جا سکے۔ چھوڑو' زندگی

ایک گزرگاہ ہے جہاں ہر طبیعت کے مسافر راہ میں ٹکراتے ہیں۔ اب ہر کسی کو گنتی میں شامل شروع کرے تو بندہ پاگل ہی ہو جائے۔"

"امی۔ مینا گل کی ایک بیٹی بھی ہے۔" ہارون جیسے کسی مقصد کی خاطر تمہید باندھ رہا تھا۔

"میں جانتی ہوں۔" خلاف توقع وہ پُرسکون رہیں تو ہارون بُری طرح اُچھل پڑا۔

"اگر آپ یہ جانتی ہیں تو پھر مینا گل کے متعلق بہت کچھ جانتی ہوں گی۔"

"پھر بتاؤں گی کبھی۔ اب چھوڑو اس موضوع کو اور گھر چلو۔" صفیہ کے لہجے میں قطعیت تھی۔

☆☆☆

اتوار کی دوپہر کو وہ لاہور پہنچی تو ذہنی و جسمانی تھکن نے اُس کے اعصاب سوختہ کر دیے تھے۔

"کایا ہی پلٹ گئی ہے۔ کل تک جس حرام زادی وجیہہ علی کی کوئی پوچھتا نہیں تھا، آج وہ سب کی آنکھ کا تارا بن گئی ہے۔ ارباب کو بھی اُلو کا گوشت کھلا کر اپنے دام میں پھنسا چکی ہے۔ یہ گل اب کسی کو نظر ہی نہیں آتی۔"

رہ رہ کر اُس کے خون میں اُبال آ رہا تھا۔

اُس کی مارکیٹ ویلیو دن بدن گرتی جا رہی تھی۔ اب تو یہ عالم تھا کہ کیریکٹر رول کے سوا کوئی مین رول میں اپنی فلم میں لیتا ہی نہیں تھا۔

اور کیریکٹر رول بھی ایسا جس میں پرفارمنس اور گلیمر کی دور دور تک گنجائش نہیں ہوتی تھی۔ وہی صدیوں کی روایتی ماں کا کردار جو اپنی سخت مزاجی اصول پسندی کے سبب ظالم سماج بن جاتی ہے۔

وہ تنگ آ گئی تھی، ایک جیسے رول کر کر کے۔

فلم انڈسٹری کے وہ کرتا دھرتا جو کل تک اُس کے قدموں میں اپنی ہتھیلی رکھنے کے لیے لپک لپک کر آتے تھے اب گھاس نہیں ڈالتے تھے۔ اُس کی بجائے وہ وجیہہ علی کی ناز برداری اور چاؤ چونچلوں میں لگے رہتے تھے۔

وجیہہ علی اور ارباب کی جوڑی کو گذشتہ ایک سال سے بے مثال پذیرائی ملی تھی۔

اب تو جس فلم میں یہ جوڑی کام نہیں کرتی تھی اُسے مقبولیت کی سند ہی نہیں ملتی تھی۔

دونوں کے ستارے چمک رہے تھے۔ گردش ایام نے اُن پر کامیابی، شہرت اور دولت ہاتھوں سے بھر بھر کر نچھاور کی تھی۔

مینا کا جی حسد، رشک، پچھتاوے اور تلملاہٹ سے مکدّر تھا۔

کل تک وہ صف اوّل کی ہیروئن تھی۔

ٹھاٹھ سے اپنی عمر سے کہیں کمسن رول ادا کرتی تھی اور وجیہہ علی جیسی نو وارد لڑکیاں اُس کی ںں کا رول ادا کرنے میں فخر محسوس کرتی تھیں۔ آج وہ شوخ و شنگ، حسین و دل ربا وجیہہ علی کی چھوٹا سا کیریکٹر رول ادا کر رہی تھی۔ وہ کراچی میں شوٹنگ کے دوران وجیہہ علی کے ناز و ادا، وت اور عشوے وغمزے بذاتِ خود ملاحظہ کر چکی تھی۔

"میرا وقت گزر چکا ہے اب۔ شباب کا سورج ڈھلتے ہی شہرت و مقبولیت فنکار سے یوں مانے لگتی ہے، جیسے دولت فقیر سے۔"

ایک سرد آہ بھر کر وہ بستر پر دراز ہو گئی۔

"چائے یا کھانا میڈم؟"

عذرا دروازہ ناک کر کے اندر آئی تھی۔

"کچھ بھی لے آؤ۔ اب کون سا اسمارٹ نیس کے پودے کو پانی دینا ہے جو احتیاط کروں۔"

وہ گزشتہ معمولات سوچ کر دل مسوس کر رہ گئی تھی۔

اداکارائیں کامیابی کے زمانے میں پانی بھی دیکھ دیکھ کر استعمال کرتی ہیں، مبادا جسم پر ل چربی چڑھ جائے۔

"ایسا کرو، ہلکا پھلکا سینڈوچ بنا دو۔ چائے ایک گھنٹے بعد بھجوا دینا۔ اس کے بعد میں آرام روں گی۔ جسم بُری طرح دکھ رہا ہے۔ دماغ پر بھی بوجھل پن طاری ہے۔" اُس نے چکراتے ئے سر کو تھاما۔

"ڈاکٹر کو بلا دوں میڈم۔" عذرا نے بغور اُس کی حالت کا جائزہ لیتے ہوئے ادب سے پوچھا۔

"نہیں۔ ڈاکٹر بھی کیا کرے گا۔ دل و روح کے زخموں کا اُس کے پاس کیا علاج۔"

وہ تساہل اور بیزاری سے گویا ہوئی۔ اُس کی آنکھوں میں رت جگے کی تھکن زدہ سرخی تھی۔

چہرہ مایوس و دل گرفتہ اور اُترا ہوا تھا۔

"آج میں ڈنر نہیں کروں گی۔ شام سات بجے بستر پر چلی جاؤں گی۔ وہ نئی لڑکی آئے تو
کہنا' ٹھیک آٹھ بجے دودھ کا گلاس گرم کر کے بیڈ روم میں لے آئے۔ دودھ کے ساتھ اپنی سکو
اور خواب آور دوا کھا کر سکون سے سو رہوں گی۔ آج تو جی چاہتا ہے' اتنی لمبی نیند لوں کہ پھر دوبا
آنکھ نہ کھلے۔"

مینا نے بھرپور انگڑائی لی تھی۔

عذرا سر ہلا کر باہر چلی گئی۔

اُسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔ مینا نے ریسیور اُٹھا لیا۔ دوسری طرف میڈم بانو تھیں۔

"تم نے تو اپنی دانست میں چھپانے کی پوری پلاننگ کر رکھی تھی مگر آخر کار میں نے یہ راز
ہی لیا۔ بڑے افسوس کی بات ہے مینا۔ میں نے تمہیں کام کے ہر ہر پہلو میں برابر شریک کیا
سے کچھ پوشیدہ نہیں رکھا اور تم نے اپنی زندگی کے اتنے بڑے سچ کو جھوٹ کی نقابوں میں چھپا دیا
بگ باس کو تمہاری اس حرکت کا پتا چلے گا تو وہ کس قدر خفا ہوں گے۔ یقیناً تم اندازہ کر سکتی ہو۔"

مینا گل کا تو یہ حال تھا کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ اُس کا پورا جسم پسینے سے شرابور ہو چکا تھا
یوں لگا' جیسے انکشاف کی اس منزل پر اُس کی سانسیں اس کا ساتھ چھوڑ جائیں گی۔

"کک کیا کہہ رہی ہیں میڈم۔" اُس نے ہکلا کر خشک لبوں پر زبان پھیری۔

"حالانکہ تم اچھی طرح سمجھ چکی ہو کہ میں کیا کہہ رہی ہوں۔" معاً میڈم بانو کا لہجہ سپا
ہو گیا۔

"جانتی ہو' مشعل کی ماں کی حیثیت سے پہچانے جانے کے بعد تم کس عذاب میں گرفتار
جاؤ گی؟ اخبار والوں کو ایک نیا چٹپٹا تا ہوا موضوع مل جائے گا۔ تمہاری کھوئی ہوئی شہرت تو بحال
ہو جائے گی مگر منفی طریقے سے۔ صحافیوں کی برادری تمہیں ذلیل و خوار کر کے رکھ دے گی۔ سار
ملک میں دھوم مچ جائے گی۔ سب جانتے ہیں کہ تم ابھی تک غیر شادی شدہ ہو۔ تم خفیہ شادی
ڈھونگ بھی نہیں رچا سکو گی کہ اب وفاداریاں بدل گئی ہیں۔ ایک گمنامی کے اندھیرے میں ڈو
ہوئی اداکارہ کا کون یقین کرے گا۔ اُس کے بجائے اُس کی ذات سے منسلک اسکینڈل چھاپ کر
اخبار والوں کی چاندی ہو جائے گی۔ بن بیاہی فلم اسٹار جواں سال بیٹی کی ماں بن گئی۔ یہ انکشاف
بہت بعد میں ہو گا کہ اس کا باپ کون ہے؟ اس طرح کی سرخیاں مع تمہاری اور مشعل کی مشترکہ

ر کے شائع کی جائیں گی۔ عوام دونوں میں ماں بیٹی کی مشابہت اور قد کاٹھ کا اندازہ لگا کر بلا
اس خبر کو سچ قرار دیں گے۔ وہ تمہاری بدبودار شخصیت سے نفرت کرنے لگیں گے۔ مذہبی
ں کھل کر تمہارے خلاف اُٹھ کھڑی ہوں گی اور انہیں عوامی تائید بھی حاصل ہو گی۔"

"میڈم۔ پلیز۔" وہ سرتاپا کانپ گئی تھی۔ اس کا رواں رواں خوف دہشت سے کھڑا ہو گیا۔

"میں ایسی زندگی پر موت کو ترجیح دوں گی۔" ہیجانی لب و لہجے میں اُس کے اعصاب پر
ے گولوں کا ردِ عمل ظاہر ہو رہا تھا۔

"تو پھر میری مانو' ایسا ہونے سے پہلے ہی حفاظتی تدابیر اختیار کر لو۔ مشعل کو میرے حوالے کر
یقین کرو' اُس کی قسمت بدل جائے گی۔ اُس کے سراپے کی تابانی میں جو معصومیت' دلکشی اور
لگداز ہے' وہ تو تمہارے اندر بھی نظر نہیں آتا۔ وہ تم سے کہیں آگے جا پہنچے گی۔ ایک عالم کو اپنے
و شباب کی بدولت زیر و زبر کر کے رکھ دے گی۔ میں چاہوں تو زور زبردستی بھی کر سکتی ہوں مگر
ت باہمی رضامندی میں ہے' وہ زبردستی اور جبر میں کہاں۔ تم اُس کی ماں ہو۔ سلیقے طریقے
سمجھا بجھا کر مجھ تک لا سکتی ہو۔"

"میری بات کہاں مانے گی۔ وہ مجھے ماں کا درجہ نہیں دیتی۔" وہ گلوگیر ہو گئی۔ اب حقیقت کو
م کئے بنا چارہ نہیں تھا۔ وہ جانتی تھی' میڈم بانو کی معلومات مکمل اور ناقابلِ تردید ہوا کرتی ہیں۔
لی اندازوں سے کام نہیں چلاتی تھیں۔

"بہرحال کسی بھی طرح اُسے مجھ تک پہنچانا تمہاری ڈیوٹی ہے۔ نوٹ کر لو۔"

"خدارا میڈم۔ اتنا بڑا امتحان نہ لیں مجھ سے۔" وہ بلبلا کر بولی۔

"شرم کرو۔" میڈم بانو بھڑک گئیں۔

"تمہیں اپنی اس حرکت پر شرم سے ڈوب جانا چاہیے۔ اتنی بڑی بات تم نے چھپائے رکھی۔
بھی نہ لگنے دی۔ ہم نے تمہیں کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ تمہاری تقدیر بدل دی اور تم نے یہ صلہ دیا
ہماری ہی پیٹھ میں خنجر گھونپ دیا۔ پہلے کسی طرح اس لڑکی افراح کو فرار کروا دیا' اچھے بھلے ہاتھ
ئے شکار کو جانے دیا اور اب اپنی بیٹی کو تنظیم کے کاموں کے لیے وقف کرنے سے تم کترا رہی ہو۔
ط تو یہ چاہیے تھا کہ اس عظیم دھوکا دہی پر تمہیں سخت سے سخت سزا کا مستحق ٹھہرایا جاتا مگر تمہاری
بقہ خدمات کا احساس کرتے ہوئے ہم نے تمہیں رعایت دی جس کا تم ناجائز فائدہ اُٹھا رہی

"میڈم' میں پور پور آپ کی احسان مند ہوں۔ آپ مجھ سے بھلے سے جیسا چاہیں کر یہاں
گھٹیا کام لے لیں مگر میری بیٹی کو اس دلدل میں نہ دھکیلیں۔" وہ گڑگڑائی۔

"اب وہ تمہاری نہیں' ہماری بھی بیٹی ہے' مینا ڈارلنگ۔" وہ عیاری سے مسکرائیں۔

مینا کا خون کھول اُٹھا۔ وہ بے بسی سے مُٹھیاں بھینچ کر رہ گئی۔

"میرے لیے مشعل کو راضی کرنا ناممکنات میں سے ہے۔"

"ناممکن کو ممکن بنانا ہمارے دائیں ہاتھ کا کھیل ہے' مائی ڈیئر۔ خیر' تم تھکی ہوئی ہو۔ اس وقت
آرام کرو۔ کل بات ہوگی۔ عذرا کو میری طرف سے پوچھ لینا' بڑی وفادار ملازمہ ہے تمہاری' مجھے
تابع دار لوگ بہت پسند ہیں۔ میں خود بھی اس سے خیر خیریت دریافت کروں گی۔ اوکے۔"

میڈم بانو نے مبہم سے انداز میں مسکراتے ہوئے فون بند کر دیا تھا۔

مینا گل کتنی ہی دیر تک ریسیور ہاتھ میں لیے بیٹھی رہی۔

عذرا کے لائے ہوئے سینڈوچز اور چائے کب کی ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ مینا ایک ہی زاویے
ساکت بیٹھی کیا کچھ سوچتی رہی حتیٰ کہ آٹھ بج گئے۔

آسیہ دودھ کا گرم گرم گلاس لے کر حسب معمول ڈرے سہمے بوکھلائے ہوئے انداز میں اندر
آئی تھی۔ گلاس اُس نے بیڈ کی سائڈ پر رکھ دیا۔

"سنو۔" وہ جانے لگی تو مینا نے تحکمانہ پکارا۔

"جی بی بی جی۔" وہ روبوٹ کی طرح واپس مڑ گئی۔

"یہ شوکیس کے اوپر رکھے گولیوں کے پیکٹ سے دو گولیاں نکال کر مجھے دو۔"

آسیہ نے مستطیل شکل کے گتے کے پیکٹ سے کیپسول کا پتا نکالا۔ اندر صرف دو کیپسولز
میں گولیاں بند تھیں' باقی پورا پتا خالی ہو چکا تھا۔

آسیہ نے گولیاں نکال کر مینا کی ہتھیلی پر رکھ دیں۔ مینا نے دودھ کے سپ لیتے ہوئے دونوں
گولیاں نگل لیں۔

"اب تم جاؤ اور سنو' کسی کا فون آئے یا کوئی ملاقاتی آئے تو ٹال دینا اور مجھے صبح سے پہلے
نہیں اُٹھانا۔ میں مکمل آرام کے موڈ میں ہوں۔ اب دوبارہ نہیں اُٹھوں گی۔"

وہ کمبل لپیٹ کر دراز ہو گئی۔

آسیہ سر ہلا کر کمرے سے نکل گئی تھی۔ مینا نے لیٹنے سے پہلے بتیاں بجھا دی تھیں۔

☆☆☆

گھڑی کی سوئیاں سوا نو بجا رہی تھیں۔

ہارون رسٹ واچ باندھ کر مینا گل کی طرف جانے کے لیے تیار ہو گیا۔

دس بجے تک اُسے اُس کی کوٹھی پر پہنچنا تھا۔

وہ اس میٹنگ کو غیر معمولی اہمیت دے رہا تھا۔

ابھی دس بجنے میں پندرہ منٹ باقی تھے کہ وہ اُس کی رہائش گاہ کے گیٹ پر آن پہنچا۔

"ایکسکیوزمی۔ میں نے مینا گل سے ٹائم لے کر رکھا ہے۔ انہیں مطلع کر دیجیے۔ ہارون احمد
را نام۔"

وزیٹر روم کی نشست پر براجمان ہوتے ہوئے اس نے چوکی دار سے اطلاع پا کر عذرا کو
تے دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ عذرا کے چہرے پر اُلجھن' تردد اور تفکر کے تاثرات نمودار
ے تھے۔ ہارون نے محسوس کیا' جیسے وہ اندر ہی اندر اس کی آمد سے پریشان ہو گئی ہے۔

"آسیہ' میڈم کو مہمان کے بارے میں اطلاع دو۔"

وزیٹنگ روم کے دروازے سے نظر آتے ڈائننگ ہال کی سائڈ پر شیشے کے کور ڈور والے
ترین ڈیپ فریزر پر کپڑا پھیرتی ہوئی آسیہ ہدایت پا کر فوراً ہی مینا گل کے بیڈروم کی طرف
ا تھی۔

"ویسے مشکل ہے کہ میڈم آپ کو وقت دیں۔ وہ کل بہت تھکی ہوئی آئی تھیں اور فی الحال
ت کے موڈ میں ہیں۔"

عذرا ایک خوب صورت سے کرسٹل کے اسٹائلش گلاس میں کوک سرو کرتی ہوئی برسبیل تذکرہ
سے مخاطب تھی۔

اس سے پہلے کہ ہارون کوئی جواب دیتا' آسیہ کی خوف و ہراس میں ڈوبی بلند چیخوں نے
ل کا سارا سکوت درہم برہم کر دیا' "اس کو کیا ہوا۔" ہارون فوراً چونک کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اسی لمحے
دہشت سے تھر تھر کانپتی پھولی سانسوں اور چڑھی آنکھوں سمیت اِدھر چلی آئی۔

"عذرا باجی۔ باجی۔ وہ۔ وہ میڈم......"

اُس کی سانسیں برابر نہیں ہو رہی تھیں۔ پورا جسم پسینے میں غرق ہو چکا تھا۔

"کیا ہوا میڈم کو؟" عذرا جھٹکے سے متوحش ہو کر اُس کی سمت پلٹی۔

"ہائے میں مر جاؤں۔ وہ جی' میڈم کو کچھ ہو گیا ہے۔" کمزور دل اور ڈرپوک فطرت کی حامل آسیہ بھل بھل رو دی۔ ہارون ایک سیکنڈ ضائع کیے بغیر مینا گل کے بیڈروم کی طرف دوڑا تھا پیچھے پیچھے عذرا اور آسیہ کے بوکھلائے ہوئے قدموں کی چاپیں اُس کے کانوں میں پہنچ رہی تھیں جونہی وہ دروازہ کھول کر اندر آیا' بیڈروم کا سین دیکھ کر اُس کے حواسوں پر بجلی سی گر پڑی۔

مینا گل ساکت وصامت آڑی ترچھی جہازی سائز منقش بیڈ پر پڑی ہوئی تھی۔ براؤن کمبل آدھا ٹانگوں پر تھا' باقی کارپٹڈ فرش پر بکھرا ہوا تھا۔

مینا گل ہلکے آسمانی رنگ کے ڈھیلے ڈھالے نائٹ گاؤن میں ملبوس تھی۔ بظاہر دیکھنے میں یوں لگ رہا تھا جیسے اسے دل کا دورہ پڑا ہو۔

ہارون نے احتیاط سے اُس کی نبض ٹٹولی۔

مگر وہاں کچھ نہیں تھا۔ وہ زندگی سے ناتا توڑ چکی تھی۔

لاکھوں پرستاروں کے دل میں بسنے والا وہ مدہوش کن حسن و شباب اب مٹی ہو چکا تھا۔

اس کا پاگل کر دینے والا نشیلا' دل ربا سراپا اب مزید کسی کی آغوش سجانے کے قابل نہیں تھا۔

"نبض اور دل کی دھڑکنیں ساکت ہو چکی ہیں۔"

وہ افسوس کے عالم میں مینا گل کے پاس سے اُٹھا اور شدت غم سے لرزتی کانپتی عذرا سے مخاطب ہوا۔ عذرا کی آنکھوں سے ایک سیل بلاخیز رواں ہو گیا۔

آسیہ تو غم سے زیادہ خوف و بے یقینی سے پتھرا گئی تھی مگر عذرا کے لیے حقیقت میں رنج و کرب کا مقام تھا۔

"ہمارا تو برسوں کا ساتھ تھا۔ میں سات سال سے ان کے پاس ملازم ہوں۔ میری تو سرپرست تھیں میڈم۔" عذرا پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"حوصلہ کرو۔ یہ وقت جذبات سے کام لینے کا نہیں ہے۔" ہارون نے مروّت میں اس کو تسلی دی۔

وہ بغور مینا گل کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ دہانے کے پاس جھاگ بہہ رہا تھا۔ ہاتھوں کے ناخن بھی نیلے ہو رہے تھے۔

ہارون یہ علامات دیکھ کر ایک دم اُچھل پڑا۔

"تمہارا کیا خیال ہے' میڈم کی موت کا کیا سبب ہو سکتا ہے۔"

وہ سوچتی ہوئی نظروں سے عذرا کے آزردہ چہرے کو دیکھ رہا تھا۔

"مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔" وہ بے بسی و عاجزی سے بولی۔ صدمہ اس قدر زیادہ تھا کہ اسے دینے کے لیے مناسب الفاظ نہیں مل رہے تھے۔

"بظاہر دیکھنے سے تو یوں لگتا ہے' جیسے دل کا دورہ پڑنے سے موت واقع ہوئی ہے یا پھر بے جکڑے جانے کے باعث بھی ایسا ہو سکتا ہے۔"

ہارون بغور مینا گل کے بیڈروم کا جائزہ لے رہا تھا۔

"لیکن ان کی جسمانی حالت اور چہرے اور ناخنوں کی رنگت میں تبدیلی سے یہ شبہ تقویت ہے کہ موت زہر خورانی سے ہوئی ہے۔"

"زہر......؟" عذرا نے چونک کر ہارون کا چہرہ دیکھا۔

"مگر میڈم کے پاس زہر کہاں سے آ گیا؟"

"برائے مہربانی تم مجھے کل میڈم کی آمد کے بعد کی روٹین تفصیل سے بتاؤ۔"

ہارون کے استفسار پر عذرا نے مینا گل سے ہونے والی تمام گفتگو اور اُس کی ذہنی کیفیت کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔

"میڈم ان دنوں دو باتوں کی وجہ سے بہت پریشان رہتی تھیں۔ چونکہ میں ان کی معتمد ہوں اس لیے دونوں معاملات انہوں نے مجھ سے شیئر کیے تھے۔ ایک معاملہ تو اُن کی فلم لائن میں گرتی ہوئی ساکھ اور مانگ کا تھا اور دوسرا وہ مذہبی تنظیم کے سرپھرے رکن سالار خان کی دھمکیوں سے بہت خوف زدہ رہتی تھیں۔ خصوصاً کل تو وہ شدید ڈپریشن کا شکار تھیں اور کہہ رہی تھیں کہ میں ذہنی و جسمانی تھکن سے بے حال ہوں۔ جی چاہتا ہے ایسی لمبی نیند لوں کہ آنکھ نہ کھلے۔ آسیہ سے بھی انہوں نے یہی کہا تھا کہ اب مجھے ڈسٹرب نہ کیا جائے' میں اُٹھوں گی۔ آہ۔ واقعی اب وہ دوبارہ نہیں اُٹھیں گی۔ اپنا کہا پورا کر دیا انہوں نے۔"

عذرا سسکیوں کا گلا گھونٹنے میں ناکام ہو گئی تو ایک بار پھر رو پڑی۔

"اس کا مطلب ہے خودکشی۔" ہارون بڑبڑایا اور پھر تائید کے لیے عذرا کی سمت دیکھا۔

"یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔" وہ آنسو پونچھ رہی تھی جو ضبط کے باوجود بار بار چھلک رہے

بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر دودھ کا خالی گلاس پڑا تھا۔ اس میں سے تھوڑا سا دودھ بچا ہوا تھا۔

''کیا وہ زہر دودھ میں ملایا گیا تھا؟'' ہارون کا ذہن معاملے کو مختلف پہلوؤں سے ٹھوک کر دیکھ رہا تھا۔

''میڈم کس قسم کی مسکن گولیاں استعمال کرتی تھیں۔'' جواب میں آسیہ نے شوکیس پر ر لمبوترا پیکٹ اُٹھا کر ہارون کو تھما دیا۔

وہ غور سے لیبل پڑھنے لگا۔ عام سی بے ضرر گولیاں تھیں جس میں بینزوڈائزاپین کا مرکب استعمال کیا گیا تھا۔ یہ گولیاں سکون آور ہونے کے ساتھ ساتھ نیند لانے میں بھی موثر کردار ادا کرتی تھیں۔ ''کہیں ایسا تو نہیں کہ موت ان گولیوں کے سبب واقع ہوئی ہو۔''

''تم نے انہیں کتنی گولیاں نکال کر دی تھیں؟'' ہارون نے آسیہ سے سوال کیا۔

''دو گولیاں دی تھیں۔ باقی پورا پتا خالی تھا۔'' آسیہ نے روئے سخن اپنی جانب ہوتے دیکھ گڑبڑا کر جواب دیا۔

''یہ طبعی موت یا خودکشی کے بجائے قتل کا کیس بھی ہو سکتا ہے۔'' ہارون نے ڈرامائی ان میں عذرا کو مخاطب کیا۔

''اوہ'' عذرا کے چہرے پر خوف پھیل گیا۔ ''اگر ایسا ہے تو پھر وہ سالار خان کے سوا اور نہیں ہو سکتا۔ اُف! میرا دھیان پہلے اس طرف کیوں نہ گیا۔ یقیناً یہ وہی تنظیم ہو گی۔ فائرنگ۔ بات نہ بنی تو اس مرتبہ اندھیرے میں وار کر دیا۔'' عذرا کا لہجہ جوشِ غضب سے بوجھل ہو گیا۔

''سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ موت غیر طبعی ہے اور اس کی ذمہ داری سالار خان کی تنظیم عائد ہوتی ہے تو اُس نے کس طرح پلاننگ کے ذریعے اپنا مقصد پورا کیا۔ ظاہر ہے' یہ قیاس تو از امکان ہے کہ اس نے بذاتِ خود کوٹھی میں گھس کر ایسا کیا ہے۔ یقیناً کسی واسطے کے ذریعے اس نے یہ کام کروایا ہو گا۔''

اور یہ کہتے ہوئے بلا ارادہ ہارون کی نظریں آسیہ کی سمت اُٹھی تھیں۔

اُس نے محسوس کیا کہ آسیہ کے چہرے سے گھبراہٹ مترشح تھی۔ وہ فوراً ہی نظر کترا کر ہو چبانے لگی تھی۔

''میں میڈم بانو کو فون کرنے کے بعد پولیس کو اطلاع دیتی ہوں۔ پوسٹ مارٹم کی رپور کے ذریعے خود ہی بات واضح ہو جائے گی۔' عذرا فون کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

معاً ہارون کو خیال آیا' اسے پولیس کے یہاں پہنچنے سے پہلے سردست رخصت ہو جانا

بغیر اجازت کے پولیس والے ہارون کے محکمے کے لوگوں کی اپنے معمولات میں مداخلت پسند کرتے تھے اور اس سلسلے میں بارہا آئی بی اور پولیس کے محکمے کے اعلیٰ افسران میں بحث ہو چکی تھی۔

بہر حال آئی بی کا محکمہ اپنے خصوصی اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے بوقت ضرورت ی کیس ڈیلنگ میں ٹپک سکتا تھا۔

''میں جانتا ہوں۔'' وہ باہر نکل کر جلد از جلد اپنے اسسٹنٹ ڈائریکٹر سے رابطہ کرنا چاہتا اُن سے خصوصی اجازت حاصل کر کے پولیس کی تفتیش میں حصہ لے سکے۔

پرمیشن حاصل کرنے کے بعد ہی وہ یہاں کے علاقے کے انسپکٹر عباسی کا جائے وقوعہ پر رسکتا تھا۔

وہ جانتا تھا' عباسی اسے دیکھ کر حسبِ معمول بری طرح تلملا جائے گا۔ وہ چشم تصور میں اس پھول' موٹی توند والا لحیم شحیم سراپا دیکھ کر ہلکے سے مسکرا دیا تھا۔ اسی شام کو اخبارات میں مینا موت کی دھماکے دار خبر موجود تھی۔

☆☆☆

یہ پیر کی شام کا وقت تھا۔

شعل اپنے گھر کے لان میں بیٹھی چائے کے ساتھ ساتھ شام کے اخبارات کھنگال رہی

ابھی وہ تھوڑی دیر پہلے ہی نہا کر نکلی تھی۔

''ارے باجی' ذرا یہ خبر دیکھیے گا۔'' اچانک ہی دلشاد نے گھبرائے ہوئے انداز میں اُس کے خبار کا فرنٹ پیج رکھ دیا تھا۔

''کیا ہو گیا بھئی؟'' مشعل نے کپ سنبھالتے ہوئے سرسری انداز میں نظر دوڑائی اور پھر نکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔

''فلم انڈسٹری کی ممتاز سینئر اداکارہ مینا گل آج صبح پُراسرار طور اپنے بستر پر مردہ پائی گئیں۔ ات' خودکشی یا قتل۔ معاملہ پولیس کے لیے معمہ بن گیا۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ آنے تک

"کچھ نہیں کہا جاسکتا۔" اور اخبار مشعل کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر پڑا۔

☆☆☆

ہارون اپنے طور پر اس کیس پر آزادانہ کام کرنے کی اجازت حاصل کر چکا تھا۔ اب
باریک بینی سے جائے وقوعہ کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔ اُسے یقین تھا کہ اُسے مینا گل کے بیڈ روم
اُس کے مطلب کی چیز ضرور مل جائے گی۔ مینا گل کی رہائش گاہ پر چاروں طرف پولیس کا کڑا پ
تھا۔ اُس کا بیڈ روم سیل کیا جا چکا تھا۔ اس لیے میڈم بانو کے لیے اندر گھس کر تنظیم سے متعلقہ موا
ضائع کرنے کا کوئی راستہ نہیں تھا' جبکہ ہارون بلا خوف وخطر کمرے کی تلاشی لے سکتا تھا۔

اخبارات نے اس واقعے کے متعلق سنسنی خیز سرخیاں لگائی تھیں۔ شام کے اخبارات د
دھڑ بک گئے تھے اور اگلی صبح مزید تفصیلات کے ہمراہ کئی اخباروں نے ضمیمے شائع کیے تھے۔
انڈسٹری کی نامور شخصیات نے مینا گل کی موت پر تعزیتی پیغامات جاری کیے تھے' ان میں وجیہہ ر
اور ارباب بھی شامل تھے۔

شوبز کے ہر ممتاز آرٹسٹ نے مینا گل کے فن کو بے مثال خراج تحسین پیش کرتے ہوئے اُ
کی موت پر گہرے رنج وغم کا اظہار کیا تھا۔ اس کے ساتھ اپنے گزشتہ تعلق کو بڑھا چڑھا کر پیش ک
تھا۔ وجیہہ علی نے تو یہاں تک کہہ دیا۔

"مرحومہ میرے لیے بڑی بہن کا درجہ رکھتی تھیں۔ مجھ سے خصوصی مشفقانہ برتاؤ کر
تھیں۔ میں نے اُن کی ذات سے بہت کچھ سیکھا ہے۔"

روشنیوں کی دنیا دوغلی شخصیات کی دنیا ہے۔ کردار کی ہر پرت انوکھی ہے' ہر رنگ دوسر
سے جدا ہے۔ لوگ ایک جسم پر ایک ہزار ایک چہرے چڑھائے پھرتے ہیں۔

یہ وہی مینا گل تھی جسے نگار خانے سے وابستہ لوگوں کے بدلتے رویّوں نے مایوسی کی اتھ
میں دھکیل دیا تھا اور آج بشمول شوبز سیاسی وسماجی سطح پر بھی معدودے چند شخصیات نے اظہ
افسوس کیا تھا۔

زندگی آگ کے شعلوں پہ بسر ہوتی ہے
بعد مرنے کے یہاں تاج محل بنتے ہیں

اور کوئی شاعر یہ حقیقت بھی روز روشن کی طرح عیاں کر گیا ہے کہ:

مر جائے تو بڑھ جاتی ہے انسان کی قیمت

زندہ ہو تو جینے کی سزا دیتی ہے دنیا

اخبارات میں اس موت کے پس پردہ حقائق کے متعلق مختلف تجزیے کیے گئے تھے۔ مینا گل
سال کیے گئے قاتلانہ حملے کی روشنی میں ملک کی ایک مذہبی تنظیم پر قتل کا شبہ کیا جا رہا تھا۔ اس
ہ میڈم بانو' عذرا' حیات خواجہ اور آسیہ کے بیانات بھی قلم بند کیے گئے تھے۔

میڈم بانو نے واشگاف انداز میں اسے قتل کا کیس قرار دیتے ہوئے سالار خان پر الزام
تھا۔ اُنہوں نے حکام بالا سے اپیل کی تھی کہ مینا گل کے قاتلوں کا جلد از جلد سراغ لگا کر
نجام تک پہنچایا جائے۔

ہارون اس وقت شیخ زید اسپتال کی سمت رواں دواں تھا۔ مینا گل کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے
ں رکھا گیا تھا۔ میڈم بانو اور عذرا بھی اسپتال میں موجود تھیں۔ ورثاء کی حیثیت سے
نو کو ہی مینا گل کی لاش سرد خانے سے وصول کرنا تھی۔ ہارون کو پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کا
سے انتظار تھا' اس کے بعد ہی کسی نتیجے پر پہنچا جاسکتا تھا۔

اسپتال سے واپسی پر اُس کا ارادہ مینا گل کے بیڈ روم کی تلاشی لینے کا تھا مگر اس سے پہلے اُسے
جگہ بھی جانا تھا۔

جب وہ عذرا اور آسیہ کے ساتھ مینا گل کے بیڈ روم میں پہنچا تھا تو اُس نے غیر محسوس انداز
ارد کا گہری نظروں سے جائزہ لیا تھا۔

اُسے کمرے کی مغربی دیوار کے بیچوں بیچ ایک آہنی سیف نظر آ گیا تھا۔ وہ عذرا اور آسیہ
ت کرتا ہوا بظاہر بڑے سرسری انداز میں اُنہیں غیر متوجہ پا کر سیف کی دیوار تک آیا تھا اور نظر
ں نے سیف پر کندہ سیف بنانے والی کمپنی کا نام و پتہ پڑھ لیا تھا۔ وہ عام سیف نہیں تھا' اس
بہت پیچیدہ اور جدید تھا جسے سیف کا مالک یا کمپنی کے کاریگر ہی کھول سکتے تھے۔ ہارون کو
ں چابی درکار تھی اور وہ جانتا تھا کہ سیف بنانے والی کمپنی کے کسی کاریگر کو موٹی رقم کے عوض
کا رجسٹرڈ نمبر بتا کر دوسری چابی بنا کر دینے پر آمادہ کیا جاسکتا تھا۔

وہ اسپتال کے احاطے میں داخل ہو چکا تھا۔

پوسٹ مارٹم مکمل ہو چکا تھا اور کچھ دیر بعد جسم پر ٹانکے لگا کر میت ورثاء کے حوالے کر دی جانی
ملحقہ کمرے میں میڈم بانو' عذرا اور انسپکٹر عباسی پولیس کے تین اہلکاروں سمیت منتظر بیٹھے

ہارون اِدھر ہی چلا آیا۔

میڈم بانو پوری شدّ ومد کے ساتھ انسپکٹر عباسی کی معذرت خواہانہ تجویز کو رد کر رہی تھیں۔ وہ اس وقت مکمل سیاہ لبادے میں ملبوس تھیں۔ آنکھوں میں شدید غم وغصے کی جھلک تھی۔ چہرے سے تُرشی اور جھنجلاہٹ عیاں تھی۔ تیور بتاتے تھے کہ کوئی لمحہ جاتا تھا' جب وہ بری طرح انسپکٹر عباسی کو جھاڑ کر رکھ دیں گی۔ ردِعمل کے طور پر انسپکٹر عباسی کا لہجہ مودبانہ اور گھگیایا ہوا تھا۔ غالباً وہ وفاقی دارالحکومت کی اس بارسوخ بلا کی طاقت اور اختیارات کی حدود سے واقف تھا۔ میڈم بانو نے اپنے "چیلوں" کے ذریعے بڑے بڑے حکومتی وزیروں اور مشیروں کو اپنی انگلیوں پر نچا رکھا تھا۔ تقریباً ہر محکمے میں کوئی نہ کوئی افسر میڈم بانو کے ڈالے گئے حسن وشباب کے چارے کے نتیجے میں اپنے فرض سے غداری کرتے ہوئے مطلوبہ معلومات فراہم کر رہا تھا۔ انسپکٹر عباسی جانتا تھا کہ میڈم بانو جیسی فتنہ پرداز عورتوں کے ہاتھ بہت لمبے ہوتے ہیں اسی لیے وہ خلاف طبیعت محتاط روی اور نرمی سے کام لینے پر مجبور تھا۔ آخر اسے اپنی نوکری بھی بچانی تھی۔ اسے یہ بھی اچھی طرح پتا تھا کہ میڈم بانو کی ایک شکایتی کال کے نتیجے میں آئی جی صاحب اُسے معطل یا ٹرانسفر کر سکتے تھے' سو وہ اپنی جان بچانے کے لئے ہر ممکن طریقے سے میڈم بانو کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتا تھا۔

میڈم بانو نے انسپکٹر عباسی جیسے معمولی حکومتی کارندے کو سرے سے درخورِ اعتنا نہیں جانا تھا۔ اُن کا لب ولہجہ تحقیر آمیز اور سرد تھا۔ البتہ ہارون کو دیکھ کر اضطراری طور پر اُن کی پیشانی پر تفکر کی لکیریں کھنچ گئی تھیں۔ اپنے ذرائع سے وہ پتا کروا چکی تھیں کہ افراح کا مذکورہ کزن جو خفیہ کا ملازم تھا' اُس کا نام و پتا' کوائف' ایڈریس اور فیملی وغیرہ کیا ہے۔ وہ اس کی فوٹوگراف بھی دیکھ چکی تھیں اس لیے اُس کو پہچاننے میں انہیں کوئی دقت نہیں ہوئی تھی۔ وہ اُس کی آمد سے کھٹک گئی تھیں مگر اپنے بشرے سے قطعی ظاہر نہیں ہونے دیا بلکہ بظاہر اُسے نظرانداز کر کے انسپکٹر عباسی سے گفتگو ہو گئیں۔

ہارون اُن کے انداز سے اُن کی دلی کیفیت تاڑ چکا تھا۔ وہ اس تجاہلِ عارفانہ پر دل ہی دل میں مسکرا دیا تھا۔

"اور کیا حال چال ہیں' عباسی بھائی!" وہ عباسی کے پاس ہی بنچ پر بیٹھ گیا اور اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے دانستہ بڑے خوش گوار انداز میں مخاطب ہوا۔

"ٹھیک ہوں۔" انسپکٹر عباسی نے کڑوے لہجے میں جواب دیا تھا۔ ہارون کو دیکھتے ہی اس نے

بُرا سا منہ بنا لیا تھا۔ وہ اس کی دخل در معقولات سے سخت نالاں رہتا تھا۔

"کیس میں کہاں تک پروگریس ہوئی؟" انسپکٹر عباسی کا پھولا پھولا منہ دیکھ کر ہارون کو خواہ مخواہ ہی گدگدی سی ہوئی۔ وہ شوخ مسکراہٹ لبوں میں دبا کر انسپکٹر عباسی کی سمت متوجہ تھا جو جزبز ہو کر ادھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔

"تم خود معلوم کر لو۔" وہ دھیمے مگر بے مروّت انداز میں کہہ کر پہلو بدل کر دوبارہ میڈم بانو سے مخاطب ہوا۔

"آپ ناراض نہ ہوں میڈم۔ دیکھیے' یہ معمولی کی کارروائی ہے اور پولیس کو حق حاصل ہے وہ کیس کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لے کر کسی پر بھی شک کرتے ہوئے اُس سے تفتیش کرے۔ عذرا اور آسیہ تو پھر ملازمائیں ہیں' روزمرہ کیسز میں تو یہاں تک ہوتا ہے کہ باپ قتل ہو جائے تو بس تفتیش کا آغاز اس کے سگے بیٹوں سے شک کی بنیاد پر کرتی ہے۔ اسی طرح ہمیں آگے بڑھنے میں مدد ملتی ہے۔ ہم اپنے طریقے سے دونوں ملازماؤں کا بیان ریکارڈ کرانا چاہتے ہیں۔ باقاعدہ قانون کے چند نہایت اہم سوالات کیے جائیں گے۔ بس اور کچھ نہیں کہا جائے گا۔ آپ تسلی رکھیں اور براہ کرم ہمیں عذرا اور آسیہ کو اپنے ہمراہ تھانے لے جانے کی اجازت دیں۔"

انسپکٹر عباسی کا لہجہ مصلحتاً شائستہ و مودب تھا۔

"کیوں! تھانے کیا اسی لیے بنائے گئے ہیں کہ شرفاء کی بیٹیوں کو تماشا بنا کے اندر سجا دیا جائے۔"

میڈم بانو کا پارہ چڑھنے لگا۔

"ہم پر آسمان ٹوٹا ہے اور آپ مجرموں کو پکڑنے کے بجائے لٹھ لے کر سوگواران کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ یہ کون سی تفتیش ہے۔ کون سا انداز ہے؟ اب یہ بھی کہہ گزریں کہ ملازماؤں کے ساتھ ساتھ مجھے بھی تھانے میں گھسیٹ کر بیان لیں گے۔" وہ برافروختہ تھیں۔

"میرا یہ مطلب نہیں تھا میڈم۔" انسپکٹر عباسی پریشان ہو گیا۔

"دیکھیے انسپکٹر صاحب۔ عذرا مینا گل کی سب سے معتمد اور پُرانی ملازمہ رہی ہے بلکہ وہ تو اسے ملازمہ سمجھتی ہی نہیں تھی۔ اُسے گھر کی مختارِ کل بنا کر رکھا ہوا تھا۔ فی الوقت یہ صدمے سے اس ابتر حال ہے کہ آپ کی تفتیش کے طریقہ کار پر قطعاً تعاون نہیں کر سکے گی۔ حیات خواجہ کو آپ

تھانے لے جا چکے ہیں اور اس سے ابھی تک آپ کے آدمی کام کی بات نہیں اُگلوا سکے۔ اب آپ ان لڑکیوں کو تھانے لے جا کر صحافیوں کے لیے چٹپٹی سچویشن پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ میں کیونکر اس کی اجازت دے سکتی ہوں۔“

اب کی بار وہ خاصے متحمل اور قدرے بہتر انداز میں بولی تھیں۔

انسپکٹر عباسی کو کچھ حوصلہ ہوا۔

”عذرا سے محض رسمی سی پوچھ گچھ کرنی ہے۔ اگر آپ کو اس کی بے گناہی کا اس درجہ یقین ہے تو ہم خواہ مخواہ وقت ضائع کیوں کریں۔“ وہ رسانیت سے بولا۔ میڈم بانو کو کچھ کچھ تعاون پر آمادہ دیکھ کر وہ خاصا پُرامید ہو گیا تھا۔

”لیکن وہ دوسری ملازمہ آسیہ کو ہمیں اپنی تحویل میں لے کر تفصیلی بات چیت کرنی ہے کیونکہ اُسی نے مرحومہ کو آخری مرتبہ زندہ دیکھا تھا اور اُسے دودھ اور گولیاں دی تھیں جیسا کہ عذرا کے ابتدائی بیان سے واضح ہو چکا ہے کہ آسیہ کو کچھ عرصہ پہلے ملازم رکھا گیا تھا اور شروع میں مینا گل اُس سے زیادہ مطمئن نہیں تھیں، تاہم عذرا کی سفارش پر اسے ملازمت سے نہیں نکالا تھا۔ یہ گمان غالب ہے کہ آسیہ کو کسی نے باقاعدہ پلاننگ کے تحت مینا گل کی کوٹھی میں کام کرنے کے لیے بھیجا ہو اور پھر اُس کے ہاتھوں مینا گل کو مروا دیا ہو۔“

”ایسا کون کر سکتا ہے؟“ میڈم بانو بے اختیار چونکیں اور پھر سوچ میں ڈوب گئیں۔

ہارون نے ابھی تک بحث میں حصہ نہیں لیا تھا، وہ بغور دو طرفہ بیانات سن رہا تھا......اور کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ انسپکٹر عباسی کے بیان کردہ مفروضے پر فی الحال نہ اُسے اتفاق تھا اور نہ اختلاف لیکن اتنا ضرور تھا کہ وہ اُس کی تفتیش کے طریقہ کار سے قطعی مطمئن نہیں تھا۔ کوئی چیز بار بار ہارون کو چونکا رہی تھی۔ اس کے ذہن پر دستک دے رہی تھی مگر ابھی وہ کسی حتمی نتیجے پر پہنچنے سے قاصر تھا اسی لیے چپ چاپ اُن کی گفتگو سن رہا تھا۔

”ظاہر ہے، سالار خان کے علاوہ اور کون ایسی حرکت کر سکتا ہے۔“ انسپکٹر عباسی نے جوش سے کہا۔

”اوہ ہاں۔ واقعی ایسا ہو سکتا ہے۔“ میڈم بانو کنپٹی کو اُنگلی سے بجا کر کھوئے کھوئے انداز میں بولیں۔

”اُس نے موقع پا کر آسیہ کو اپنے ساتھ ملا کر مینا گل کو ختم کرنے کا منصوبہ بنایا ہو گا اور وہ اس

کامیاب بھی ہو گیا۔ ٹھیک ہے، انسپکٹر! آپ چاہیں تو آسیہ کو اپنے ہمراہ تھانے لے جا سکتے ہیں دھیان رہے۔ لڑکی ذات ہے، زیادہ سختی نہ کیجیے گا۔ اصل مجرم تک پہنچنے میں عجلت کیجیے۔ سالار ن کے حصے کی سزا آسیہ کو نہیں ملنی چاہیے۔“ ہارون میڈم بانو کے اچانک اس پہلو پر سوچنے پر ان تھا۔ وہ خود بھی غور کر رہا تھا مگر کچھ مختلف انداز میں۔

اسی دوران کیمیکل ایگزامنر کی رپورٹ اُن تک پہنچ گئی۔ رپورٹ کے مطابق مینا گل کو ایک ے زہر سے ہلاک کیا گیا تھا جو عام طور پر مسکن اور خواب آور ادویات میں بہت قلیل مقدار میں جود ہوتا ہے۔ ایک دو گولیوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا مگر جب خواب آور گولیوں کی پوری شیشی مالی جائے تو اُن میں موجود زہر کے اجزا کی زیادتی سے موت اعصاب کے جکڑے جانے سے قع ہوتی ہے۔ اگر گولیوں کی بجائے براہ راست اس زہر کے اجزاء زیادہ مقدار میں کسی مشروب یرہ کے ذریعے انسان کے معدے میں پہنچ جائیں تو موت یقینی ہے۔ یہ زہر بے بو اور بے ذائقہ تا ہے اور اس کے اثرات تمام جسم کے ساتھ ساتھ ناخنوں پر بھی نمودار ہو جاتے ہیں۔ مرنے کے مد دیکھنے والے کو یہی لگتا ہے، جیسے دل کا دورہ پڑ گیا ہو۔

اس رپورٹ کے مطابق مینا گل کی موت اُس کی مسکن اور خواب آور گولیوں میں شامل زہر کی زیادہ مقدار سے واقع ہوئی تھی۔ گلاس میں بچے ہوئے دودھ کو بھی جانچ پڑتال کے لیے لبارٹری بھجوایا گیا تھا مگر حیرت انگیز طور پر دودھ کسی بھی قسم کی ملاوٹ سے پاک تھا۔

گویا دودھ میں زہر نہیں ملایا گیا تھا۔

معاملہ بہت اُلجھتا جا رہا تھا۔

ہارون میڈم بانو کو انسپکٹر عباسی سے اُلجھتا چھوڑ کر سیدھا مینا گل کی رہائشی کوٹھی پر آ گیا۔ کوٹھی پلیس کا پہرہ تھا مگر اسپیشل کارڈ دکھانے کے بعد اُسے مینا گل کے بیڈروم تک پہنچنے میں کوئی اری نہیں آئی۔

وہ چپہ چپہ اپنے خاص انداز میں چیک کر رہا تھا۔ سیف میں چابی لگاتے ہی وہ کھل گیا مگر بیش قیمت زیورات اور چیک بک کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔ اُسے خاصی مایوسی ہوئی۔ وہ بغور ل چیک کرنے لگا۔ معاً اُس کی نظر بیڈ کے نیچے گری ہوئی سفید رنگ کی گولی پر پڑی۔

”ارے، یہ تو اسی مسکن دوا کی گولیوں کی ساخت اور سائز کے مطابق تھی۔“ ہارون نے گولی ٹیاط سے ہتھیلی پر رکھی اور پھر سائیڈ ٹیبل پر رکھے میڈیسن کے خاص پیکٹ اور گولیوں کے پتے کو

اُٹھا کر غور سے دیکھا۔

اس کی تصدیق ہوگئی۔ گولی واقعی اسی پیکٹ کے پتے سے گری تھی۔

"آسیہ کے مصدقہ بیان کے مطابق جب اُس نے مینا گل کو گولیاں نکال کر دینے کے لیے پتا باہر نکالا تو اس میں صرف دو گولیاں تھیں پھر یہ تیسری کہاں سے آئی۔" وہ سوچتا رہا۔

پھر ایک دم جیسے اُس کے ذہن میں اسپارک ہوا۔

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ کسی نے دانستہ پتے سے گولی نکال کر پھینک دی ہو اور اس کی جگہ زہریلے اجزاء کو ملا کر تیار کی گئی بظاہر اسی ساخت کی گولی اُس کی جگہ رکھ دی ہو۔ کچھ اس طرح کہ گولی پتے کے مخصوص خانے میں فٹ کر کے احتیاط سے اوپر سے وہی ریپنگ پیپر چپکا دیا ہوتا کہ اگر مینا گل خود گولیاں نکال کر کھانے لگے تو اسے شک نہ ہو اور کام بھی بن جائے مگر اتنی ذہانت و فطانت اور ہوشیاری سے کون کام لے سکتا ہے۔"

وہ احتیاط سے گولی ٹشو میں لپیٹ کر جیب میں رکھتے ہوئے کوٹھی سے باہر نکل آیا۔ اب اُس کا رخ تھانے کی طرف تھا جہاں آسیہ کو تفتیش کے لیے لے جایا جا چکا تھا۔

آسیہ تک پہنچنے کے لیے اُسے کافی دیر تک انسپکٹر عباسی سے تُو تُو مَیں مَیں کرنا پڑی۔ لیکن اسے مجبوراً ہارون کو اجازت دینا پڑی۔

"آسیہ۔ اِدھر دیکھو۔ یہ گولی تم نے پیکٹ سے نکال کر پھینکی تھی۔" گھٹنوں پر بازو لپیٹے منہ اندر کیے پریشان حال آسیہ ہارون کی نرم و رواں آواز سن کر جھٹکے سے سیدھی ہوئی تھی۔

"یہ۔ یہ۔" وہ ہق دق رہ گئی۔ "نہیں جی۔ یقین کریں جی۔ میں نے مالکن کو زہر نہیں دیا۔"

وہ اچانک حواس کھو کر دھواں دھار رو پڑی۔ لگتا تھا' اُسے سخت تفتیشی مرحلے سے گزارا گیا تھا۔

ہارون بغور اُس کے گہرے سانولے گھبرائے بوکھلائے بسورتے ہوئے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بھولپن اور سادگی تھی۔ چہرے سے وہ محنتی اور سیدھی سادی گنوار عورت دکھائی دے رہی تھی۔

"یہ بتاؤ' جب تم نے میڈم کے حکم پر پیکٹ سے گولیوں والا پتا باہر نکالا تو اس میں موجود دونوں گولیاں کاغذ سے کور تھیں؟"

"ہاں جی۔"

"کیا تمہیں کسی سے کوئی خاص ہدایت ملی تھی؟" ہارون ایک ٹک اُس کی شکل دیکھ رہا تھا۔

"نہیں جی۔ آپ یقین کریں' صاحب جی۔" اُس کی سرمہ سا آنکھیں ایک بار پھر چھلک پڑیں۔ اُس کی آواز مسلسل رونے سے بھاری اور گھٹی گھٹی سی لگ رہی تھی۔

"تمہیں میڈم کی کوٹھی میں کام کرتے ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہے۔" ہارون کا لب و لہجہ ہمدردانہ اور مشفقانہ تھا۔ آسیہ کو کچھ حوصلہ ہوا۔

"وہ جی تین مہینے ہو گئے ہیں۔"

"یہاں کس نے بھیجا تھا تمہیں؟ کیا اس سے پہلے کہیں کام کیا ہے؟"

"وہ جی' میری اماں ایک بیگم صاحبہ کے ہاں کام کرتی ہیں۔ وہی مجھے کام دلانے کے لیے اُن کی کوٹھی لے کے گئی تھیں۔ اُن کی بہت ساری کوٹھیاں ہیں جی اسلام آباد میں۔ اُنہوں نے مجھ سے اِدھر اُدھر کے سوال کیے پھر اُنہوں نے کہا کہ میں تمہیں لاہور کی ایک کوٹھی میں کام دلوا سکتی ہوں۔ وہاں ملازموں کی تنخواہ بھی سترہ گریڈ کے افسر جتنی ہوتی ہے۔ میں بہت خوش ہوئی۔ اُنہوں نے مجھے ایڈریس سمجھایا اور کہا کہ میں عذرا سے تمہارے متعلق بات کر لوں گی۔ تم بے فکر ہو کر جاؤ پھر جی اُنہوں نے مجھے کرایے کے لیے رقم بھی دی۔ میں مالکن (مینا گل) کے ہاں آئی تو عذرا باجی نے مجھے مالکن سے ملوایا اور میری سفارش کی۔ اس طرح مجھے کام مل گیا لیکن جی' میں نے کبھی کوئی بے ایمانی نہیں کی۔" وہ ہاتھ جوڑنے لگی۔ ہارون کے ذہن میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔

"کیا تمہیں اُس بیگم صاحبہ کا نام معلوم ہے؟" اُس کے لہجے میں ہیجان تھا۔

"ہاں جی۔ وہی جو مالکن کی لاش اسپتال لے کے گئی ہیں' میڈم بانو۔"

"اوہ۔" ہر بات روزِ روشن کی طرح اُس پر عیاں ہوتی جا رہی تھی۔

بھلا میڈم بانو مینا گل کا اتنا بڑا جرم کیسے معاف کر سکتی تھیں۔ اُنہوں نے طریقے سے آسیہ کو مہرے کی طرح استعمال کیا تھا اور عذرا کو صاف بچا لیا تھا۔ گولیوں کے پتے سے اصلی گولی نکال کر زہریلی گولی رکھنے کا کام عذرا کے علاوہ اور کسی کا نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ اُسی کو اتنا اختیار تھا کہ مینا گل کی غیر موجودگی میں بھی اُس کے بیڈروم میں آ سکتی تھی۔ اُس کی خفیہ چیزوں کو بھی وہی سنبھال کر رکھتی تھی کہ مینا گل کو اُس پر اندھا اعتماد تھا۔

عذرا نے یہ سب کچھ میڈم کی ہدایت پر کیا تھا اور زہریلی گولی تیار کروانے کا کام غالباً کیا یقیناً حیات خواجہ کے سپرد کیا گیا تھا۔ دونوں درحقیقت میڈم بانو کے پالتو غلام تھے۔

سالار خان کی دھمکیاں اور قاتلانہ حملے کی خبر مہ اہتمام اخبارات میں شائع ہوئی تھی۔ سب باخبر تھے اور مینا گل کی موت کی ذمے داری سالار خان اینڈ کو کے کھاتے ہیں ڈال کر میڈم بانو بہ آسانی بچ سکتی تھیں' اسی لیے اُنہوں نے خوب صورتی سے جال بچھایا تھا۔

''میڈم مسئلے کے خطرے کے نشان تک پہنچنے سے پہلے ہی اس کا تدارک کر لیتی ہیں۔ وہ کبھی پر سوفی صد اعتماد نہیں کرتیں اور ٹرمپ کا پتا اپنے پاس رکھتی ہیں۔'' ہارون کے ذہن میں مینا گل کے جملے شور مچانے لگے۔

گویا میڈم بانو مینا گل کی ذہنی کیفیت تاڑ گئی تھیں' اور وہ سمجھ چکی تھیں کہ اس اسٹیج پر وہ اُنہیں دھوکا دے کر اُن کے خفیہ راز کسی کو بتا سکتی ہے' اس لیے انہوں نے اُس کو ختم کروا دیا۔ اس کا مطلب ہے' مینا گل کا تعاقب کرنے والے بلکہ اُس کی فون کال ٹریپ کرنے والے بھی میڈم بانو کے گُرگے تھے۔ انہوں نے مینا گل کی ہارون سے آخری گفتگو حرف بحرف سنی تھی اس لیے اُسے ہارون تک پہنچنے سے پہلے ہی ٹھنڈا کر دیا۔

''اچھا سنو' آسیہ' کیا تم عدالت میں یہ بیان دے سکتی ہو کہ میڈم بانو نے تمہیں مینا گل کی کوٹھی پر کام کے لیے بھجوایا تھا۔''

''کیا اس طرح کہنے سے میں چھٹ جاؤں گی۔'' اُس کی آنکھیں چمکیں۔

''بالکل۔''

''تو جی پھر ٹھیک ہے۔'' وہ راضی ہو گئی۔ ہارون کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔

وہ پورے ثبوت کے ساتھ میڈم بانو پر ہاتھ ڈالنا چاہتا تھا۔ اُس نے سوچ لیا کہ اب اگلا قدم میڈم بانو کی لال کوٹھی میں خفیہ طور پر داخل ہو کر تلاشی لینا ہے۔ افراح نے کوٹھی کے اندرونی حصے کی اس قدر وضاحت سے ترتیب و تفصیل بتائی تھی کہ ہارون کا آدھا کام آسان ہو گیا تھا۔

☆☆☆

شام کے چار بجے مینا گل کی نعش کوٹھی میں پہنچی تھی۔ جہاں مداحوں' اہم فلمی وسیاسی اور سماجی شخصیات کا جم غفیر جمع ہو چکا تھا۔ بے شمار لوگ ماضی کی کامیاب ترین اداکارہ کے جنازے پر آئے ہوئے تھے۔

میت کوٹھی کے سرسبز لان میں رکھی گئی تھی۔ میڈم بانو اہم شخصیات کے ہمراہ کوٹھی کے پُرتعیش ڈرائنگ روم میں بیٹھی تعزیتی پیغامات وصول کر رہی تھیں۔ پریس فوٹو گرافر دھڑا دھڑ اہم چہروں

کے فوٹو کھینچ رہے تھے۔ ہارون بھی وہیں تھا' اس کے ہمراہ براؤن شال لپیٹے مغموم و متاسف چہرہ لیے صفیہ کھڑی تھیں بلکہ در حقیقت ہارون اُنہی کی درخواست پر اُنہیں مینا گل کی کوٹھی پر لایا تھا۔

''امی۔ آپ مینا گل کو کیسے جانتی ہو۔ کہاں ملی تھیں؟'' وہ ماں کے حکم کی پاسداری کرتے ہوئے اُنہیں لے تو آیا تھا تاہم اُس کی اُلجھن اور تحیر اپنی جگہ موجود اور محسوس کیا جا سکتا تھا۔

چند خاموش آنسو یونہی لڑھک کر صفیہ کے رخساروں کو بھگوتے چلے گئے تھے۔

''بس ملے تھے' کبھی چوبیس پچیس برس قبل۔ میرے ساتھ کے گاؤں میں رہتی تھی۔'' ایک آہ بے اختیارانہ صفیہ کے منہ سے نکل گئی تھی۔

''اس کا مطلب ہے' آپ اُس کے بیک گراؤنڈ سے واقف ہیں۔'' اچانک ہی ہارون کی دھڑکنیں تیز ہو گئی تھیں۔ یہ بات کافی حد تک اُس کے حق میں جاتی تھی۔ اگر مینا گل کا حال و ماضی جاننے کے باوجود وہ اُس کے جنازے پر آ سکتی ہیں تو اُس کی بیٹی کو بہو بنانے پر بھی راضی ہو جائیں گی۔

اس وقت تو موقع نہیں تھا۔ اس کا ارادہ تھا' بعد میں آرام سے ماں سے تفصیل پوچھے گا۔ شاید اس طرح سے مشعل کے ماں باپ کی ازدواجی زندگی اور اُن کے حالات کے متعلق مکمل معلومات حاصل ہو سکیں۔

''امی' میں زیادہ دیر تک نہیں رُک سکتا۔ ایک ضروری کام سے نکلنا ہے۔ آپ چہرہ دیکھ لیں' میں ابھی پانچ منٹ میں اندر کا چکر لگا کر آ رہا ہوں۔''

اچانک ہی کچھ یاد آ جانے پر وہ ایک اخباری نمائندے کے پیچھے اندر کی طرف لپکا تھا۔

صفیہ دھیرے دھیرے چلتی ہوئی کلمے سے کڑھی ہوئی سیاہ چادر میں لپٹی میت کے پاس آ گئیں۔ جہاں عذرا رو رو کر سودائی ہوتی ہوئی اور گرد بیٹھے اور کھڑے بے شمار لوگوں کو مالکن سے نمک خواری کا ثبوت دے رہی تھی۔

مینا گل کے سارے بدن پر چادر تھی' صرف چہرہ کھلا تھا جس کے دیدار کے لئے اس کے مداحین لُٹے چلے آ رہے تھے۔

صفیہ سرہانے کھڑی ہو کر بغور دیکھنے لگی۔

ایک دم سفید نیلاہٹ زدہ بے کیف مردہ چہرہ۔

اُن کے تصور کی اسکرین میں مینا گل نہ جانے کس کس روپ میں جلوہ گر ہونے لگی۔

لال گلاب چمکتا ہوا سحر طراز مکھڑا جس کی تمازت نے بھائی علی مراد جیسے زاہد خشک کو جنون کے عالم میں جنگل جنگل بھٹکایا تھا۔

وہ سنہری فتنہ گر آنکھیں جو اُٹھتی تھیں تو کمزور دل والوں کی جان پر بن آتی تھی' آج کتنی لاچاری کے عالم میں بند پڑی تھیں۔

وہ سراپا جس کے نقوش و تناسب کے لیے شاعری کے دیوان کم پڑ جاتے' اب مٹی کا نصیب ہو چکا تھا۔

جو کبھی لوگوں کے دلوں پہ قدم رکھ کے چلتی تھی' آج سفر آخرت کے لیے چار بندوں کے کندھوں کی محتاج و بے بس پڑی تھی۔

لاکھوں دلوں کی دھڑکن اب ختم ہو چکی تھی۔

ہزاروں کی آغوش میں جگمگانے والا ماہتاب اپنی چاندنی کھو چکا تھا۔

مینا گل کا وجود پکار پکار کر شہرت اور نفس کے تقاضوں کے پیچھے بھاگنے والی لڑکیوں سے کہہ رہا تھا۔

دیکھو مجھے جو دیدہ عبرت نگاہ ہو۔

سدا کی رقیق القلب اور خدا ترس صفیہ کا جی بھر آیا۔

خرد گنوا کے جنون آزما کے کیا پایا۔

''کیا پالیا' اس سفر میں تم نے میری بہن! ہمیشہ کے لیے آخرت کا دردناک عذاب۔ ایک مسلسل سزا۔ کاش' تم نے اپنے دل کو قناعت اور صبر کرنا سکھایا ہوتا۔ کاش تم اتنی جلد باز نہ ہوتیں۔ کاش' تم نفس کے سرکش گھوڑے کو بے لگام نہ ہونے دیتیں مگر اب تو صرف کاش ہی رہ گئے ہیں۔ زندگی تو ختم ہو گئی۔''

صفیہ نے دُکھے دل سے سوچا۔

الزام کس کو دیا جائے۔

اس کی فطرت کو۔

اس کے نفس کو۔

یا پھر معاشرے کے اس سسٹم کو جس کے گھن لگے غلیظ پوشیدہ پہلو نسلوں کی حرمت و معصومیت کے قاتل بن گئے ہیں۔

معاشرے کو سنوارنا ہے' پاکیزہ ماحول تشکیل دینا ہے تو پہلے برائی کی جڑ کو کھنگالنا ہوگا۔
اصر کا کھوج لگانا ہوگا جو بے خبری میں صدیوں سے ہمارے بوسیدہ نظام کا حصہ بنے
ں کہ بے خبری نادانی کا باعث بنتی ہے۔

نادانی!

انی تباہی ہے' بربادی ہے' ایک قیامت ہے' ہم سب کے لیے۔

یقت سے نظر چرانے سے کیا حاصل۔

ئینے کے سامنے پردہ ڈالنے سے کیا فائدہ۔

غلطی تسلیم کیوں نہ کر لیں کہ ہم برس ہا برس سے اپنی نئی نسلوں کو جو ماحول دیتے آرہے ہیں'
جھ کجی' کچھ سقم رہ گئے ہیں۔ بہت سے نقص دور کرنا باقی ہیں۔

اپنی نسل کی ظاہری ''پاکی'' کا اہتمام تو کرتے تھے۔

رباطنی پاکی انجانے میں خود ہی چور دروازے دکھا کر آلودہ کر رہے ہیں۔

قدموں کی ''درستگی'' کا دھیان تو رکھتے ہیں مگر سوچوں کی مضبوطی اور پاکیزگی کے لیے
ن نہیں کھولتے۔

رچ مضبوط ہوگی تب ہی قدم بھی مضبوطی سے صراط مستقیم پر جمے رہ پائیں گے۔

ں کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنی نئی نسل کو ایمان و پاکبازی کی محض تاکید ہی نہ کریں' خود
نمونہ بھی بن کر دکھائیں۔ ہم راستی' سادگی' پاکیزگی اور احتیاط و لحاظ روا رکھیں گے تو ہماری
بھی ہمارے نقش قدم پر چلتی ہوئی ہماری تقلید کریں گی۔ مثالی والدین ہی مثالی اولاد کی
دعزت حاصل کر پاتے ہیں۔

ہیں یہ غلطی تسلیم کرنا ہوگی کہ نئی نسل ہماری کوتاہی' عاقبت نااندیشی اور غلطی کے باعث ذہنی
ور جنسی مسائل کا شکار ہوتی جارہی ہے اور یہ مہلک زہر بے خبری میں ہم خود انہیں انجیکٹ کر
ا۔

ہم خود اپنے بچوں کی بربادی کا سامان کر رہے ہیں۔ ڈش' ٹی وی' رسائل' کتب اور بُرے
الی محبت کا نمبر تو بعد میں آتا ہے' سب سے پہلے تو ہم بزرگ' ہم والدین اپنے بچوں سے
وتے ہیں۔ ہم ہی اُن کا ماحول ہوتے ہیں اور ہم ہی ماڈل۔ وہ جو ہمیں کرتے دیکھتے ہیں'
امحسوس کرتے ہیں' وہی ہم سے سیکھتے بھی ہیں۔

پہلا اثر، پہلا رنگ، پہلا نقش ہم بڑوں کی شخصیات کا ہوتا ہے جو نوجوان نسل کے ذہنوں
جگہ پاتا ہے۔ اسی سے تخیل کی تصویریں بنتی بگڑتی ہیں۔ اگر مینا گل کو ایک صحت مند، سادہ و پا
گھریلو ماحول ملا ہوتا تو آج وہ بھی صفیہ کی طرح ایک خوش و خرم وضع دار زندگی بسر کر رہی ہوتی۔

اگر اُسے قبل از وقت آگہی نہ ملتی تو وہ بھی ذہنی اعتبار سے ایک مکمل اور تندرست نوجوان
کے قالب میں ڈھل جاتی جیسی کہ صفیہ تھی۔ صفیہ اور علی مراد اپنے ماں باپ کی دین دار طب
سادگی اور نیک دلی کے سبب اردگرد کی کثافتوں سے محفوظ رہے تھے حالانکہ وہ بھی اسی فضا میں
بڑھے تھے جس میں مینا گل نے اپنا بچپن اور نوجوانی بتائی تھی۔ ہمیں اپنا وہ مشرقی ڈھانچہ ا
ترتیب دینا ہوگا۔ ایک ایسا ماحول قائم کرنا ہوگا جس میں پیر و جوان کی تفریق کیے بغیر ہر شخص
اپنی غلطی کی نشان دہی، اُس کا اعتراف اور ازالہ کرنے کی اخلاقی جرأت موجود ہو۔

بات شہر یا گاؤں کی نہیں ہے، اُس ماحول کی ہے جو ہم اپنی نسلوں کو دے رہے ہ
معاشرے کے ان رستے ہوئے ناسوروں کی ہے جنہیں ہم صدیوں سے چشم پوشی، گریزا
اندازی کا خون پلا کر پال رہے ہیں۔

صفیہ کو زیادہ دیر تک میت کے پاس کھڑے رہنے کا حوصلہ نہ ہوا تو وہ بے جان قدموں
کچھ فاصلے پر لان میں سرو قد کھڑے املتاس کے اُداس پیڑ کے پاس چلی گئیں۔

''اماں چلو اب پنڈ واپس چلتے ہیں۔ کیوں تماشا بناتی ہو۔ منہ تو دیکھ لیا ہے۔ کسی پر اص
کھل گئی تو نئے سرے سے پگڑی اُتر جائے گی۔''

صفیہ نے بے اختیار چونک کر دائیں طرف رخ موڑا۔ کچھ فاصلے پر ایک اُدھیڑ عمر
جسامت کا مالک سانولی رنگت کا دیہاتی مرد سفید قمیض دھوتی، نیلی اور لال دھاریوں والا پٹکا کند
پر ڈالے ایک دبلی پتلی بوڑھی عورت کو سہارا دے کر گیٹ کی طرف لے جانے کی کوشش میں تھا۔

اُدھیڑ عمر مرد کے لہجے میں شکستگی، تلخی اور دھیما پن شامل تھا، یوں جیسے ضبط کے کڑے ا
سے گزر رہا ہو۔

صفیہ کو اُس کی صورت بہت دیکھی دیکھی سی لگی۔

''کون ہے یہ؟'' چہرہ اتنا مانوس تھا کہ وہ بُری طرح اُلجھ گئی تھیں۔

''مجھے دیکھنے دے ناں۔ آخری بار تو صورت دیکھ لوں۔'' وہ بیٹے کی گرفت میں پھڑ پھ
ہوئی رخ بدل کر کہہ رہی تھی۔

یہ نے جونہی میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس کھچڑی بالوں اور ڈھانچہ جسم والی اس بڑھیا کو غور
ہ ششدر رہ گئیں۔ احساس کے ساحلوں پر بڑی تیز ہوا چلی تھی۔ یہ تو حلیمہ تھی۔ مینا گل
ب ماں جو بیٹی کی جدائی میں نیم پاگل ہو گئی تھی۔

دیکھ تو لی ہے لماں اور کیا دیکھو گی اب۔ اُس نے منہ دکھانے کے قابل ہی کہاں چھوڑا
ہارا، نہ اپنا۔'' وہ ہار کر بولا۔

یہ کو اسے پہچاننے میں اب قطعی دقت نہ ہوئی۔ وہ مینا گل کا منجھلا بھائی تھا۔ بڑا بھائی تو
ر پر قاتلانہ حملے کی پاداش میں جیل میں بند پڑا تھا۔ چھوٹے نے گھر بار بیچ کر خاندان کے
ہمیت کسی دور دراز کے علاقے میں رہائش اختیار کر لی تھی۔

گل کی موت کی اطلاع یقیناً اخبار یا ٹی وی، ریڈیو کے ذریعے ملی ہوگی۔

تھی ناں۔ رہ نہ سکی اور بیٹے سے ضد کر کے بیٹی کا منہ دیکھنے چلی آئی۔

یہ پہلو بدل کر کچھ آڑ میں ہو گئیں۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ حلیمہ یا اُس کا بیٹا اُنہیں پہچان
طرف آئے۔

یا فائدہ۔ کہانیاں اب بدل گئی تھیں۔

نی راکھ کا ڈھیر بن چکا تھا۔ تعلقات کی تمام شاخیں حالات کی فصل خزاں کے باعث
شتے داری کے درخت سے ٹوٹ چکی تھیں۔

ب سوئے ہوئے زخم جگانے سے کیا حاصل تھا۔

ں کے رشتے سے قرابت داری ہوتی تھی، وہ تو منوں مٹی تلے سونے جا رہی تھی۔ مل بھی لیا
ا، پُرانے درد پھر روح کے ساز چھیڑیں گے پھر رلائیں گے، ستائیں گے۔

سرے ہارون اُن کے ساتھ تھا۔ وہ اسے ماضی کے تلخ اوراق نہیں پڑھوانا چاہتی تھیں۔

چانک ہی اُنہیں ہارون اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔

وا اکیلا نہیں تھا، اس کے ساتھ ایک لڑکی اور ایک پختہ عمر کی عورت بھی تھی۔

یہ خواتین کون ہیں؟'' صفیہ کے دل میں فطری ماؤں والی تشویش جاگی تھی۔ اُنہوں نے
جائزہ لیا۔

عمر کی عورت سفید اور آسمانی پرنٹ کے جارجٹ سوٹ میں ملبوس تھی، اُس کے چہرے پر
فقت کا راج تھا۔ جسامت میں قدرے بھاری اور دراز قامت تھی۔

لڑکی عمر میں چوبیس پچیس برس کی دکھائی دیتی تھی۔ اُس کا رنگ سنہری سیب جیسا تھا جس
میں ایک جاذب سی دمک تھی۔ آنکھوں کا رنگ بھی سنہری تھا اور ان میں ایک خواب ناک سی سحر
انگیزی تھی۔ لڑکی سرتاپا سیاہ بڑی سی چادر میں ملفوف تھی۔ صرف آنکھیں اور پیشانی نظر آ رہی تھی
جس سے اُس کی رنگت اور آنکھوں کی خوب صورتی کا اندازہ ہوا تھا۔ باقی پورا چہرہ کالی چادر سے
ڈھکا ہوا تھا۔ لڑکی چلتے چلتے ایک لمحے کو حلیمہ کے پاس رُکی تھی۔

کچھ دیر تک بغور اُسے دیکھتی رہی۔ جیسے کچھ کھوجنا چاہتی ہو۔

”کیا بات ہے مشعل؟“ ہارون کے استفہامیہ لہجے اپنائیت نے صفیہ کو چونکا دیا تھا۔

”کچھ نہیں۔ ایسے ہی رک گئی تھی۔ اس بوڑھی عورت کے چہرے کے تاثرات نے مجھے
ٹھٹکا دیا تھا۔“ وہ سر جھٹک کر دوبارہ قدم بڑھانے لگی تھی۔ اسی اثناء میں حلیمہ کا بیٹا ماں کو سمجھانے
بجھانے کے بعد واپس لے جا چکا تھا۔

”امی ان سے ملیں۔ یہ مشعل ہیں۔ اسلام آباد میں لاوارث بچوں کا ایک ادارہ چلا رہی ہیں
اس کے علاوہ اپنی فیکٹری بھی سنبھال رکھی ہے۔ اکثر کیسز کے سلسلے میں مجھے ان کا تعاون حاصل
رہا ہے۔ انہی کے ادارے سے بابا صاحب منسلک ہیں جن کا میں آپ سے اکثر تذکرہ کرتا رہتا
ہوں اور یہ مشعل کی سرپرست آپا اماں، ان کا نام راشدہ ہے۔ آج صبح ہی لاہور پہنچی ہیں مینا گل کی
تدفین میں شریک ہونے کے لیے۔“

ہارون انہیں ماں کے پاس لے آیا تھا۔ صفیہ نے دلچسپی سے دونوں کی طرف دیکھا اور سلام
دعا کی۔

”مینا گل آپ کی جاننے والی ہیں؟“ صفیہ کے لیے یہ بات خاصی حیرت انگیز تھی کہ وہ
دونوں محض آخری دیدار کے لیے اتنی دور سے ایمرجنسی میں لاہور آئی تھیں۔

اُنہوں نے محسوس کیا، اس سوال پر نقاب پوش لڑکی کی سنہری آنکھوں میں اضطراب کی لہریں
موجزن ہوگئی تھیں۔ وہ کچھ گھبرا کر ہارون کی طرف دیکھنے لگی تھی۔

اس سے پہلے کہ ہارون وضاحت کرتا، آپا اماں فوراً بول پڑیں۔

”مینا گل کسی زمانے میں ہماری پڑوسی رہی ہیں۔ اس وقت وہ سپر اسٹار نہیں ہوتی تھیں۔ اُس
نسبت سے انسیت سی ہوگئی تھی۔ اُن کے انتقال کی خبر سنی تو رہا نہ گیا۔ میں مشعل بیٹی سے اصرار کر
کے اُسے ہمراہ لے آئی۔“

اوہ۔ اچھا۔“ صفیہ نے سر ہلاتے ہوئے ایک مرتبہ پھر دزدیدہ نظروں سے مشعل کی طرف
۔ اُس کی رنگت ضبط گریہ سے تمتما رہی تھی۔ آنکھیں خشک تھیں مگر ان میں مقبروں کی سی
اٹا اور دُھند چھائی ہوئی تھی۔ صفیہ کو اُس کی آنکھوں کے تاثرات کچھ پُراسرار سے محسوس
تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی اچانک شاک سے پتھر کے مجسمے میں ڈھل گئی ہو۔

امی۔ لاہور میں اِن کا کوئی عزیز رشتے دار نہیں رہتا۔ انہیں شام کی فلائٹ سے واپس جانا
ٹ نہیں مل سکی۔ رات ٹھہرنے کے لیے ہوٹل میں قیام کرنے کا ارادہ رکھتی تھیں، میں نے
نے گھر ٹھہرنے کی پیشکش کی ہے۔“

یہ تو پوچھنے کی بات ہی نہیں تھی بیٹے۔ تم نے بہت اچھا کیا۔ بہن آپ ہمارے گھر کو عزت
ہارون سے شناسائی کے سبب آپ ہماری بہت زیادہ اپنی ہیں۔“ صفیہ نے فوراً اپنی
مان نوازی اور ملنساری کا ثبوت دیتے ہوئے پُرجوش و پُرمسرت انداز میں ہارون کی تجویز
رم کیا تھا۔

”آپ کو خواہ مخواہ زحمت ہوگی بہن۔“ آپا اماں نے متذبذب نظروں سے مشعل کا چہرہ دیکھ
کے تاثرات پڑھنے کے بعد لجاجت سے کہا۔

”زحمت کیسی۔ مہمانوں کی خدمت عین راحت ہے۔ چلو بیٹے۔ تمہاری کار کہاں کھڑی
ہیں عزت واحترام سے گاڑی میں بیٹھاؤ۔“ صفیہ نے اُن کی ایک نہیں چلنے دی اور انہیں
لے کر ہارون کی گاڑی کی طرف آ گئیں۔ مشعل بالکل خاموش تھی۔

☆☆☆

رات کے دس بجے تھے۔ باہر تاریکی پنکھ پھیلائے بیٹھی تھی اور دل میں تو شاید ہمیشہ سے
رہا تھا۔ مشعل اور آپا اماں اپنے میزبانوں کے عنایت کردہ کمرے میں ایک دوسرے سے
ائے خاموش بیٹھی تھیں۔ ہارون نے اُس کی کیفیت بھانپتے ہوئے آتے ہی گھر والوں سے
تعارف کروا کے الگ کمرے میں بھجوا دیا تھا۔

”اُن کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اُنہیں آرام کی ضرورت ہے۔ صبح مل لیجئے گا تفصیلاً۔“ اس
ے سے تشویش اور فکرمندی کا اظہار ہو رہا تھا جو کہ سب گھر والوں بشمول اماں جی کے لیے
ران کن تھا۔ وہ تو بہت پُرسکون اور آہنی اعصاب کا مالک تھا۔ بڑی سے بڑی پریشانی بھی
کے سیلف کنٹرول اور طبیعت کے ٹھہراؤ پر اثر انداز نہیں ہو پاتی تھی۔ حیرت کی بات تو تھی ناں،

بہرحال اور پھر جس طرح اُس نے مہمانوں کی خاطر مدارات اور آرام وسکون کے لیے تاکید
ہدایت کی تھی' وہ بھی غیر معمولی کہلائی جاسکتی تھی۔

توقیر' طیبہ' اسما اور حارث وغیرہ نے اُس کی آمد پر بہت مسرت کا اظہار کیا تھا۔ اُن کا ہارون
کے فلیٹ پر مشعل سے ٹاکرا ہو چکا تھا۔ جس کا آنکھوں دیکھا حال اب دیگر حاضرین کے گوش گزار
کیا جارہا تھا۔ جو اس "سعادت" سے محروم رہتے تھے۔

خصوصاً اماں جی کو بڑا تجسس تھا' اس جاذب نظر حسن کی مالک شہزادیوں کی سی آن بان او
تمکنت رکھنے والی لڑکی کے بارے میں جاننے کا۔ رات کا کھانا بھی کمرے میں دیا گیا تھا۔

نوجوان پارٹی کھانے کے بعد ہال کمرے میں جمع تھی اور مہمانوں کے بارے میں تبصر
آرائی فرما رہی تھی۔ اماں جی' رضوانہ اور صغریٰ وغیرہ بھی وہیں تھے۔ افراح اس سارے قصے میں
مانند دیوار چُپ بیٹھی تھی۔ اُسے اب کوئی حیرانی و تجسس لاحق نہیں تھا۔

ہارون دوبارہ مینا گل کی کوٹھی کی طرف نکل گیا تھا۔

"کیا بات ہے بیٹی۔ ایسے کیوں بیٹھی ہو' کوئی بات کرو۔"

جب مشعل دس پندرہ منٹ تک ایک ہی زاویے سے کھڑکی کے پاس رکھی کرسی پر
جُھکائے بیٹھی ہاتھ کی لکیریں دیکھتی رہی تو بے چین سی آپا اماں بالآخر سناٹا توڑ کر پوچھ بیٹھیں۔ اُ
کے شفیق چہرے پر اس مظلوم و معصوم لڑکی کے لیے ہمدردی اور دکھ کے تاثرات رقم تھے۔

"کیا بات کروں آپا اماں۔" بالآخر اس نے گہری طویل سانس لیتے ہوئے سر اُٹھایا۔ آ
اماں نے دیکھا شدتِ ضبط سے اس کی شہد رنگ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ اس کے چہرے
موت کی سی زردی کھنڈی تھی۔ یوں لگتا تھا' جیسے راتوں رات کسی نے جسم کا سارا خون نچوڑ لیا ہو۔

"رو ہی لو بیٹی۔ جی ہلکا ہو جائے گا۔" وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اُس کے پاس آ کھڑی ہوئیں
اور محبت سے اُس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگیں۔ مشعل نے سر کرسی کی پشت سے ٹکا
آنکھیں موند لی تھیں۔ اس کی گھنی سیاہ پلکوں پر ننھی ننھی بوندیں نگینوں کی طرح جڑی ہوئی تھیں۔

"میں رونا نہیں چاہتی آپا اماں۔ بُرائی کے خاتمے پر دکھ کا اظہار کرنا بھی تو بُرائی کا سا
دینے کے مترادف ہوتا ہے۔" بڑبڑانے کے سے انداز میں آنکھیں بند کیے ہوئے کہہ رہی تھی
"ہاں' یہ ضرور سوچ رہی ہوں کہ موت کا بلاوا پہلے اُن کی طرف ہی کیوں آیا۔ مجھے بلا لیا ہوتا
نے اپنے پاس۔ اُن کی تو بہت سوں کو ابھی ضرورت تھی۔ چاہ تھی۔ میں ٹھہری بے مطلوب و بے

اِس پاک صاف دنیا میں کیا کام۔ باری تو میری تھی۔"

"ایسے نہیں کہتے۔" انہوں نے شفقت سے اُس کے بال سُلجھائے۔ "خدا نے کسی چیز' کسی
بےمقصد پیدا نہیں کیا۔"

"آپا اماں۔ ہم کل ہی اسلام آباد واپس چلے جائیں گے۔ اس گھر کی ہنستی بستی نورانی فضا
میں دم گھٹ رہا ہے۔ اپنا آپ مزید حقیر و بے مایہ لگ رہا ہے۔" اس نے اپنا جلتا بلتا سر اُن کی
گود میں چھپا لیا تھا۔

"اگر کسی طرح میری اصلیت کھل گئی تو قیامت ٹوٹ پڑے گی۔"

"کیا تو نے ہارون کو ساری کہانی بتا دی ہے یا؟" انہوں نے دریافت کیا کیونکہ دن کو مینا
کوٹھی پر جب اُس سے ٹاکرا ہوا تھا تو اپنی ماں سے ملوانے سے پہلے مشعل نے اُسے دوٹوک
کہا تھا۔

"میرے تعارف میں مینا گل کا حوالہ نہیں آنا چاہیے۔"

"ساری کہانی؟" اس نے اچانک ہی سر اوپر اُٹھایا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے آپا اماں۔ میں اس سے پہلے مر نہ جاتی اور یہ میرا خود سے عہد ہے کہ اگر
خدانخواستہ ہارون میری بے نشانی کا راز پا گیا تو اس کے بعد دوبارہ زندگی بھر اُس کے سامنے
نہیں آؤں گی۔ میں ان احترام والفت سے لبریز نگاہوں کو بدلتے نہیں دیکھ سکتی۔ اُس کی نظروں
سے گر کر زندہ نہیں رہ سکتی۔"

وہ اولوالعزمی اور یقین سے گویا ہوئی۔

آپا اماں بے بسی ولاچاری کے عالم میں اس پر ایک ترحم آمیز نگاہ ڈال کر رہ گئی تھیں۔ وہ بھلا
بھی کیا سکتی تھیں؟ تقدیر سے تو نہیں لڑا جاسکتا تھا۔

☆☆☆

"مجھے پتا چلا ہے' آپ مینا گل کے جنازے پر گئی تھیں؟"

سردار امداد نے تجسس و بے چین نظروں سے صفیہ کا چہرہ ٹٹولا تھا۔ وہ رات ساڑھے دس بجے
لوٹ آئے تھے۔ رضوانہ کی ماں زرقا نے کچھ چیزیں بھجوائیں تھیں' بیٹی کے لیے۔

"ہاں کیونکہ میں چاہتے ہوئے بھی اپنے دل کو پتھر نہیں کر سکی تھی۔" وہ سپاٹ انداز میں گویا ہوئیں۔

سردار امداد کے چہرے پر اضطراب کی لکیریں پھیلتی جارہی تھیں۔

"صفیہ بہن! میں عجیب مخمصے میں پھنس گیا ہوں۔ مینا گل نے مرتے دم تک مجھے اپنی بیٹی کا
پتا نہیں بتایا۔ اب میں کس طرح اُس کا کھوج لگا پاؤں گا کہاں ڈھونڈوں گا۔" وہ بے بسی
ہونٹ بھینچ کر خلا میں گھورنے لگے۔ وہ ابھی ابھی ناشتے سے فارغ ہوئے تھے۔ اسی اثنا میں مشعل
کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

"آ۔ آنٹی۔ وہ۔ ہارون کدھر گئے۔ ہمیں آپ سے اجازت درکار ہے۔" ہچکچاتی ہو
آواز اس بات کی شاہد تھی کہ وہ اپنی دُھن میں اندر آتے ہوئے سردار امداد کو بیٹھے نہیں دیکھ پائی تھ
وگرنہ شاید راستے سے پلٹ جاتی۔

"آؤ بیٹی۔ ہارون اماں جی کی دوائیں لینے قریبی میڈیکل اسٹور گیا ہے' آتا ہی ہوگا
جانے کی بالکل بھی نہیں ہو رہی۔ میں اتنی جلدی نہیں جانے دوں گی۔" صفیہ کے لہجے میں بزرگا
حلاوت و اپنائیت تھی۔ سردار امداد نے پلٹ کر اُچٹتی سی نظر اُس پر ڈالی اور پھر جیسے چونک سے گئے
سنہری آنکھیں' سنہرے رخسار' سیاہ موٹی ناگن جیسی چٹیا' غیر معمولی حسن اور اس پر وقار و جلال۔

"یہ کون ہیں؟" وہ بے اختیار صفیہ سے پوچھ بیٹھے۔

"یہ مشعل ہیں۔ اسلام آباد میں رہتی ہیں اور ہارون کے توسط سے ہم سے آشنائی ہو
ہے۔ بیٹی' یہ رضوانہ کے والد صاحب ہیں۔"

"السلام علیکم۔" مشعل نے ایک نظر اس ادھیڑ عمر کے وجیہہ سے شخص پر ڈالتے ہو
شائستگی و آہستگی سے کہا۔

"وعلیکم السلام۔ آؤ بیٹی' یہاں آ کر بیٹھو۔" سردار امداد نے بڑے نرم سے انداز میں مخاط
کیا تھا۔ نظریں بدستور اُس کے چہرے کے نقوش کھنگال رہی تھیں۔

وہ چُپ چاپ آ کر صفیہ کے پاس صوفے پر بیٹھ گئی۔

"تمہارے ماں باپ کیا کرتے ہیں بیٹے؟"

"دونوں کا انتقال ہو چکا ہے۔ میں اپنی آپا اماں کے ساتھ رہتی ہوں۔" وہ سر جھکا
دھیمے سے پست لہجے میں گویا ہوئی۔

دائیں پاؤں کے انگوٹھے سے قالین کا کونا کریدتے ہوئے وہ بمشکل اپنے لہجے کی یاسیت
اور محرومی چھپا سکی تھی۔

"لیجیے ابا جی۔ میرے ہاتھ کا کشمیری قہوہ نوش فرمائیے۔ آپ کو پسند ہے نا۔" رضوانہ بھ

سے خوب صورت ٹرے میں برتن سجائے بڑے بشاش موڈ میں کمرے میں داخل ہوئی تھیں۔

"ارے مشعل' آپ بھی اِدھر بیٹھی ہیں۔ ایک منٹ ٹھہریئے' میں ابھی کپ لے کر آتی
۔" رضوانہ بھابی ایک پسندیدہ و مشفق نظر اس پر ڈال کر فوراً سے پیشتر واپس پلٹی تھیں۔ مشعل
روکنے کے لیے الفاظ ہی ڈھونڈتی رہ گئی۔

"آپ نے خواہ مخواہ تکلف کیا رضوانہ بھابی۔ مجھے قطعی خواہش نہیں تھی۔" ان کی واپسی پر
ں نے معذرت خواہانہ انداز میں اُن کی طرف دیکھا تھا۔

"پئیں گی تو خود بخود خواہش پیدا ہو جائے گی۔ آپ لیں تو سہی۔" اُنہوں نے پیار سے
ہئے اُسے زبردستی کپ تھما دیا۔ اُنہیں یہ بے ضرر سادہ کھوئی کھوئی لڑکی بہت اپنی اپنی سی لگی
گو کہ رضوانہ سردار امداد جیسے بے حس' ہوس پرداز باپ کی اولاد تھیں مگر اُن کی پڑھی لکھی اور سلجھی
اماں زرقا نے اپنے بچوں کی تربیت میں اس طرح جان ماری کی تھی کہ وہ باپ دادا کی فطرت
بہت کم عکس چُرا پائے تھے۔ اسی لیے رضوانہ اور عاصم اپنے باپ کے مزاج کے برخلاف بہت
وط اور پختہ کردار کے مالک تھے۔

یوں تو مشعل کو اس گھر کے ہر مکین سے مل کر دلی اپنائیت و مسرت محسوس ہوئی تھی لیکن رضوانہ
ابی کی طرف دل بے ساختہ کھنچا چلا جا رہا تھا۔ عمر میں تو شاید وہ مشعل سے ایک دو سال چھوٹی ہی
گی مگر "عہدے" کے اعتبار سے سب ہی بلا امتیاز احترام و ادب سے پیش آتے تھے۔ مشعل کو
وانہ کی ایک ایک ادا میں عجیب سی کشش نظر آئی تھی اور اُس کے فرشتوں کو بھی یہ خبر نہیں تھی کہ یہ
ون" کی کشش تھی۔ دونوں کی رگوں میں دوڑنے والا خون ایک ہی تھا۔ ماں کی طرف سے نہ
باپ کی طرف سے تو تھا۔

گھر والوں کے اصرار کے باوجود وہ کسی طرح رُکنے پر آمادہ نہ ہوئی تھی۔ بالآخر انہیں ہتھیار
لنے پڑے۔

"ہم جلد ہی تمہارے پاس اسلام آباد آئیں گے بیٹی۔" جاتے سمے اماں جی نے اس کی
ین پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے پُر مسرت انداز میں مسکرا کر کہا تھا۔ ان کے نرم محبت بھرے
ہٹوں کا ٹھنڈا مسیحا صفت لمس مشعل کی روح تک اُتر گیا۔

اماں جی کے انداز میں جو گرم جوشی' ہیجان اور اسرار تھا' گھر کے مکینوں کو اُس کی تہہ تک پہنچنے
کل چنداں دشواری نہ ہوئی تھی۔ ان کے درمیان آپس میں معنی خیز مسکراہٹوں کے تبادلے ہوئے

ہارون سب سے نظر بچا کر سنی اَن سنی ایک کرتا ہوا گاڑی اسٹارٹ کرنے لگا اُس کے دل میں آر
کے رنگا رنگ پھول ایک ساتھ کھل اُٹھے تھے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں رہا تھا کہ اماں جی اُس کے د
کی بے تاج ملکہ کا سراغ لگا چکی تھیں۔

☆☆☆

''میں نے تین سادہ لباس والے تمہاری حفاظت کے لیے متعین کر دیے ہیں۔ میڈم ہا
کی طرف سے کوئی بھی انتہائی کارروائی عمل میں آ سکتی ہے۔'' چونکہ ہارون کو بھی اسلام آباد آنا
اس لیے مشعل اور آیا اماں اُس کی گاڑی میں بائی روڈ ہمراہ آئی تھیں۔

''اس کی بالکل بھی ضرورت نہیں ہے۔ ناحق تردد کر رہے ہو۔'' گاڑی گیٹ کے آگے ر
چکی تھی۔

''ہارون ٹھیک کہہ رہا ہے بیٹی۔ خطرہ بدستور موجود ہے۔ تمہیں محتاط رہنا چاہیے۔'' آیا اما
نے کار سے نکلتے ہوئے ہارون کی تائید میں بیان دیا۔

مشعل جھلاہٹ کے سے انداز میں سر ہلا کر رہ گئی تھی۔

''اندر نہیں آؤ گے؟'' ہارون کو دوبارہ گاڑی اسٹارٹ کرتے دیکھ کر مشعل نے دھیمے
دریافت کیا۔

''آؤں گا مگر ابھی نہیں۔ میں تمہارے ادارے کی طرف جا رہا ہوں۔ بابا صاحب کو سا
کیے بہت دن ہو گئے ہیں اور ہاں، مجھ سے وعدہ کرو، روزانہ دن میں کم از کم دو مرتبہ فون کر کے ا
خیریت سے آگاہ کیا کرو گی۔''

''ہارون۔ بھئی کیا ہے۔ تم تو بالکل ہی باؤلے بن گئے ہو۔ بھلا ایسی کونسی ایمرجنسی آن
جو بے وقوفوں کی طرح گھڑی گھڑی تمہیں فون کر کے صلاح مانگا کروں گی۔ حد ہو گئی ہے۔''

وہ سرے سے اس معاملے کو اہمیت دینے کے لیے تیار ہی نہیں تھی۔ انداز میں حد در
پروائی و بے فکری تھی۔

''بس۔ میں نے جیسا کہا ہے، ویسا ہی کرنا۔'' ہارون نے سختی سے کہا۔

''اچھا بابا۔'' اُس نے یونہی ٹالنے کے لیے ہامی بھر لی۔

''او کے۔ خدا حافظ۔ میں ایک دو دن میں تمہاری طرف آؤں گا پھر تفصیلی بات ہو گی۔''
سیدھا بابا صاحب کے پاس پہنچا تھا۔

''بابا صاحب کیا کر رہے ہیں؟'' اُس نے اُن کے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے یونہی
ی کی 'آرائش' کرتے رمضو سے پوچھا۔

وہ جی، دو ایک دو دن سے اُن کا جی ماندہ ہے۔ کسی سے زیادہ بات نہیں کر رہے۔ خموش سے
ہیں۔'' رمضو نے سلام جھاڑنے کے فوراً بعد صورتِ حال سے آگاہ کیا تھا۔

''کیوں۔ خیریت ہے؟'' وہ خود کلامی کے سے انداز میں کہتے ہوئے آگے بڑھا۔

''پتا نہیں جی۔'' رمضو نے بے خبری کا اظہار کرنے کے لیے کندھے اُچکائے تھے۔ بابا
ب حسبِ معمول سفید لباس میں سفید دری پر سر جھکائے بیٹھے تسبیح کے دانے گھما رہے تھے مگر
کے انداز میں ارتکاز کی کمی تھی۔ یوں لگ رہا تھا، جیسے ذہنی طور پر کہیں اور پہنچے ہوئے ہوں یا کسی
ری سوچ میں گم ہوں۔ اُن کے چہرے پر تھکن اور الجھاؤ کا تاثر نمایاں تھا۔ اُن کے دائیں
ب اخبار کے صفحات بکھرے ہوئے تھے۔

''السلام علیکم بابا صاحب۔''

اُس نے چپل اتار کر دری پر اُن سے کچھ فاصلے پر دو زانو بیٹھتے ہوئے مؤدب و محتاط انداز
ں انہیں مخاطب کیا۔

اُنہوں نے چونک کر آنکھیں کھولیں اور پھر اسے سامنے پا کر مبہم سی مسکراہٹ اُن کے
ہرے پر چمکی۔

''وعلیکم السلام۔ کہاں رہے اتنے دن؟ خیر خیریت کی اطلاع بھی نہ دی۔''

''بس کچھ مصروفیت رہی تھی بابا صاحب اور میں خواہش کے باوجود حاضری نہ دے سکا۔
پ کیسے ہیں۔''

''راضی برضا ہیں بچے۔ وہ جس حال میں رکھے، خوش ہیں۔'' پھر وہ اُس سے اِدھر اُدھر کی
یں کرنے لگے۔

''کیا آپ محبت کو مانتے ہیں بابا صاحب؟'' وہ اچانک ہی پوچھ بیٹھا تھا۔

''محبت کو کون نہیں مانتا بیٹے۔ شرط یہ ہے کہ خالص شکل میں ہو۔''

''پھر تو آپ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ محبت کیا ہوتی ہے۔'' وہ تواتر سے سوال کر رہا تھا۔

''روح کی طلب کا دوسرا نام ہے۔'' وہ آنکھیں بند کیے آہستگی سے گویا ہوئے۔

''اور اگر مرد و عورت کے درمیان ہو تو؟''

"پھر اس میں دُہری طاقت پیدا ہو جاتی ہے کہ صنفی کشش کے باعث یہ روح اور فطرت دونوں کی طلب بن جاتی ہے۔ فطری طلب تسکین پا جائے تو محبت کے عمل میں ٹھہراؤ آ جاتا ہے۔"

"اور اگر ایسا نہ ہو تو؟"

"تو پھر دل کی آگ اور بھڑکتی ہے۔ اتنا کہ فطری تقاضے کہیں پیچھے رہ جاتے ہیں۔ اور روح کی پیاس بڑھتی چلی جاتی ہے حتیٰ کہ وہ مقام آ جاتا ہے جہاں روح تمام جبلی آلائشوں سے پاک ہو کر نکھر کر پرواز کے لیے تیار ہو جاتی ہے۔ اس منزل کو عشق حقیقی کا نام دیا جاتا ہے۔"

بابا صاحب نے عشق مجازی سے عشق حقیقی کی منزل تک روح پرور سفر کا اتنا خوب صورت نقشہ کھینچا تھا کہ ہارون دم بخود رہ گیا۔

"اگر گستاخی خیال نہ کریں تو ایک بات پوچھوں؟" ہارون نے ڈرتے ڈرتے اُن کے نورانی چہرے کی طرف دیکھا۔ "کیا آپ بھی ایسا ہی کوئی سفر طے کر کے روحانیت کی اس منزل تک پہنچے ہیں۔" پل بھر کو کمرے میں سناٹا چھا گیا۔

"ہاں۔" بالآخر ان کی گمبھیر آواز نے اقرار کے سُر بکھیرے۔

"وہ کون تھی بابا صاحب؟" ہارون کے سوال میں بے ساختگی تھی۔

"وہ جو بھی تھی اُن کی طلب اُس کی شناخت، کہیں پیچھے رہ گئی ہے۔ اب اُس کے نام و مقام سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" بابا صاحب کا لہجہ ہموار تھا اور اُن کی نظریں اخبار کے صفحے پر جگمگاتی مینا گل کی تصویر کا احاطہ کر رہی تھیں۔

"بابا صاحب۔ یہ اخبار؟" ہارون نے اُن کی نظروں کی جنبش بغور محسوس کی تھی۔ بابا صاحب کے حجرے میں اخبار کی موجودگی خاصی انہونی بات تھی۔

"کل کا ہے۔ کوئی صاحب ملنے آئے تھے، واپسی پر اِدھر بھول گئے۔ چلو اُن کی بھول نے ہمیں کچھ فائدہ تو دیا۔" وہ منہ ہی منہ میں بدبدائے۔

"کیسا فائدہ!"

ہارون کی نظریں اُن کے چہرے پر جم گئیں۔

"یہی کہ یقین کی منزل تک پہنچنے میں آسانی ہو گئی۔ یہ واضح طور پر ثابت ہو گیا کہ اب نفس ہر دنیاوی کشش سے آزاد ہو چکا ہے۔ اس کے دنیا میں ہونے نہ ہونے اور موجود و غائب سے دل کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کہ اب صنفی طلب کو موت آ چکی ہے۔"

ہارون کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ وہ ایک ٹک ٹک سا ہو کر بابا صاحب کو دیکھ رہا تھا جن کی نظریں اب بھی مینا گل کی تصویر پر مرکوز تھیں۔

☆☆☆

"ہارون، مشعل کا ایڈریس تو سمجھا دو۔ کل کی ٹرین سے میں اور اماں جی تمہارے پاس پہنچ رہے ہیں۔" وہ طاہر کے ساتھ ہیڈ آفس میں حاضری دینے کے بعد ابھی اپنے فلیٹ میں داخل ہو رہا تھا کہ فون کی بیل بج اٹھی تھی۔

"امی اتنی جلدی۔ ابھی تو اسے لاہور سے آئے ہفتہ بھی نہیں گزرا۔ کچھ عرصہ ٹھہر جائیے۔ ابھی مناسب نہیں لگتا، تب تک میں اپنا کیس بھی نمٹالوں گا۔"

"اے بیٹے۔ تم نمٹاتے رہنا بعد میں۔ اماں جی سے اب بالکل بھی صبر نہیں ہو رہا ہے۔" وہ خوشی سے بولیں۔ "خدا خدا کر کے تو تمہارے من کا بھید کھلا ہے ہم پر۔ اب اور کتنا انتظار کرواؤ گے۔"

"اچھا امی، ایک منٹ۔ پہلے میں آپ کو مشعل کے بیک گراؤنڈ کے متعلق کچھ بتانا چاہتا ہوں۔" درحقیقت ہارون کی ہچکچاہٹ کی اصل وجہ یہی تھی۔ وہ چاہتا تھا، آرام سے بتدریج انہیں صورت حال سے آگاہ کرتے ہوئے مشعل کو قبول کرنے کے لیے راضی کرے۔ جلدی میں کھیل بگڑ بھی سکتا تھا مگر گھر والوں کا تاب و قرار رخصت ہو گیا تھا۔

"جہاں تک میں نے آپ کے رویے سے اخذ کیا ہے، آپ مینا گل کے ماضی سے کسی حد تک واقف ہیں۔ یہ بات بھی آپ کے علم میں ہوگی کہ اُس نے خفیہ شادی کی تھی جس سے اُس کی ایک بیٹی بھی ہے۔" اس نے ایڈریس لکھوانے کے بعد سہج سے بات شروع کی۔

"بیٹی کا تو مجھے پتا ہے مگر خفیہ شادی محض ڈھونگ ہے۔ اُس نے سرے سے شادی کی ہی نہیں تھی اور بیٹی اُس کے کالے کرتوتوں کی نشانی ہے مگر تم یہ سب کیوں پوچھ رہے ہو؟"

ہارون کے کانوں کے پاس جیسے کوئی آتشیں دھماکا ہوا تھا۔

"کیا کہہ رہی ہیں آپ......" اُس کے حواس بھک سے اُڑ گئے تھے اور دل کی دھڑکن جیسے ایک دم تھم گئی تھی۔ "مشعل مینا گل ہی کی تو اولاد ہے۔"

"کیا!" اب سر تا پا کانپ جانے کی باری صفیہ کی تھی۔

♥♥♥

"یہ بات تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتائی۔ اوہ خدایا! دنیا اتنی چھوٹی ہے۔" صفیہ نے سر تھام لیا تھا۔ انکشاف تھا یا آندھی کا تند و تیز جھکڑ جو اُن کے سارے حواس لے اُڑا تھا۔ "اور امداد بھائی' رضوانہ کے والد۔ جو بیٹی کی تلاش میں مارے مارے پھرتے تھے' وہ اسے روبرو پا کر بھی نہ پا سکے۔ کاش' مجھے علم ہوتا۔ کم از کم اُن کے اذیت ناک سفر کا تو اختتام ہو جاتا ہے۔"

"کیا مطلب ہے؟" ہارون کے حواس ٹھٹھر کر رہ گئے۔ ایک اور تازیانہ پھر ایک نیا خنجر وقت نے اس کے پہلو میں اُتار دیا تھا۔

"مشعل امداد ماموں کی بیٹی ہے؟" وہ جیسے خود کلامی کے سے انداز میں گویا ہوا۔ اُس کی پُر اعتماد' پُرسکون ہستی سرتاپا ہل کر رہ گئی تھی۔

"بدقسمتی سے۔" صفیہ نے سرد آہ بھری پھر ایک دم زور سے چونک گئیں۔ "بات سنو ہارون بیٹے' جو کچھ تم پر منکشف ہوا ہے' اسے خود تک ہی محدود رکھنا اور آج کے بعد یہ بھول جاؤ کہ مشعل نام کی لڑکی کبھی تمہاری زندگی میں آئی تھی۔ اماں جی اور دیگر گھر والوں کو میں کسی نہ کسی حیلے بہانے سے مطمئن کر دوں گی۔ میری ہمدردیاں مشعل کے ساتھ ہیں مگر اُس کے کردار کی تمام تر تابانی بھی اُس کی پیشانی پر لگا سیاہ داغ نہیں مٹا سکتی۔ یہ بات تم بھی اچھی طرح جانتے ہو۔ اب تمہاری شادی اُس سے ممکن نہیں ہے۔"

صفیہ نے فون رکھ دیا تھا۔ ہارون سائیں سائیں کرتے کانوں سمیت صوفے پر گر گیا۔

"اُمید اپنے ہاتھ میں تھی ہی کب۔" مشعل نے ایک بار کہا تھا۔ "یہ تو سراب ہے۔ فریبِ نظر ہے' طلسمِ آرزو ہے۔" اسے اس کا معنی خیز تھکا تھکا سا لہجہ یاد آیا۔

"میں نے تمہیں رشتے کی نوعیت بتا دی تو تم مجھ سے نفرت کرنے لگو گے۔" شاید وہ اس حقیقت کو بہت پہلے پا گئی تھی۔

"کون سا فخر یہ اعزاز تھا جس کا ڈھنڈورا پیٹتی۔ مجھے تو یہ بات خود سے کہتے ہوئے بھی حجاب آتا ہے۔" اور اسی لیے وہ اپنے باپ کی اصلیت چھپا گئی تھی۔

"وہ ماں نہیں ہے' نہ اس منصب کی مستحق ہے۔ وہ تو عورت بھی نہیں ہے۔" اُس کے منہ لے کتنے ہی جملے آس پاس شور مچانے لگے تھے۔

"اب انکشاف کی منزل سے گزر جانے کے بعد میرے اندر فطری رُو پہلے جذبے کہیں دفن ہیں۔" اس کی آواز میں کتنی اذیت رچی ہوئی تھی۔

"ہم جیسے لوگ سمندر کے بچھڑے ہوئے ساحل ہوتے ہیں ہارون۔ روزِ اول سے تنہائی مقدر کر دی جاتی ہے۔" اور پھر ممتا کے جذبوں پر بات کرتے ہوئے وہ ایک دم کتنی جذباتی ی۔ "تو یہ تھی تمہاری حقیقت۔" وہ گہری سانس لے کر سوچنے لگا۔ "جسے اپنی عزتِ نفس نے کے لیے تم برسوں سے مجھ سے چھپاتی رہی تھیں مگر مشعل! آزمائے بغیر نتیجہ اخذ کر لینا تو بات نہیں ہے۔ تم نے میری محبت کو اتنا کمزور کیوں سمجھ لیا۔ میں گزشتہ سات برسوں سے اس ں کو چاہ رہا ہوں جو ایک مہربان و مخلص اور پاکیزہ و پارسا لڑکی ہے' جو بے سہارا اور لاوارث ں کے لیے ادارہ کھول کر دُکھی انسانیت کی خدمت کر رہی ہے۔ جو گارمنٹ فیکٹری کی مالکہ کی ت سے معاشی میدان میں ایک کامیاب بزنس ویمن سمجھی جاتی ہے۔ جس کا کردار چٹان کی ح مضبوط اور چاندنی کی طرح شفاف ہے۔

"میں کسی فلم اسٹار یا جاگیردار کی بیٹی کو نہیں جانتا نہیں مانتا۔ میں نے تمہیں تمہارے حوالے ، چاہا ہے اور تمہاری شناخت کے لیے میرے نزدیک یہی کافی ہے کہ تم مشعل ہو۔ سراپا روشنی۔ پا رہنمائی۔"

تم زندگی کے ہر پہلو سے بے داغ اور بے مثال دکھتی ہو۔

"ماں باپ کے کیے کی سزا تم کیوں بھگتو۔ تم تو معصوم ہو' بے گناہ ہو' بے خطا ہو۔" ہارون کا اُس کے حق میں دلیلیں دے رہا تھا۔

"میرا خیال ہے' آپا اماں تمام تر حقائق و حالات سے باخبر ہوں گی' اُن سے تفصیلی بات کرتا اں تاکہ مشعل کے ماضی کی تمام گرہیں کھل جائیں۔ بھلے سے مجھے آپا اماں کو مجبور کرنا پڑے مگر ں ماضی کا ہر دریچہ کھلوا کر رہوں گا۔" وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ اسے یقین تھا کہ آپا اماں اس کے بے پناہ صرار پر ہتھیار ڈال دیں گی۔

اور پھر ہوا بھی یہی۔ تمام تر صورت حال جان کر ہارون اپنے فیصلے پر مزید پختہ ہو گیا۔ "رف موت ہی ہمیں جدا کر سکتی ہے مشعل۔" واپسی پر وہ سوچ رہا تھا۔

"یہ نام و نسب' شناخت اور حوالے میری راہ میں حائل نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ۔

میدان وفا دربار نہیں' یاں نام و نسب کی پوچھ کہاں
عاشق تو کسی کا نام نہیں' کچھ عشق کسی کی ذات نہیں

میں امی کو منالوں گا۔ اُس نے مصمم ارادہ باندھا۔

عجیب بات یہ تھی کہ اس تکلیف دہ انکشاف نے اُس کے دل میں مشعل کے لیے مزید گداز جذبے پیدا کر دیے تھے۔

☆☆☆

"تم ایک دم بے وقوف عورت ہو۔ اتنا خیال نہیں آیا آسیہ کو پولیس کے حوالے کرنے سے پہلے اس کے منہ میں زبان دے دیتیں۔ وہ اُلو کی پٹھی انجانے میں سب کچھ بک گئی۔ میں تو جنازے پہ آئے لوگوں کے ساتھ مصروف تھی۔ میرا خیال تھا' تم معاملہ سنبھال لوگی۔ ابھی تو شکر کرو' بروقت مجھے ریسونگ سسٹم لگانے کا دھیان آ گیا ورنہ بے خبری میں پھنس چکے ہوتے اب تک۔"

میڈم بانو نے بُری طرح عذرا کو جھاڑ پلائی تھی۔ میڈم بانو نے آسیہ کی قمیض کے گلے پر بٹن کی شکل کا ننھا سا ٹیپ ریکارڈ لگایا تھا جو بظاہر دیکھنے میں محض ایک فینسی بٹن ہی لگتا تھا مگر درحقیقت وہ حساس ترین بنیادوں پر کام کرتا تھا اور معمولی سی آواز بھی ریکارڈ کر لیتا تھا۔ ریسونگ سیٹ پر میڈم بانو نے اپنے بندے کو بٹھا دیا تھا۔ اس طرح تھانے میں ہارون اور آسیہ کے درمیان ہونے والی تمام گفتگو سنی جا چکی تھی۔ آسیہ اس بٹن کی حقیقت سے۔ بے خبر تھی۔

میڈم بانو کے تو سُن کر ہوش اُڑ گئے تھے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھیں کہ وہ بظاہر بے ضرر نظر آنے والا بندہ درحقیقت اتنا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔

"جب اصلی گولی پتے سے نکالی تھی تو تمہیں چاہیے تھا' اس کی جگہ زہریلی گولی فٹ کرنے کے بعد اصلی والی ضائع کر دیتیں۔ کمرے میں پھینکنے کی کیا ضرورت تھی۔"

وہ رہ رہ کر عذرا پر طیش کھا رہی تھیں۔ جیسے سارا کیا دھرا اُسی کا ہو۔

"پھینکی نہیں تھی۔ نکالتے ہوئے میرے ہاتھ سے چھوٹ کر اِدھر اُدھر گر گئی تھی۔" وہ خفت و شرمندگی اور پریشانی سے آدھی ہو چلی تھی۔

"اور وہ اس شیطان کی آفت کے ہاتھ لگ گئی۔" وہ فکرمندی سے کمرے میں ٹہلنے لگیں۔

عذرا دل ہی دل میں حیران ہو رہی تھی۔ بھلا اتنی سی بات سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ایک چھوٹی سی گولی میڈم کے لیے خطرہ بن گئی ہے؟ اس سے پہلے تو اُنہوں نے بڑی سے بڑی بات کی پروا نہیں۔ کیا وہ خفیہ کے اس بندے سے اتنی خوف زدہ تھیں۔

"میڈم۔ ہارون تک معاملہ پہنچنے سے کیا نقصان ہو سکتا ہے؟"

"تم نہیں جانتیں' خفیہ کے ایجنٹ کتنے خطرناک ہوتے ہیں۔ پاتال سے بھی خبر لے آتے
۔ ہم پولیس کو اپنی مٹھی میں کر سکتے ہیں مگر خفیہ اداروں سے براہِ راست اُلجھ کر معاملہ نہیں بگاڑ
۔ اگر ہارون نے عدالت میں آسیہ سے بیان دلوا کر گولی والا چکر ثابت کر دیا تو ہمارے لیے
ی جائے فرار نہ بچے گی۔ بہت بُرا ہوا جو اُس تک بات پہنچ گئی۔ خیر میں کل اسلام آباد روانہ
ہی ہوں۔ بگ باس سے بات کروں گی کہ اب کون سی لائن آف ایکشن اختیار کرنی ہے جس
ے ہارون کو کارروائی سے باز رکھا جا سکے۔ حیات خواجہ اور ڈینی کو بلاؤ ذرا۔"

"اُن کا وفادار ملازم ڈینی اُن کے ہمراہ لاہور آیا تھا۔ وہ اسے بطور باڈی گارڈ کے اکثر و
تر اپنے ساتھ رکھتی تھیں۔ دیکھنے میں وہ حبشی نسل سے تعلق رکھتا تھا۔ عذرا کو ایک دفعہ بینا گل نے
زداری سے بتایا تھا کہ وہ میڈم بانو کا برسوں سے اسیر تھا اور عہدِ جوانی میں میڈم نے کئی مرتبہ
ے اپنے حسن و شباب سے نوازا تھا۔ اگر میڈم کہتیں کہ میں نے تمہاری لاش سے گزرنا ہے تو وہ بلا
خیر خود کو گولی مار کر اُن کی راہ میں لیٹ سکتا تھا۔ خدا جانے انتہا درجے کی یہ وفاداری ڈینی کے
انہ جذبات کا شاخسانہ تھی یا غلامانہ فطرت کی۔ یوں لگتا تھا' جیسے وہ پیدا ہی میڈم کی خدمت و
وشنودی کے لیے ہوا ہے۔ حکم کا بندہ۔ ایک جاں نثار عاشق۔

"آسیہ کو عدالت تک نہیں پہنچنا چاہیے۔" میڈم نے پُراسرار انداز میں ڈینی اور حیات خواجہ
ی طرف دیکھا۔ وہ ایک سیکنڈ میں بات کی تہہ تک پہنچ گئے۔

"اُسے روکنے اور اُس کی زبان بند کرنے کا ایک ہی طریقہ رہ گیا ہے۔" دونوں مؤدب کھڑے رہے۔ وہ جانتے تھے کہ میڈم کون سے طریقے کی بات کر رہی ہیں۔

"دو چار ہزار دے کر تھانے کے عملے میں سے کسی سپاہی کی مٹھی گرم کرنے کے بعد آسیہ
ے علیحدگی میں ملاقات دشوار نہیں ہو گی۔"

میڈم بانو نے دراز کھول کر احتیاط سے ایک سرنج نکالی جس کے اندر زردی مائل گاڑھا
حلول بھرا ہوا تھا۔

"یہ بالکل نئی چیز ہے۔ سائنائیڈ سے بھی زیادہ سریع الاثر ہے۔ اس زہر میں ڈوبی ایک
اریک سی سوئی جسم میں چبھنے کے پندرہ منٹ بعد ری ایکشن شروع کر دیتی ہے اور آدھ گھنٹے بعد
ریض کی حالت ایسی ہو جاتی ہے جیسے اُسے ہارٹ اٹیک ہوا ہو۔ پولیس آسیہ کی اس حالت کے
یشِ نظر اُسے پولیس سرجن کے پاس اسپتال لے جائے گی جہاں ایک آدھ گھنٹے بعد وہ ہمیشہ کے

لیے دنیا سے رخصت ہو جائے گی اور ڈاکٹر رپورٹ اس بات کی تصدیق کرے گی کہ موت شدید ذہنی صدمے کے باعث ہارٹ فیل ہو جانے کے بعد ہوئی۔ کوئی مائی کا لال اس واردات کو قتل ثابت نہیں کر سکتا۔ اب کی بار میں نے بہت پکا کام کیا ہے۔''

میڈم کے چہرے پر ایک سفاک اور بے رحم مسکراہٹ جھلک رہی تھی۔

''آپ بے فکر رہیں میڈم۔ آسیہ کل صبح کا سورج دیکھنے کے لیے زندہ نہیں رہے گی۔'' ڈیزی نے متانت سے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے۔ جاؤ۔''

کمرا خالی ہونے کے بعد وہ بستر پر گر گئیں اور مشعل کے متعلق سوچنے لگیں۔

وہ حسین و جمیل ساحرہ جس کی رعنائی و زیبائی بڑے بڑوں کا زہر پانی بنا سکتی تھی۔

خوب صورت حریری پروں والی دلکش چڑیا جس کے قابو میں آ جانے سے ہارون کی ساری جوابی کارروائیوں کو صفر پر لایا جا سکتا تھا۔

وہ اپنے ذرائع سے معلوم کر چکی تھیں کہ ہارون کے اُس سے خصوصی مراسم استوار رہیں۔

☆☆☆

یہ آئی بی کے سیکرٹ سیکشن کا آفس تھا جو سیکرٹ ایجنسی کی مرکزی عمارت سے ہٹ کر ایک کوٹھی میں قائم کیا گیا تھا اور اس سیکشن میں ایجنسی کے چیدہ افراد کو شامل کیا گیا تھا۔ ہارون ڈائریکٹر صاحب کے سامنے بیٹھا مستعدی سے مینا گل کیس کی تفصیلات بتا رہا تھا۔ اُس کے سامنے دو فائلیں تھیں۔ ایک پر مینا گل اور دوسری پر میڈم بانو کا نام درج تھا۔

''سر میڈم بانو کیس کے بالکل آغاز سے ہی میرے نزدیک 'براؤن پرسن' رہی ہے مگر اب مینا گل کے قتل کے بعد ساری صورتِ حال واضح ہو گئی ہے اور میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ 'بلیک پرسن' ہے۔ آپ ثبوت کے طور پر یہ فائلیں پڑھ سکتے ہیں۔''

''وہ تو سب ٹھیک ہے مگر ہارون' مجھے افسوس ہے کہ فی الحال تمہاری محنت کا خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکل سکتا۔'' ڈائریکٹر صاحب پیشانی مسل کر فکر مندانہ لہجے میں گویا ہوئے۔ اُن کے لہجے کی بددلی ہارون کو چونکانے لگی۔

''مگر کیوں سر۔'' وہ چیں بجبیں ہوا'' مینا گل کا قتل اور آسیہ کی پولیس کی حراست میں پُراسرار موت کے بعد اسے 'بلیک پرسن' ثابت کرنے میں کیا رکاوٹ حائل ہو سکتی ہے؟''

یہ اصطلاح ایجنسیاں استعمال کرتی ہیں۔ وہ شخص جس کے بارے میں شبہ ہو کہ وہ ملک و قوم

لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے اُسے ''براؤن پرسن'' کہا جاتا ہے اور جب یہ شبہ یقین میں بدل ئے تو اُسے ''بلیک پرسن'' کہا جاتا ہے اور اگر ''براؤن پرسن'' کے متعلق ثبوت نہ مل سکے اور شکوک ات ختم ہو جائیں تو اسے ''وائٹ پرسن'' قرار دے کر اُس کی فائل بند کر دی جاتی ہے۔

تم نے بلاشبہ اس کیس میں بہت جان لڑائی ہے مگر یہ شواہد اتنے ٹھوس بہر حال نہیں ہیں کہ م بانو جیسی بارسوخ عورت کو ''براؤن پرسن'' سے ''بلیک پرسن'' ثابت کرنے کے لیے کافی ت ہو سکیں۔ اس ضمن میں ابھی مزید تحقیقات کی ضرورت ہے۔ علاوہ ازیں اس کیس میں ''بہت ر'' سے دباؤ ڈالا جا رہا ہے۔ اس عورت کی پہنچ تمہارے اندازوں سے بھی بڑھ کر ہے۔ ملکی اور لکی ہر دو سطح پر اس کی پشت پناہی کرنے والے ہاتھ بہت مضبوط ہیں۔''

''سر یہ قومی سلامتی کا معاملہ ہے اور حکومت کو اس ضمن میں سنجیدگی سے نوٹس لینا چاہیے۔'' وہ شان ہو گیا۔

ڈائریکٹر صاحب نے سگریٹ کا کش لے کر اُسے ایش ٹرے میں مسلا اور پیشانی پر آئے ل کو ایک طرف کرتے ہوئے پھیکے سے انداز میں مسکرائے۔

''اب وہ وقت آ گیا ہے ہارون میاں کہ ہر پاکستانی کو نماز کے بعد دعا کرنی چاہیے۔ اے ا ہمارے سیاست دانوں کو ہدایت کی روشنی عطا فرما۔''

اُن کے لہجے میں دکھ تھا۔

سنتے ہیں کہ اپنے ہی تھے گھر لوٹنے والے
اچھا ہوا میں نے یہ تماشا نہیں دیکھا

''شاعر اس لحاظ سے خوش قسمت رہا مگر ہماری مجبوری یہ ہے کہ تماشا دیکھنے کے باوجود مہر بہ ب رہنے پر مجبور ہیں۔ ہم ملک کے کرتا دھرتا کو حسن و شباب کی ڈگڈگی پر ناچتے دیکھ رہے ہیں اور ہے ہیں۔ اقتدار کے اعلیٰ ترین ایوانوں کی شخصیات ان عورتوں کی مٹھی میں ہیں۔ وہ بزور ناز و ادا جو ہاں ان سے منوا سکتی ہیں۔ حکومتی مہرے کاٹھ کے اُلّو بنے ہوئے ہیں مگر ہارون تمہیں مایوس نے کی ضرورت نہیں ہے۔ جس طرح ظلم حد سے گزر جانے کے بعد مٹ جاتا ہے اسی طرح بے ا اور خوابِ غفلت میں ڈوبے ایوانوں میں بھی ایک دن حق و انصاف کی شنوائی ہو گی۔ میرا دل اہے کہ رُت بدلنے والی ہے۔ صبح طلوع ہونے والی ہے۔ سر دست ہم مجبور سہی مگر ہمیشہ تو ایسا ملا ہو گا۔ تم خاموشی سے مزید حقائق جاننے کی کارروائی جاری رکھو۔ کیس کی جڑ تک پہنچ کر اسے مضبوط بنا دو کہ پھر کوئی دباؤ اور کوئی سقم اسے ر، کنے یا ٹالنے کا سبب نہ بن سکے۔''

ہارون شکستہ قدموں سے دفتر سے نکلا تھا۔ اتنے ماہ کی ان تھک جدّ وجہد تا حال رنگ نہیں لا رہی تھی۔ اس کی گاڑی کا رخ اپنے آئی ایٹ والے فلیٹ کی طرف تھا۔ ابھی پولی ٹیکنیک کالج کی روڈ کا ٹرن لیا تھا کہ سڑک کے کنارے گھبرائی سہمی کھڑی ہوئی لڑکی تیزی سے سڑک کے درمیان میں آ گئی۔ لامحالہ ہارون کو گاڑی روکنا پڑی۔

"پلیز' میری مدد کیجئے۔ کچھ بدمعاش لڑکے میرے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ اتفاق سے کوئی سواری بھی نہیں ملی ابھی تک ......" وہ تیزی سے ڈرائیونگ سیٹ کی طرف آئی تھی۔ اُس کا لہجہ بوکھلایا ہوا تھا۔ ہارون نے بغور اُس کا جائزہ لیا۔ اُس کی عمر پچیس چھبیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ نیلی شلوار قمیض پر سیاہ کاٹن کا دوپٹہ جو سر پر سلیقے سے جما ہوا تھا۔ اُس کی رنگت سرخی مائل گندمی تھی اور جسم بھرا بھرا تھا۔ مجموعی طور پر وہ ایک پُرکشش اور حسین لڑکی دکھائی دیتی تھی۔ انداز بتاتے تھے کہ اس کا تعلق کسی شریف اور وضع دار گھرانے سے ہے۔

"آپ کہاں سے آ رہی ہیں اور کہاں جانا ہے؟" وہ گاڑی بند کر کے نیچے اُتر آیا اور متجسّسانہ نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

"میں پولی ٹیکنیک کالج میں پڑھاتی ہوں۔ میرا گھر آئی ایٹ فور میں ہے۔ اسٹاپ پر کھڑی تھی۔ جب دو موٹر سائیکل والے یہاں سے گزرے۔ اکیلی لڑکی دیکھ کر وہ سیٹیاں بجاتے ہوئے اپنے رستے پر جانے کے بجائے دوبارہ واپس مُڑے' اب تک وہ تین چار چکر لگا چکے ہیں۔ پلیز ہارون صاحب۔ پہلے یہاں سے نکلیے۔ میں آپ کو راستے میں تفصیلاً بتا دوں گی۔ مجھے ڈر ہے' وہ پھر ادھر آ جائیں گے۔"

"او کے' آئیں۔" ہارون نے چونک کر ایک مرتبہ پھر اُس کی شکل دیکھی اور فرنٹ ڈور کھول دیا۔

"شکریہ۔" لڑکی کے گاڑی میں بیٹھتے ہی ہارون نے ایکسی لیٹر دبا دیا۔ راستے میں وہ سادگی سے اپنے اور اپنی فیملی کے متعلق بتاتی رہی اور ہارون سے پوچھتی رہی۔

"آپ مجھے بہت مختلف اور معقول انسان لگے ہیں۔" وہ گردن موڑ کر ستائشی انداز میں بولی۔ دوسرے ہاتھ سے پھسلتے دوپٹے کو سر پر جما رہی تھی۔

"اچھا۔" وہ ہونٹ دبا کر مسکرایا' "پھر تو ایک معقول اور منفرد بندے کے ہاتھ کی چائے پینے میں آپ کو کوئی مضائقہ نہیں ہوگا۔"

ہارون نے گاڑی اپنے فلیٹ کے آگے روک دی۔

"کیوں نہیں۔" وہ کھل اُٹھی۔

"آپ کے گھر والے دیر سے پہنچنے پر پریشان تو نہیں ہوں گے؟" ہارون اس کی سمت کا دروازہ کھولتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"نہیں۔ ایک آدھ گھنٹے کی تاخیر سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ علاوہ ازیں میں آپ کے ہاں سے فون کر دوں گی۔"

"اچھی بات ہے۔" ہارون اُسے اپنے فلیٹ میں لے آیا اور ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا۔ خود اپنے بیڈ روم میں چلا گیا۔ پانچ منٹ بعد مسکراتا ہوا واپس آ گیا۔

"آپ یہاں اکیلے رہتے ہیں۔" لڑکی کا لہجہ مطمئن اور سرشار سا تھا۔

"جی ہاں۔" وہ مسکرا کر اُسے دیکھنے لگا۔

"ارے' میں نے آپ کو اپنا نام تو بتایا ہی نہیں۔" لڑکی نے ایک ادا سے اپنی پیشانی پر ہاتھ مارا۔

اس کی ضرورت نہیں ہے ڈیئر۔" وہ اُس کے قریب آ گیا "تمہارا نام رومانہ ہے۔ میں جانتا ہوں۔"

"آ۔ آپ کیسے جانتے ہیں۔" وہ اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ دہشت سے اُس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں مگر ہارون نے جواب دینے سے پہلے ہی اس کے مقابل آ کر اُس کے گلے پر لگا بٹن نما آلہ کھینچ لیا تھا۔

"جی تو مس رومانہ۔ اب آپ اپنی کارروائی کا آغاز کیجئے' حسب ہدایت۔" وہ سنجیدگی سے گویا ہوا۔

"ناز و ادا دکھا کر مجھے تسخیر کیجئے۔ میری قوت برداشت آزمائیے۔ اگر یہاں کچھ تامل ہے تو بیڈ روم میں تشریف لائیے۔ ویسے پلاننگ اچھی تھی۔ میری داد اپنی میڈم تک ضرور پہنچا دیجئے گا۔"

ہارون نے پشت پر رکھا ہاتھ سامنے کیا تو رومانہ کا سانس اٹک گیا۔ یہ ایک جدید ساخت کا وڈیو کیمرہ تھا جسے ہارون کے بیڈ روم میں خفیہ جگہ فٹ کیا گیا تھا۔ بٹن نما آلہ آواز ٹیپ کرتا اور وڈیو کیمرہ بیڈ روم کے قابل اعتراض مناظر کی عکس بندی کرتا۔ رومانہ کو اتنے شریفانہ حلیے میں اسی لیے بھیجا گیا تھا تا کہ ہارون کو شک نہ ہو۔ میڈم بانو اس کی فطرت جان گئی تھیں کہ اسے ظاہری چمک دمک اور حسن و شباب کی جھلک سے زیرِ دام نہیں لایا جا سکتا۔ اگر ایسا ہوتا تو مینا گل کب کا اسے شکار

کر چکی ہوتی۔ اسی لیے یہ فرضی ڈراما رچایا گیا تھا تاکہ ہارون اُس کی سادگی و شرافت سے مطمئن ہو کر اُسے اپنے ہمراہ فلیٹ میں لے جانے میں تامل نہ کرے۔ ایک بار رومانہ اسے اپنی معصومیت سے کام لے کر قریب لے آئی تو پھر اپنی مرضی کے نتائج حاصل کرنا قطعی دشوار نہیں ہوگا۔

''میڈم بانو تمہیں میرے پاس بھیجنے سے پہلے میرے بارے میں بتانا بھول گئیں ورنہ شاید میں اتنی جلدی اندازہ قائم نہ کرسکتا۔'' وہ اطمینان سے بولا۔

''تمہیں کس طرح پتا چلا؟'' رومانہ کا لہجہ کھوکھلا اور اعتماد سے خالی تھا۔

''اُسی وقت اسٹاپ پر کھڑے کھڑے میں تمہاری اصلیت جان گیا تھا۔ یاد کرو' تم نے کہا تھا 'ہارون صاحب پلیز' میری مدد کیجیے۔ تمہیں میرا نام کیسے پتا چلا جبکہ یہ ہماری پہلی ملاقات تھی اور ابھی نام بتانے کی نوبت بھی نہیں آئی گی۔''

''اوہ!'' رومانہ اُس کی زیرک حس کی قائل ہوگئی' ''مگر میرا صحیح نام کیسے معلوم ہوا۔ کیا تم کوئی غیب دان ہو؟''

''استغفراللہ! ہم اس لائق کہاں۔ غیب کا علم تو بس اُسی ایک ہستی کو ہے۔'' ہارون نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ ''افراح نے مجھے لال کوٹھی کے ایک ایک فرد کا حلیہ تفصیلاً بتایا تھا۔''

''افراح......؟'' رومانہ کے حلق میں کچھ پھنس گیا۔

''تو وہ تمہاری کزن تھی؟ ایک خوش قسمت اور بہادر لڑکی۔'' وہ خود کلامی سے کھوئے کھوئے انداز میں بولی۔ ''اس نے کہا تھا میں مر جاؤں گی مگر میڈم بانو کو اُس کے مقصد میں کامیاب نہیں ہونے دوں گی اور میں نے کہا تھا' چلو تم بھی یہیں ہو اور ہم بھی۔ یقین آ گیا' معجزے آج بھی رونما ہوتے ہیں۔''

''تم ایک سمجھدار لڑکی معلوم ہوتی ہو۔ افراح نے مجھے بتایا تھا۔ دیکھو اگر میرے ساتھ تعاون کرو گی تو میڈم بانو کے چنگل سے بہ آسانی نکل سکتی ہو۔ جو کچھ اُس کے متعلق جانتی ہو' سب بتا دو۔'' ہارون جیب سے اپنا ٹیپ ریکارڈر نکالنے لگا۔ رومانہ نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر اپنی ہتھیلی پر نظر جما دی۔

''اُس کے چنگل سے نکل کر کہاں جاؤں گی۔ باہر بھی تو پناہ نہیں ہے۔ اب مجھے کون قبول لے گا۔ ماں باپ' رشتے اور رواروں کے لیے میں مر چکی ہوں اور مردوں کے اس معاشرے میں ایک جسم فروش کال گرل کے لیے ابھی تک عزت کی کوئی نشست خالی نہیں ہوئی۔ میرا ''اندر باہر'' اتنا مسخ ہو چکا ہے کہ اپنی اصلی صورت خود بھی نہیں پہچان سکتی۔''

''جزا سے مایوس ہو کر گناہ کیے جانا' بذاتِ خود ایک عظیم گناہ ہے۔ بہت سے لوگ ایسے ہیں جو معاشرے کے مرّوجہ معیار پر پورا نہیں اُترتے مگر اس کے باوجود وہ معاشرے کو سنوارنے اور اس کی غلاظت دور کرنے میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔'' ہارون کے ذہن میں مشعل کی شبیہہ اُتر آئی تھی۔ وہ گناہ کی پیداوار تھی مگر سن بلوغت کو پہنچ کر خود اس گناہ میں گرنے کے بجائے گرتوں کا سہارا بن گئی تھی۔ وہ کوڑے کے ڈھیر پر رلتی ہوئی انسانیت کو سینے سے لگا کر اپنی محافظت میں لیتی تھی۔ معصوم زندگیوں کی بقا کے لیے سرگرم عمل تھی۔ جو محرومی اور بے نامی اسے ورثے میں ملی تھی' اس سے آنے والی نسل کو بچانے کے لیے جدّ وجہد کر رہی تھی۔

''میں تمہیں کچھ نہیں بتا سکتی اور بتا بھی دوں تو ٹھوس ثبوت کے بغیر یہ معلومات تمہارے لیے بے کار ثابت ہوں گی۔'' ہارون نے محسوس کیا کہ اس کا انداز فطری اور سچا تھا۔ وہ مکر نہیں کر رہی تھی۔ تشدد کر کے بھی اُس سے مطلوبہ معلومات اُلگوائی نہیں جا سکتی تھیں۔ وہ تو میڈم بانو کا ایک معمولی سا مہرہ تھی۔ اندر کے رازوں سے سرسری سی واقفیت رکھتی تھی' وہ بھی محض زبانی کلامی۔ ثبوت کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

''او کے۔ تم جا سکتی ہو۔'' بالآخر ہارون نے گہری سانس لے کر کہا۔

☆☆☆

''نیک کام میں دیر کیسی ماسی۔ تم بسم اللہ کرو۔ مجھ سے یا آیا اماں سے اجازت کی تمہیں ضرورت ہی نہیں تھی۔ خیراں تمہاری بیٹی ہے' تم جو بھی فیصلہ کرو گی اپنی بیٹی کی خوشی و سکون کے لیے کرو۔ یوں بھی رمضو ایک محنتی اور ایماندار ورکر ہے۔ مجھے یقین ہے' وہ خیراں کو خوش رکھے گا۔ بابا صاحب سے مشورہ کر کے شادی کی کوئی سی تاریخ مقرر کرلو۔ باقی انتظامات یہاں کوٹھی میں ہو جائیں گے۔ تم فکر نہیں کرو۔''

مشعل بہت نرمی سے ماسی سے مخاطب تھی۔ رمضو نے خیراں کا ہاتھ مانگا تھا۔ ماسی مشعل کو بتا کر اُس کی رائے لینے آئی تھی۔

''خدا آپ کو خوش رکھے بی بی جی۔ شہزادیوں کی طرح رکھا ہے آپ نے اُسے۔ مجھ سے زیادہ تو وہ آپ کی ہے پھر آپ کی اجازت کیوں نہ لیتی۔'' ماسی دعائیں دیتی اُٹھ گئی اور پردے کے پیچھے کھڑی خیراں کی آنکھوں میں ہزاروں چراغ جل اُٹھے تھے' اُس نے جھٹ لاؤنج میں بیٹھی دلشاد کو خوشخبری خبر سنائی۔

''بہت بہت مبارک ہو۔'' دلشاد نے دلی مبارکباد دی مگر ذہنی طور پر وہ بہت اُلجھی ہوئی

تھی۔ کچھ دنوں سے یہ حال تھا کہ قدم رکھتی کہیں تھی تو پڑتا کہیں تھا۔ اس دن مشعل کی عدم موجودگی میں جب ہارون نے آپا اماں کو مجبور کر کے اُس کے متعلق تفصیلات معلوم کی تھیں۔ اُسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ اتنی پاکیزہ، اتنی معصوم و سادہ سی لڑکی کا ماضی اتنا بھیانک تھا۔ اتنا اذیت ناک! مشعل کی سابقہ ذہنی و جذباتی کیفیت کی ایک ایک گرہ کھل گئی تھی۔

دلشاد کا جی چاہا، اس کومل سی فرشتہ سیرت گڑیا کا ہر دکھ اپنے کلیجے میں سمو لے۔ دوسروں کے لیے مشعلیں جلانے والی خود کتنے اندھیرے میں تھی۔

فون کی گھنٹی نے اُسے خیالوں کی تاریک وادی سے باہر نکالا تھا۔

"باجی! آپ کا فون ہے۔" وہ فون سن کر مشعل کے کمرے میں آ گئی۔ وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"کون ہے؟"

"وہی جو پہلے بھی دو تین مرتبہ فون کر چکی ہیں۔ میڈم بانو۔" دلشاد نے سنجیدگی سے جواب دے کر اُس کا چہرہ دیکھا۔ مشعل نے نچلا لب دانتوں تلے دبا لیا اور کچھ سوچنے لگی۔ ابھی دو دن پہلے ہارون نے اسے اپنی ناکامی کی اطلاع دی تھی۔

"مکمل ثبوت حاصل کیے بغیر ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ اس وقت تک میڈم بانو اپنا شیطانی فعل جاری رکھنے کے لیے آزاد ہے۔" ہارون نے دل گرفتگی سے کہا تھا۔

وہ فون تک آئی۔ ریسیور اُٹھانے سے پہلے اچانک ایک خیال اُس کے ذہن میں فلیش کی طرح کوندا۔

مشکل ہیں اگر حالات وہاں، دل دے آئیں جاں بیچ آئیں
دل والو کوچۂ جاناں میں کیا ایسے بھی حالات نہیں
یہ بازی عشق کی بازی ہے جو چاہو لگا دو ڈر کیسا
گر جیت گئے تو کیا کہنا، ہارے بھی تو بازی مات نہیں

فیض صاحب کے ان اشعار نے گویا اس کے تصور میں آ کر اس کے خیال کی حوصلہ افزائی کی تھی۔ اس نے بڑے عزم سے ریسیور تھام لیا۔

"ہاں بھئی، مشعل جانو! تم نے کیا سوچا پھر۔ دیکھو بھئی، مینا گل کے حوالے سے اقدام نہیں کیا ورنہ آج تم یہاں ہمارے پہلو میں ہوتیں۔ ہم چاہتے ہیں، تم اپنی رضامندی سے چل کر ہم تک آؤ۔ اب دیکھو ناں۔ اگر تم تعاون نہیں کرو گی تو خواہ مخواہ اُلجھنیں بڑھیں گی۔ مینا گل کا ماضی، مع تمہاری اصلیت کے اخبارات میں شائع ہو جائے گا۔ ہو سکتا ہے، تمہاری فیکٹری ورکرز ایسی

لہ کے ساتھ کام کرنے پر راضی نہ ہوں جو ماں کے ناجائز تعلقات کے سبب وجود میں آئی ہے پھر وہ جو تم سوشل ورک کر رہی ہو۔ بھئی ادارہ اطفال کھول کر جس کو معززین خوشی خوشی فنڈ دیتے ں۔ ہو سکتا ہے وہ بھی بند ہو جائے۔ اس کے برعکس اگر تم ہمارے ساتھ تعاون کرو گی تو ہر چیز جوں توں سلامت رہے گی، تمہاری معاشرتی عزت دار حیثیت، فیکٹری، ادارہ اور خود تم بھی۔"

بظاہر نرم و لطیف اور دوستانہ لہجے میں کی جانے والی گفتگو میں جو سنگینی و دھمکی پوشیدہ تھی، اسے شعل بخوبی محسوس کر سکتی تھی۔

"میں کافی دنوں سے آپ کی آفر پر غور کر رہی تھی۔ میرا خیال ہے، آپ کا ساتھ دینے میں وئی مضائقہ نہیں۔ یوں بھی میرا کون ہے، آگے پیچھے۔ نہ خاندان، نہ دوست عزیز اور نہ خوش نامی۔ ہا ہارون تو اُس کی ماں میری اصلیت جان کر تا عمر مجھے بہو نہیں بنائے گی۔ یوں بھی اُس کی کزن راح کے ہوتے ہوئے میری دال نہیں گل سکتی۔ میرے آپ کے ساتھ شامل ہونے کا ایک فائدہ بھی ہو گا کہ آپ کو ہارون کو قابو کرنا آسان ہو جائے گا۔ وہ مجھ پر اندھا اعتماد کرتا ہے اور میں ا ہوں تو اُس سے کچھ بھی منوا سکتی ہوں۔"

مشعل کا لہجہ نارمل تھا۔ میڈم بانو ذرا ذہانت سے کام لیتیں تو یہ جان سکتی تھیں کہ اچانک پتھر دم ہوا ہے تو اس کے پیچھے یقیناً کوئی مقصد ہو گا مگر وہ اُس کی رضامندی پا کر اتنی مسرور تھیں کہ کچھ ورنہ سوچ سکیں۔

"میں کل آپ کی کوٹھی میں آؤں گی پھر تفصیلی بات ہو گی۔"

مشعل فون رکھ کر مڑی تو دروازے پر مبہوت کھڑی آپا اماں کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

"یہ تم کیا کرنے جا رہی ہو بیٹی۔ جانتے بوجھتے ہوئے آگ میں کود رہی ہو۔" آپا اماں کا بجہ متوحش تھا۔

"کسی نہ کسی کو تو رسک لینا ہی ہو گا آپا اماں۔ بہت سی جانوں اور عزتوں کا قرض ہے اس ورت پر۔ بعض اوقات دشمن کو ختم کرنے کے لیے اُس کے کیمپ میں داخل ہونا پڑتا ہے۔"

"وہ بہت خطرناک عورت ہے بیٹی۔" آپا اماں خوف زدہ تھیں۔

"یہ تو ہم سب کو پتا ہے۔ اصل مسئلہ اُس کی "خطرناکی" کے ثبوت حاصل کرنا ہے۔"

"میں تمہیں اس حماقت کی اجازت نہیں دوں گی۔ بڑے بڑے اُس کو پکڑنے میں ناکام رہے ہیں، تم تو پھر ایک کمزور سی لڑکی ہو۔"

"تو کیا ہوا آپا اماں، بجھ تو جائیں گے مگر صبح تو کر جائیں گے۔" وہ ان کے شانے سے لگ

گئی'' فیض صاحب فرماتے ہیں۔

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی ہے' اس جان کی کوئی بات نہیں

اس کے ہونٹوں پر ایک خوب صورت ہی مسکراہٹ ٹھہر گئی تھی۔

''اتنا بے کار' بے نام ونشاں وجود وطن کی بیٹیوں کی حرمت محفوظ رکھنے کے لیے کام آ جائے تو کیا ہی بات ہے۔ جینے پر نہ سہی اپنے مرنے پہ ہی فخر کر سکیں۔''

مگر آپا اماں قطعی قائل نہ ہو سکیں۔ مشعل انہیں مناتی رہی۔ بالآخر انہیں چپ رہنا پڑا۔

''آپ کو میری جان کی قسم! آپ ہارون کو کچھ نہیں بتائیں گی۔ میں اپنی نگرانی پر مامو آدمیوں کو جُل دے کر میڈم بانو کی کوٹھی پہ جاؤں گی۔ آپ نے ہارون کو میری سرگرمیوں کی اطلاع نہیں دینی۔ وہ مجھے کچھ نہیں کرنے دے گا۔''

☆☆☆

''رمضو' بہت بہت مبارک ہو' شادی کی اور بھئی' ہمیں بلایا ہی نہیں۔ اکیلے اکیلے بیاہ ر لیا۔''

ہارون بڑے شریر انداز میں جھینپتے ہوئے رمضو کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر چھیڑ رہا تھا۔ بڑے دنوں بعد ادارے میں آیا تھا۔

''وہ جی' صاحب جی' بابا صاحب کے کہنے پر سادگی سے نکاح کر دیا گیا تھا۔ ابھی پرسوں ولیمے کی دعوت ہو گی' بی بی جی کی کوٹھی پر۔ آپ ضرور آیئے گا جی۔ خیراں بھی آپ کا بہت پوچھ رہی تھی۔''

''یہ منہ دیکھے کی دعوت ہم ایسے قبول نہیں کر سکتے۔'' اس نے کپا سا منہ بنا کر رمضو کو تنگ کیا۔ ساتھ ساتھ عمارت کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔

''نہیں جی۔ صاحب جی' آپ ناراض نہ ہوں۔'' رمضو دوڑ کر اُس کے پیچھے آ گیا اور ملتجی لہجے میں گویا ہوا۔ ہارون کو ہنسی آ گئی۔

''ارے بھئی' میں مذاق کر رہا تھا۔ آئیں گے' کیوں نہیں' ضرور آئیں گے۔ تمہیں شادی کا تحفہ بھی تو دینا ہے۔''

''میرا تحفہ تو جی خیراں کا ساتھ ہے۔'' رمضو کے لہجے کی سرشاری نے ہارون کو پتھر کا بنا دیا۔ اس کا شگفتہ موڈ برف ہو گیا۔

وہ دو تین مرتبہ لاہور کال کر کے امی سے بات کر چکا تھا مگر اُن کی ناں ہاں میں نہیں بدلی تھی۔

''تم جان مانگ لو ہارون مگر وہ بات نہ منواؤ جو میرے بس میں نہیں ہے۔'' وہ بُری طرح مضطرب اور پریشان تھا۔ آج وہ ٹھان کر آیا تھا کہ مشعل سے ''ہاں'' کروا لے گا۔ ایک مرحلہ اُس کی رضامندی بھی تو تھا۔

''بی بی کہاں ہیں؟'' اس کے لہجے میں سنجیدگی در آئی۔ وہ گھر سے ہو کر آیا تھا۔ آپا اماں نے بتایا تھا کہ ابھی ادارے سے نہیں لوٹی۔

''اپنے کمرے میں ہیں جی۔''

وہ مشعل کے کمرے میں داخل ہوا تو بابا صاحب کو اُس سے مصروفِ گفتگو پایا۔

''آؤ بیٹے! کیسے ہو تم۔ بڑے دنوں بعد نظر آئے۔ اچھے تو رہے؟'' بابا صاحب کا انداز ہمیشہ کی طرح مشفقانہ اور محبانہ تھا۔ ہارون نے غور سے اُن کی صورت دیکھی۔ ایک جھماکا سا ہوا۔ شک تو اُسے اُسی دن ہو گیا تھا' جب اُنہیں اخبار میں چھپی مینا گل کی تصویر کا جائزہ لیتے دیکھا تھا۔ اب مکمل حالات جان کر اس نتیجے تک پہنچنے میں کوئی دشواری نہیں رہی تھی کہ وہی علی مراد ہیں۔

صنیہ کے بھائی اور اُس کے ماموں۔ اُس کے دل میں ایک لہر سی اُٹھی۔

بے ساختہ اُس کے لب کھلے مگر پھر مشعل کی موجودگی کے باعث بند بھی ہو گئے۔ احتیاط ضروری تھی۔ اس نے سوچا' وہ علیحدگی میں بابا صاحب سے تفصیلی بات کرے گا۔ ہو سکتا ہے' اُس کا اندازہ غلط ثابت ہو۔ سر دست اسے دلشاد کے والدین کے بارے میں مشعل کو آگاہ کرنا تھا۔ اس نے اپنے ایس ایچ او دوست طارق رحمٰن سے کھوج لگانے کی درخواست کی تھی اور آج دوپہر جب وہ تھانے کا چکر لگانے گیا تو طارق رحمٰن معلومات اکٹھی کر چکا تھا۔

''دلشاد کے والدین اور گھر کا سراغ مل گیا ہے۔'' بابا صاحب کے جانے کے بعد اُس نے مشعل کے مقابل کرسی سنبھالتے ہوئے اطلاع دی۔

''دونوں کو پچھلے ہفتے سات سال کی سزا سنائی گئی تھی۔ آج کل جیل میں بند ہیں۔''

''کیا مطلب......؟'' مشعل جھٹکے سے سیدھی ہو گئی۔

''ایف سیون کے سامنے والی کچی بستی میں گھر ہے دلشاد کا۔ اُس کا چرسی اور نکھٹو باپ کرم داد اپنی بیوی زرینہ سے عصمت فروشی کا دھندا کرواتا تھا' اسی سے گزر بسر ہوتی تھی۔ پچھلے دنوں پولیس نے چھاپا مارا۔ کرم داد بیوی کے گاہک کے ساتھ ساتھ خود اپنے لیے بھی ایک افغانی لڑکی کو

پکڑ لایا تھا۔ دونوں جوڑوں کو قابل اعتراض حالت میں گرفتار کر کے ان کے خلاف زنا کا مقدمہ درج کیا گیا۔''

''اور دلشاد کے بہن بھائی......؟'' مشعل نے از حد افسوس سے دریافت کیا۔

''گیارہ بارہ برس کا پو محلے کا بدمعاش بنا ہوا ہے۔ وہ بھی باپ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے چرس پینے لگا ہے۔ باقی بچے آس پڑوس میں رُل رہے ہیں۔ زرینہ پر ایک اور کیس بھی ہے۔ ڈیڑھ برس قبل ناجائز تعلقات کی پاداش میں اُس کے ہاں ایک بچہ پیدا ہوا تھا جسے کرم داد کے مجبو کرنے پر وہ راتوں رات تمہارے ادارے کے باہر گیٹ پر چھوڑ گئی تھی۔ انسپکٹر طارق رحمٰن کہہ ر تھا' وہ تفتیش کے لیے آج یا کل کوئی بندہ تمہارے پاس بھیجے گا۔'' ہارون نے تفصیل بتائی۔

''ڈیڑھ برس میں جانے کتنے بچے ملے ہیں ادارے کو۔ کسی ایک کی شناخت کیسے کی جا سکا ہے۔'' وہ آزردگی سے بولی۔ ''یاد آیا۔ گل خان نے ایک صبح گیٹ کے آگے سے ایک بچہ اُٹھا تھا۔'' وہ چونک سی گئی۔ ''بابا صاحب نے اُس کے کان میں اذان دے کر اُسے مسلمان کیا تھا۔ م نے اس کا نام فاروق رکھا تھا۔ دلشاد اُس سے خصوصی لگاؤ رکھتی ہے۔ وہ اُس سے بہت ہلا ہوا ہے شاید خون کی تاثیر تھی جو دلشاد کو بے ساختہ اُس کی طرف کشش کرتی تھی۔''

''ابن آدم کی زندگی کتنی سستی ہو گئی ہے مشعل۔ انسپکٹر طارق مجھے بتا رہا تھا کہ کل شام لوگ آئی نائن کے جنگل کی سائیڈ سے گزر رہے تھے' جب انہوں نے جنگل کے بیچوں بیچ ایک ما اور اُس کی سترہ سالہ بیٹی کو نوزائیدہ بچے کا گلا گھونٹتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا۔ ماں اپنی نو حاملہ بیٹی کو لے کر جنگل میں آ گئی تھی۔ وہیں بیٹی نے بچے کو جنم دیا اور اس کے فوراً بعد گناہ چھپا کے لیے اُسے ہلاک کر دیا۔ ایک گناہ کے بعد دوسرا گناہ سر لے لیا۔ ماں اپنی بیٹی کو اور بیٹی جوانی نہ سنبھال سکی۔ نتیجتاً جو زندگی وجود میں آئی' اُسے قتل کر کے دونوں نے انسانیت کا جنازہ بھی نکا دیا۔ عزت کا تو نکل ہی چکا تھا۔'' ہارون کا چہرہ جوش غیرت سے تمتما اُٹھا۔

مشعل کے دل کے دکھتے ہوئے ریشوں کی طنابیں کھل گئیں۔ اس نے مجرمانہ سے اند میں سر جھکا لیا تھا' جیسے یہ بھی اسی کا قصور ہو۔

خاک میں ڈھونڈتا پھرتا ہوں نہ جانے کس جگہ
کھو گئی ہیں مری دونوں آنکھیں
تم جو واقف ہو بتاؤ کوئی پہچان مری
اس طرح ہے کہ ہر اک رگ میں اُتر آیا ہے

موج در موج کسی زہر کا قاتل دریا
جانے کس موج میں غلطاں ہے کہاں دل میرا
ایک پل ٹھہرو کہ اس پار کسی دنیا سے
برق آئے مری جانب ید بیضا لے کر
اور مری آنکھوں کے گم گشتہ گہر لوٹا دے

''ہارون۔'' دفعتاً اُس نے اپنا سر اُٹھایا۔ ''ایک مہربانی اور کر دو۔ دلشاد کے بہن بھائیوں کو مجھ تک پہنچا دو۔ وہ یہاں ادارے میں رہیں گے۔ ادارہ اُن کی تعلیم و تربیت کے اخراجات اُٹھائے گا۔ میں نہیں چاہتی' کرم داد اور زرینہ کی یہ کہانی نسل در نسل آگے منتقل ہوتی رہے۔''

''ٹھیک ہے۔ کل تک پہنچ جائیں گے اور کچھ۔'' وہ بہت پُرسکون تھا۔

''نہیں' شکریہ۔'' وہ ہولے سے مسکرائی۔

''اب تم بھی میرا ایک کام کرو۔'' ہارون کرسی سے اُٹھ کر عین اُس کے سامنے آ گیا اور آہستگی سے اُس کے نرم ریشم کے گداز ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔

''مجھے تمہاری 'ہاں' چاہیے مشعل۔ میں تنہائی کا عذاب سہتے سہتے عاجز آ گیا ہوں۔ اب تصور سے دل نہیں بہلتا۔ مجھے اپنی آرزو مجسم چاہیے۔ اپنے گھر میں' اپنی دسترس میں' اپنی پناہوں میں۔ دیکھو' مجھے مایوس نہ کرنا۔''

''پلیز' ہاتھ چھوڑو۔'' اس کے چہرے پر گلابیاں سی چھلک اُٹھی تھیں۔

وہ بدستور اُس کے ہاتھ ہٹانے کی کوشش میں تھی مگر ہارون کی گرفت مضبوط تھی۔

''میں ان ہاتھوں کو ہمیشہ کے لیے تھامنا چاہتا ہوں۔'' وہ اس کی آنکھوں میں جھانک کر از خود رفتگی کے عالم میں گویا ہوا۔

''یہ ممکن نہیں ہے۔'' وہ اُس کی شمع نظر سے پگھل کر رہ گئی۔ اس کی قربت کی خوشبو کی گرمی اسے ستا رہی تھی۔ یوں بھی فطرتاً وہ بہت چھوئی موئی اور شرمیلی تھی مگر ہارون بھی جیسے آج نہ چھوڑنے کی قسم کھائے ہوئے تھا۔ اس کے چاندی کی طرح دمکتے اور مخمل کی طرح ملائم ہاتھوں کا لمس ہارون کے جسم و جاں میں سرشاری کی لہر دوڑا رہا تھا۔ اس نے یوں ہاتھ تھامے تھے' جیسے وہ کوئی مقدس صحیفہ ہوں۔ اس کے انداز میں محبوبیت بھی تھی اور تقدس بھی۔

''کیوں ممکن نہیں ہے۔'' ہارون نے اسے محبت سے ڈانٹا۔ ''بہت ہو گئی اب۔ میں تمہاری ایک نہیں سنوں گا۔ ایک مدت گزر گئی ہے اس کشمکش میں۔ بقول فیض۔

یہ اپنا عشق ہم آغوش جس میں ہجر و وصال
یہ اپنا درد کہ ہے کب سے ہمدمِ وسال
اس عشقِ خاص کو ہر ایک سے چھپائے ہوئے
گزر گیا ہے زمانہ گلے لگائے ہوئے

آخر میں اس کے لہجے میں شرارت گھل گئی تھی اور اس نے ایک بھرپور نگاہ اس پر ڈالتے ہوئے ہاتھ دبائے تھے۔

''بکو مت۔'' وہ سرخ پڑ گئی اور ایک جھٹکے سے بالآخر اپنے ہاتھ چھڑا لیے۔

''سنو تو۔ یہ تو فیض کی نظم کے آخری دو اشعار تھے' پہلے والے تو سنائے ہی نہیں۔'' وہ اپنے مخصوص موڈ میں آ چکا تھا۔

''میں کیا لکھوں کہ جو میرا تمہارا رشتہ ہے
وہ عاشقی کی زباں میں کہیں بھی درج نہیں
لکھا گیا ہے بہت لطفِ وصل و دردِ فراق
مگر یہ کیفیت اپنی رقم نہیں ہے کہیں

ایسے فیض کے یہ اشعار سو فی صد میرے جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں مشعل۔ محبت تو بہت چھوٹا لفظ ہے۔ جو کچھ میرے دل میں تمہارے لیے خزینے کی طرح محفوظ ہے' اس کا مفہوم الفاظ سے واضح نہیں کیا جا سکتا۔''

ہارون اچانک سنجیدہ ہو گیا۔ اس کے مخمور و گمبھیر لہجے سے برستی چاہت کی پھوار اتنی تیز تھی کہ وہ بھیگ گئی۔

''افراح بہت اچھی لڑکی ہے۔ وہ تمہیں بہت سی خوشیاں دے گی۔ مجھے یقین ہے۔'' مشعل نے ترسی ہوئی حسرت زدہ نظروں سے اُسے دیکھتے ہوئے کھوکھلے سے انداز میں نئی راہ دکھائی۔

''جو درد دل کو تمہاری محبت نے عطا کیا ہے' اس کا مداوا افراح کی ذات نہیں کر سکتی۔'' وہ قطعی انداز میں گویا ہوا۔ ''ایک بار اس درد کا شجر اُگ جائے تو پھر بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ جذبات کی آندھیاں بھی اسے جڑ سے اکھاڑ کر دل کے میدان سے باہر پھینکنے کی مجاز نہیں ہوتیں۔ تم کیوں بچوں کی طرح مجھے بہلاتی ہو۔ ٹال مٹول سے کبھی کوئی معاملہ حل ہوا ہے؟''

''اس کے علاوہ اور کچھ کر بھی تو نہیں سکتی ہارون!'' ہزار ضبط کے باوجود اس کی خوب صورت سنہری جھیلوں میں آنسو موتیوں کی طرح لرزنے لگے۔ اذیت کی تیز لہر اس کا جگر نوچ رہی تھی۔ صبر

ے تیشے سے دکھ کی چٹان کاٹتے کاٹتے اس کے ہاتھ تھکنے لگے تھے۔ کاش وہ کسی طرح اپنی بے کسی کا جال نوچ کر باہر نکل سکتی۔ بے شناختی کے درد سے بازو چھڑا سکتی۔ اُس کا ماضی اُس کا سب سے ڑا دشمن تھا۔ وہ ہارون کو دھوکا نہیں دے سکتی تھی۔

''تمہاری آنکھوں میں آنسو۔ ارے۔'' وہ بے تاب ہو کر اُس کے پاس آیا تھا۔

''تم تو بہت مضبوط اور بہادر ہو مشعل۔'' بہت نرمی سے کہتے ہوئے اُس نے اُس کے آنسو پنی پوروں پر چن لیے تھے۔

میں اور بہادر؟ نہیں۔ میری حیثیت ہی کیا ہے میرے ہمدم۔
مشعل کا دل رو دیا
میں بھلا کون ہوں۔
تم نے دیکھا ہے' کبھی میری طرف؟
کون ہوں میں۔
کتنی مضبوط نظر آتی ہوں (بظاہر)
کبھی برگد کے گھنے پیڑ کے سائے جیسی۔
کبھی ایستادہ مکاں کی صورت
اور کبھی نرم بچھونے کی طرح
صبح کی لو کی طرح
شام کے تارے کی طرح
تند موجوں میں محبت کے کنارے کی طرح
کون ہوں میں۔
تم نے دیکھا ہے' کبھی میری طرف
آنکھ سے دور کہیں روح کے تہہ خانے میں
ٹوٹے پھوٹے سے کھلونے اپنے۔
میں نے تم سب سے چھپا رکھے ہیں۔
تمہیں معلوم ہے' مجھ میں کوئی کہتا ہے۔
روح کے قفل کو توڑوں اک دن۔
اپنی خواہش کا دریچہ کھولوں۔

اور جی بھر کے کھلی تازہ ہوا میں کھیلوں۔

مگر.......

"تم جس چیز سے خوف زدہ ہو' میں اُسے جانتا ہوں مشعل۔ مجھ پر اعتماد کرو۔ مجھے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ تم الف' ب' ج میں سے کس کی اولاد ہو۔ تم جو کوئی بھی ہو۔ مجھے قبول ہو۔ مجھے صرف روح کی پاکیزگی مطلوب ہے۔ تم گناہ کی پیداوار نہیں ہو۔ میرے دل میں تمہارا مقام وہی ہے جو پہلے تھا اور وہی رہے گا' انشاء اللہ۔ بھلے سے سارا خاندان میرے اس فیصلے کے خلاف ہو جائے' مگر میں تمہارا ساتھ نہیں چھوڑوں گا۔ میری بیوی یا تو سرے سے کوئی بنے گی نہیں اور اگر بنی تو اُس کا نام مشعل ہوگا۔ اس کے علاوہ اور کسی کو یہ حیثیت نہیں مل سکتی۔" جوش جذبات میں ہارون وہ کچھ کہہ بیٹھا جسے چھپانے کا اس نے خود سے اور آپا اماں سے وعدہ کر رکھا تھا۔

جیسے کوئی سرخ آندھی سی چلی تھی۔ انکشاف کے جھکڑ اتنے بھیانک اور تیز تر تھے کہ مشعل کے اعصاب سہار نہ سکے۔ اُس کی آنکھیں اُبل کر باہر آ گئی تھیں اور مُٹھیاں بھنچ گئی تھیں۔ دوسرے ہی لمحے وہ چکرا کر میز پر گری اور دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گئی۔

☆☆☆

دلشاد نے سوپ تو شوق سے بنا لیا تھا مگر اب اندر لے جانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ کیا خبر انداز پذیرائی کتنا "عبرت ناک" ہو۔ وہ ڈر رہی تھی۔ گزشتہ پانچ دنوں سے مشعل کا جو طرز عمل تھا اس نے کوٹھی کے تمام ملازمین کو سہا دیا تھا۔ ہارون اس کے بے ہوش وجود کو سیدھا اسپتال لے گیا تھا جہاں دوسرے دن اُسے ہوش آیا تھا۔ ہوش میں آتے ہی اصرار کر کے وہ ڈسچارج ہو کر گھر واپس آ گئی تھی۔ اتفاق سے اُس وقت ہارون ڈیوٹی کی وجہ سے آفس میں تھا۔ درمیان میں بریک ملتے ہی وہ اسپتال بھاگا تھا۔ پتا چلا' مریضہ گھر جا چکی ہے۔ گھر آیا تو مشعل نے ملنے سے انکار کر دیا۔ ہارون کے بے پناہ اصرار اور درخواست کے باوجود اُس نے اپنے کمرے کا دروازہ نہیں کھولا تھا۔ وہ ہار تھک کر واپس ہو گیا۔

مشعل نے اس کے جانے کے بعد فوراً تمام ملازمین کو بلوایا اور سختی سے ہدایت کی کہ آئندہ ہارون یا اُس سے متعلق کوئی شخص کوٹھی کے اندر داخل نہ ہونے پائے۔ گیٹ پر بخشو بابا اور اندر پورچ کے پاس رمضو کی چوبیس گھنٹے کی ڈیوٹی لگا دی گئی تھی۔ دلشاد کا کام بیڈ روم کے دروازے کے باہر کرسی رکھ کر نگرانی کرنا اور مشعل کے طلب کرنے پر اُسے چائے یا کھانا پہنچانا تھا۔ آپا اماں کے علاوہ کوئی اس کے بیڈ روم میں بلا اجازت اندر آنے کا مجاز نہیں تھا۔

آپا اماں جانتی تھیں' وہ زبان کی پکی ہے۔ اپنا قول نبھا کر رہے گی۔ اُس نے کہا تھا کہ اگر خدانخواستہ ہارون اُس کی "اصل" کو پا گیا تو کبھی اُس کو دوبارہ شکل نہیں دکھائے گی۔

یہ اس کی عزت نفس اور خودداری کا معاملہ تھا۔ آپا اماں اسے مجبور نہیں کر سکتی تھیں بلکہ وہ تو خود اس سے شرمندہ تھیں۔ اس کا اعتماد اور مان توڑنے کی گنہگار تھیں۔ انہوں نے اپنی صفائی میں لجاجت سے بہت کچھ کہا تھا۔

"بیٹی' وہ کافی حد تک اپنی ماں کے ذریعے تمہارے متعلق جان چکا تھا۔ مجھ سے تو محض تصدیق کرنے آیا تھا۔ اُس کی ماں صفیہ مینا گل کی سہیلی تھی جس کے بھائی سے مینا گل کی منگنی ہوئی تھی اور اب جبکہ بات کھل ہی گئی ہے تو تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ رضوانہ کے والد سردار امداد علی تمہارے بھی باپ ہیں۔ تم اُن سے لاہور میں ہارون کی رہائش گاہ پر مل چکی ہو۔"

یہ سب جان کر بھی مشعل کی خاموشی نہیں ٹوٹی تھی۔ اُس کی آنکھیں جاگ جاگ کر سرخ انگارہ ہو گئی تھیں۔ زرد چہرہ ہر جذبے سے عاری تھا۔ ایک دم سپاٹ اور ساکت۔ آنکھوں میں بھی جمود کی کیفیت طاری تھی۔ لمبے لمبے گھنے سیاہ بال بے ترتیبی سے کندھوں پر پریشان تھے۔ لباس مسلا ہوا اور ملگجا سا تھا۔

ابھی کل ہی آپا اماں نے اُس کے پاس بیٹھ کر اُسے سینے سے لگاتے ہوئے اطلاع دی تھی۔

"لاہور سے ہارون کی امی آئی ہیں۔ وہ تم سے ملنا چاہتی ہیں۔ تمہاری خیریت دریافت کرنے کے لیے گھر آنا چاہتی ہیں' ہارون کے ساتھ۔" مگر مشعل نے آہستگی سے نفی میں سر ہلا دیا تھا۔ "وہ ہارون کی اطلاع پر اتنے برسوں سے بچھڑے بھائی سے ملنے اسلام آباد آئی ہیں اور تم جانتی ہو' اُن کے بھائی کون ہیں؟ بابا صاحب۔ جو چھ سال تمہیں پنڈی کی گلیوں میں مجذوبانہ حالت میں نعرے لگاتے ملے تھے اور تم انہیں اصرار سے اپنے ادارے میں لے آئی تھیں۔" مگر یہ اطلاع بھی مشعل کی ذات کی ساکن جھیل میں ارتعاش پیدا نہ کر سکی۔ یوں لگتا تھا' جیسے اُس کا وجود پتھر میں ڈھل گیا ہو۔ وہ صرف سنتی تھی۔ نہ بولتی تھی' نہ ہلتی تھی اور نہ نظروں کا سکوت توڑتی تھی۔

ہارون اور اُس کی امی بابا صاحب کو اپنے ساتھ لاہور لے جانا چاہتی تھیں مگر انہوں نے سہولت سے انکار کر دیا کہ میں یہیں خوش ہوں' مزے میں ہوں اور اسی طرح زندگی بسر کرنا چاہتا ہوں۔ وہ تمہارے صحت یاب ہو کر ادارے میں آمد کے بے تابی سے منتظر ہیں۔ اور ہارون کی امی بتا رہی تھیں' سردار امداد ایک ہفتے سے بیمار ہو کر بستر پر پڑے ہیں۔ ابھی فوری سفر کے قابل نہیں تھے اس لیے اُن کے ہمراہ نہیں آ سکے۔ دو چار دنوں میں ٹھیک ہو کر سیدھے اسلام آباد آئیں گے۔ وہ

اپنی بیٹی سے ملنے کے لیے تڑپ رہے ہیں۔"

"کیا بات ہے شادو رانی۔ تم یہاں کیوں کھڑی ہو؟" لال گوٹے والے کپڑوں میں ملبو
لال پراندے کی آخری گرہ لگاتے ہوئے نوبیاہتا خیراں کچن کی طرف آتے ہوئے حیرت سے اُ
کی صورت دیکھ رہی تھی۔

دلشاد ایک دم چونک اُٹھی۔

"کچھ نہیں۔ سوچ رہی ہوں سوپ لے کر جاؤں یا نہیں۔ خدا جانے باجی کا موڈ کیسا ہے"
وہ افسردگی سے مسکرائی۔

"لے جاؤ۔ ابھی آپا اماں اُن کے کمرے میں گئی ہیں۔ بی بی جی اُن سے باتیں کر ر
ہیں۔ آج تو خاصی بہتر ہیں۔ انہوں نے فون کر کے اپنے وکیل کو بھی بلوا لیا ہے۔" خیراں کے
اطمینان بخش جملوں نے دلشاد میں چابی بھر دی وہ لپک جھپک اندر چلی گئی۔

"آؤ دلشاد۔ میں آپا اماں سے تمہارا ہی ذکر کر رہی تھی۔" مشعل کی آواز نقاہت کے
باعث آہستہ ضرور تھی مگر لب و لہجہ نارمل ہی تھا۔ دلشاد کو خاصا حوصلہ ہوا۔

"تمہارے والدین اور بہن بھائیوں کا پتا چل گیا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے مختصراً سار
تفصیل دلشاد کو بتا دی۔

"برے کا انجام برا۔ یہ تو ہونا ہی تھا باجی۔" ماں باپ کے جیل میں بند ہونے کی خبر سن کر
اُس کا دل کٹ کے رہ گیا۔

آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ مشعل نے قریب بلا کر کندھے تھپتھپاتے ہوئے تسلی دی۔

"میں بخشو بابا یا رمضو سے کہہ دیتی ہوں وہ میری گاڑی میں تمہیں جیل لے جائیں گے۔
اپنے والدین سے مل لینا۔ تمہارے بہن بھائی کاکو، گڈو، پپو اور نگینہ ادارے میں پہنچ چکے ہوں گے۔
وہیں دوسرے بچوں کے ساتھ اُن کی رہائش کا انتظام کر دیا جائے گا۔" اُس نے انٹرکام پر بخشو چاچا
کو بلا کر دلشاد کو اُن کے ہمراہ بھجوا دیا۔

پھر آپا اماں کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"وکیل کو کس لیے بلوایا ہے بیٹی؟" وہ متحیر لہجے میں دریافت کر رہی تھیں۔

"میرے پاس وقت بہت کم ہے آپا اماں اور میں ہر قضیہ نپٹا کر جانا چاہتی ہوں تاکہ بعد
میں آپ لوگوں کو کوئی مسئلہ نہ ہو۔"

"تم کہاں جانا چاہتی ہو؟" آپا اماں کا کلیجا دھک سے رہ گیا۔

"فکر نہیں کریں۔ خودکشی نہیں کر رہی۔ لاکھ خطا کار سہی مگر ہوں تو مسلمان۔ ہمیشہ کا عذاب
ں لے سکتی۔ یہ جان تو خدا کی امانت ہے۔ اُسی کو لوٹائیں گے مگر اس طرح کہ مرتے وقت
کوئی کانٹا نہ چبھا رہے۔ میں کل میڈم بانو کی لال کوٹھی میں شفٹ ہو رہی ہوں۔ دن رات
ساتھ رہوں گی تاکہ کام آسان ہو جائے۔ ظاہر ہے اس دوران کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ میں
لہ کر لیا ہے اب یا تو اس عورت کو ختم کر کے سرخ روئی پاؤں گی یا خود مر جاؤں گی۔ ناکام
یں لوٹوں گی۔ کچھ نہ کچھ کر کے ہی آؤں گی۔ آر یا پار۔ کچھ بھی ہو۔ یہ بازی عشق کی بازی
جا ہو لگا دو ڈر کیسا۔ گر جیت گئے تو کیا کہنا ہارے بھی تو بازی مات نہیں۔ میں اس شیطان کی
تا موقع ہرگز نہیں دوں گی کہ وہ وطن کے رکھوالوں کو مسلسل گمراہ کر کے راہ سے بھٹکاتی
بہت نقصان کر لیا ہے اُس نے ہمارا۔ اب یہ گندا کھیل ختم ہو جانا چاہیے۔"

آپا اماں اسے روکنا چاہتی تھیں اسے بتانا چاہتی تھیں کہ وہ ایک عظیم حماقت کرنے جا رہی
یہ معاملات اُس کے بس کے نہیں تھے۔ جوش و جذبات کے بل پر کوئی قلعہ فتح نہیں کیا جا
یڈم بانو جیسی شاطر و عیار عورت کو اُس کی تنظیم سمیت صفحۂ ہستی سے مٹانا ناممکنات میں شامل
صوصاً اس جیسی سیدھی سادھی نہتی اور کمزور لڑکی کے لیے۔ مگر وہ مشعل کی فطرت کو جانتی
وہ جس بات کا تہیہ کر لیتی تھی اُس سے ایک انچ پیچھے نہیں ہٹتی تھی۔

وکیل آ چکا تھا۔ اور آپا اماں دم بخود بیٹھی مشعل کی ہدایات سن رہی تھیں جیسے وکیل روانی سے
تحریر کرتا جا رہا تھا۔ اُس نے لکھوایا تھا کہ یہ کوٹھی اُس کی موت کے بعد لاوارث اور بے سہارا
کی پناہ گاہ بنا دی جائے گی۔ اس کا نام "جائے عافیت" رکھا جائے گا۔ ادارہ اطفال کے
بابا صاحب ہوں گے اور اس کے منتظم کی ذمے داری ہارون احمد کو سونپی جائے گی۔
کے امور کی دیکھ بھال کریں گی۔ فیکٹری کی سالانہ آمدنی کا پینتیس فیصد ہر سال ادارہ
کے فنڈ میں جمع کرایا جائے گا جبکہ بیس فی صد "جائے عافیت" کی مد میں خرچ کیا جائے گا۔
کے جانے کے بعد مشعل نے آپا اماں کو اچھی طرح پٹی پڑھا دی جس کے مطابق انہیں
نا اور ہر آئے گئے سے یہی کہنا تھا کہ مشعل فیکٹری کے کسی کام سے فیصل آباد گئی ہے۔

☆☆☆

اس نے بڑی محنت اور ہوشیاری سے میڈم بانو کا اعتماد حاصل کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب وہ
کے ہاں لال کوٹھی میں شفٹ ہوئی تو انہوں نے اُسے کوٹھی کے اندر ہر طرح کی آزادی اور
دی۔ وہ احتیاطاً اپنے ہمراہ کوئی مشکوک چیز نہیں لائی تھی۔ وہ جانتی تھی میڈم بانو جیسی لومڑی

کی طرح عیار و مکار عورت اس کی چیزوں کی خفیہ تلاشی ضرور لے گی۔ یوں بھی جو کچھ اُسے درکا
وہ کوٹھی میں وافر مقدار میں موجود تھا۔ یہی تو میڈم بانو کا کاروبار تھا۔ خفیہ طریقے سے آواز اور
ریکارڈ کرنے والے درجنوں آلات اِدھر اُدھر رُل رہے تھے۔ ضرورت پڑنے پر مشعل نظر
کسی پر بھی ہاتھ صاف کر سکتی تھی۔

عام حالات میں میڈم بانو کو اپنی طرف سے مطمئن اور بے فکر کرنے میں اسے مہینوں
جدوجہد کرنا پڑتی مگر خوش قسمتی سے اپنی ذہانت سے کام لے کر وہ شروع میں ہی اُن کی منظورِ نظ
گئی تھی۔ میڈم بانو کی واحد پریشانی ہارون کی ذات تھی۔ وہ ہر ممکن طریقے سے اُسے مزید کار
سے روکنا چاہتی تھیں۔ انہی دنوں ہارون نے مشعل کو بتایا تھا کہ کچھ سیاسی مصلحت کے باعث
الحال میڈم بانو پر ہاتھ نہیں ڈال سکتے۔ مشعل نے اس اطلاع کو اپنی ہوشیاری سے میڈم کو وفا
کا ثبوت دینے کے لیے استعمال کر لیا۔

''آپ مجھے دو دن کی مہلت دیں۔ دیکھیے گا' میں کیسے ہارون کو اُلّو بنا کر اس کیس
کرنے سے روکتی ہوں۔'' اُس نے دعوے سے کہا تھا اور دو دن بعد رپورٹ پیش کر دی تھی۔

''آپ اپنے آدمیوں کے ذریعے چیک کرا سکتی ہیں۔ ہارون نے اس کیس کو ٹھپ
ہے اور آج کل آفیشیل ڈیوٹی پر دفتر میں حاضریاں بھگتا رہا ہے۔ اُس کی تمام جاسوسی کارروا
اختتام کو پہنچ چکی ہیں۔ اب ٹھنڈا ہو کر بیٹھ گیا ہے۔''

اور میڈم بانو نے اس بات کی تصدیق کروانے کے بعد مشعل کو بے اختیار گلے لگا لیا تھا

''اوہ مائی ڈارلنگ۔ اگر تم میرے ساتھ شامل رہیں تو ہم اسی طرح اپنے مشن میں کامیا
ہوتے رہیں گے۔

''میڈم' ایک بات آپ سے کہنا چاہتی تھی۔ ''فیلڈ'' کے بجائے اگر مجھے اندرونی کا
تک محدود رکھیں تو آپ کی عنایت ہو گی۔ ویسے تو مجھے باہر نکل کر مختلف محکموں کے اعلیٰ افس
حسن و شباب کا چارہ ڈال کر اہم سرکاری راز اُگلوانے میں کوئی اعتراض نہیں مگر میرا خیال ہے
یوں بھی آپ کے انتظامی معاملات زیادہ احسن طریقے سے سرانجام دے سکتی ہوں۔ یوں بھ
ادارۂ اطفال اور فیکٹری کی مالکہ ہونے کی حیثیت سے کافی حد تک جانی پہچانی شخصیت ہوں'
ہو کہ میری شناخت آپ کے لیے مشکلات پیدا کر دے۔ جو گڑ سے مر جائے اُسے زہر دینے
ضرورت ہے۔ جب میں اپنی عصمت کی حفاظت کرتے ہوئے آپ کے لیے مطلوبہ معل
ہارون اور اس کے دیگر ساتھیوں سے حاصل کر سکتی ہوں تو کال گرل بن کر دھندا کرنے

''
اُس نے اتنے بھرپور اعتماد سے دلائل دیے تھے کہ میڈم بانو بلا چون و چرا مان گئیں۔ البتہ یہ
جتا دیا کہ دو تین ماہ بعد جب وہ اچھی طرح ٹرینڈ ہو جائے گی تو گاہکوں کو خوش کرنے کے لیے
پ پیش کرنا ہو گا۔

میڈم بانو نے اُسے فائلوں' وڈیو کیمروں اور ٹیپ ریکارڈرز کے ذریعے حاصل ہونے والی
مات کو ترتیب وار محفوظ کرنے کا کام سونپا تھا۔ اتفاق سے وہ کمپیوٹر آپریٹ کرنا جانتی تھی اس لیے
م بانو نے کچھ مخصوص قسم کی معلومات کمپیوٹر پر فیڈ کرنے کا کام بھی اُس کے سپرد کر دیا تھا۔ مشعل دل
دل میں خوشی سے نہال ہو گئی تھی۔ یہی تو وہ چاہتی تھی۔ اب اُسے ہوشیاری سے اس دن کا انتظار کرنا
جب وہ کوٹھی کے خفیہ تہہ خانے میں جا کر الماری میں محفوظ اہم ترین فائلوں کی کاپی بنا سکتی۔

ایک اہم کامیابی رومانہ کو اپنے ساتھ ملانے کی صورت میں اُسے ملی تھی۔ رومانہ کو اُڑتی اُڑتی
ملی تھی کہ مشعل کا ہارون سے گہرا تعلق ہے۔ اسی خبر کی بنیاد پر اُسے مشعل کی ذات میں دلچسپی پیدا
ئی تھی۔ وہ خفیہ کے اس بندے کی شرافت' متانت اور شخصیت کے وقار سے متاثر ہو گئی تھی۔ جونہی
شعل نے محسوس کیا کہ اندر ہی اندر رومانہ میڈم بانو کے خلاف قدم اُٹھانے کے لیے بے چین ہے
اُس نے اُس پر اپنی آمد کا مقصد بیان کر دیا۔ شروع شروع میں رومانہ تعاون کے لیے آمادہ نہ
وئی۔ وہ بہت ڈری ہوئی تھی مگر پھر مشعل کی بہادری اور بے خوفی نے اُسے حوصلہ دیا اور وہ اندر
سے ''ایک'' ہو گئیں۔

مشعل کے مطالبے پر رومانہ نے ایک جدید ترین وڈیو کیمرہ اور ٹیپ رکارڈر اُسے مہیا کر دیا
تھا۔ یوں بھی میڈم بانو نے اپنے ہر قابلِ اعتماد مہرے کو یہ چیزیں ذاتی طور پر فراہم کر رکھی تھیں اس
لیے تشویش کی بات نہیں تھی۔ میڈم بانو کوٹھی کے حفاظتی انتظامات سے مطمئن تھیں۔ وہ جانتی تھیں'
اُن کی اجازت کے بغیر کوئی پرندہ بھی یہاں پر نہیں مار سکتا۔ اُنہیں ڈینی کی کارکردگی پر بھروسا تھا۔

ہر دم میڈم بانو کا سایہ بنے رہنے کی وجہ سے مشعل کو بہت سی کارآمد معلومات مل گئی تھیں۔
مثلاً یہ کہ اُن کا ایک ذاتی کمرا ہے جہاں غیر متعلقہ افراد کا آنا منع ہے۔ ماسوائے اُن کے جنہیں وہ
خود بلائیں۔ اسی کمرے کے نیچے تہ خانہ ہے جہاں ایک ایسا فون ہے جس کا نمبر میڈم کے سوا کسی
کے علم میں نہیں ہے اور اس نمبر پر صرف ایک مخصوص شخص فون کرتا ہے' اس کے علاوہ اور کسی کے
پاس یہ نمبر نہیں ہے۔ ایک ایکس ٹینشن میڈم کی بیڈ سائیڈ پر ہے تاکہ اگر تہ خانے تک جلدی پہنچنا
دشوار ہو تو براہِ راست کمرے سے فون سنا جا سکے۔ رومانہ کا اندازہ تھا کہ اس نمبر پر ملک سے باہر کی

کوئی کال ریسیو کی جاتی ہے۔ مثلاً بگ باس کی۔ میڈم کو جب کوئی اہم بات بتانی ہوتی تھی تو و
خانے میں بند ہو جاتی تھیں۔ مشعل کسی طرح یہ گفتگو ٹیپ کرنا چاہتی تھی۔ بالآخر ایک دن یہ موقع
گیا۔

میڈم بانو نے اسے اپنے کمرے میں بلوایا تھا' ابھی بات شروع بھی نہ کی تھی کہ فون بج اُٹ
میڈم بانو نے فوراً اس کی طرف دیکھا پھر تذبذب میں ریسیور اُٹھایا۔

''جی۔ جی سر۔'' وہ بالکل مستعد تھیں۔ ''جی ایک منٹ' میں نیچے سے ریسیور اُٹھاتی ہوں
پھر وہ تہ خانے کا نمبر دبانے کے بعد ریسیور رکھ کر بولیں۔ ''تم جاؤ پھر بات ہوگی۔'' یہ کہہ کر انہ
نے خفیہ خانے سے چابی نکال اور تہ خانے کھول کر سیڑھیاں اُترتے ہوئے نیچے آ گئیں۔

مشعل نے تاثر یہی دیا تھا' جیسے وہ دروازے کی طرف جا رہی ہے مگر جونہی میڈم بانو
نیچے سے ریسیور اُٹھایا' اس نے لمحے کے ہزارویں حصے میں فیصلہ کر لیا کہ اُسے کیا کرنا ہے۔ اُ
نے اُس وقت ڈھیلا ڈھالا کوٹ پہن رکھا تھا جس کی اندرونی جیب میں جرمنی ساخت کا گرانڈ
کا ماڈل ٹی۔ کے۔ ۴۷ ٹیپ ریکارڈ اس وقت بھی موجود تھا۔ اس کی خوبی یہ تھی کہ اگر اُسے فو
کے تار سے جوڑ دیا جائے تو خود بخود دو طرفہ گفتگو ریکارڈ رکھتے ہوئے اس میں اسپول ڈال
تھا۔ اس نے ریکارڈر نکالا اور پھرتی سے کمرے کے ایکس ٹینشن سے جوڑ دیا۔ اب آو
ریکارڈ ہو رہی تھی۔ وہ ریسیور کان سے لگائے کھڑی تھی۔

''سر' میں نے خفیہ کے بندے کا انتظام کر لیا ہے۔ آسیہ اور مینا گل کا قتل ثابت کرنے
لیے اُس نے کچھ عرصے تک بڑی جان ماری تھی۔ میں تو ڈر رہی تھی۔ بہر حال اب کوئی خطرہ نہیں
ہے فی الحال۔''

میڈم بانو انگلش میں بات کر رہی تھیں۔

''اور آگے بھی نہیں ہوگا۔'' دوسری طرف سے ایک بھاری دبنگ مشینی لہجہ سے ٹکرایا۔

''جب تک اس قوم میں عورت' دولت اور نام و نمود کے پجاری سلامت ہیں' ہمیں کو
خطرہ نہیں ہے۔ آزادی کے بعد پچاس سال خوابِ غفلت میں گزر گئے۔ مزید پچاس بھی گز
جائیں' تب بھی اِس ملک کی حالت یہی رہے گی۔ کون سا شعبہ ہے جہاں پیسے' اثر رسوخ او
نذرانے سے کام نہیں نکلوایا جا سکتا۔''

بولنے والے کے لہجے میں تحقیر اور طنز نمایاں تھا۔

''تم بے فکری سے اپنے مشن میں مصروف رہو۔ حکام اعلیٰ تم سے بہت خوش ہیں۔ گزشتہ

ں میں تم نے حیرت انگیز کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے۔ ایک طرف عیاشی و فحاشی کے اڈے قائم
کے یہاں کے نوجوانوں کا دین و ایمان اور مستقبل مخدوش بنایا ہے تو دوسری طرف اسی قوم کی
ں بیٹیوں کو چارے کے طور پر استعمال کر کے اہم ترین قومی راز حاصل کیے ہیں۔ اقتدار اور
ں کے نشے میں ڈوبے ان اعلیٰ افسران کو اس بات کا بھی احساس نہیں ہے کہ وہ اپنی ہی بہنوں
ں کی عزتوں سے کھیلے ہیں' اُن کے حسن و شباب کے جال میں پھنس کر ملک سے غداری کرتے
ا اور حد تو یہ ہے کہ یہ لڑکیاں بھی رضامندی سے لٹنے کے لیے تیار ہو جاتی ہیں۔ وہ جوان کے
ں شاعر علامہ اقبال نے کہا تھا ناں کہ یہ قوم اپنے خنجر سے خود آپ خودکشی کرے گی۔ جو شاخ
ک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا۔ وہ سچ ثابت ہو گیا ہے۔''

وہ ہنسا۔ مشعل کے سینے میں جیسے بھٹی سی سلگ اُٹھی۔

شریانوں میں دوڑتا خون بارود بن گیا تھا۔

''وزارتِ دفاع کا ڈپٹی سیکریٹری ہمارا اگلا ٹارگٹ ہے۔ نام نوٹ کر لو۔'' بگ باس میڈم
و کو ہدایات دے رہا تھا۔ اس کا لب و لہجہ غیر ملکی تھا مگر جس روانی سے اُس نے اقبال کا شعر پڑھا
ا اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ یہاں کی تہذیب' علم و ادب اور جغرافیائی و سیاسی صورتِ حال سے
مل طور پر باخبر تھا۔

''حال ہی میں یہاں کی حکومت دفاع کے سلسلے میں اپنے ایک دوست ملک سے معاہدہ کر
ہی ہے۔ ہمیں اس معاہدے کی فائل درکار ہے۔ کسی ہوشیار لڑکی کو اس ڈپٹی سیکریٹری کے پیچھے لگا
د۔ ہم نے اپنے ذرائع سے معلوم کیا ہے کہ موصوف شراب کے رسیا ہیں' ایسے بندے کو شباب کی
شوت دے کر فائل کی کاپی نکلوانا زیادہ مشکل نہیں ہوگا۔''

''آپ کا کام ہو جائے گا سر۔'' اس کے کچھ دیر بعد فون رکھ دیا گیا۔ مشعل نے ہڑبڑا کر
ریسیور رکھا اور ٹیپ ریکارڈر کا تار کھینچ کر اُسے دوبارہ کوٹ کی جیب میں ڈال لیا۔ جرمنی ساخت کا یہ
یپ ریکارڈر اور کیسٹ کی جگہ اسپول کا استعمال خاصا پرانا تھا۔ اب تو بازار میں جدید ترین کیسٹ
لیئر آ گئے تھے۔ مشعل نے جان بوجھ کر اس پرانے ریکارڈر کا استعمال کیا تھا' اُسے میڈم بانو تقریباً
بے کار سمجھ کر اسٹور میں ڈال چکی تھیں۔ اگر مشعل کے پاس سے برآمد ہو بھی جاتا تو شک کی گنجائش
نسبتاً کم تھی۔

''تم یہیں ہو ابھی تک۔ میں نے تمہیں جانے کی اجازت دے دی تھی۔''

میڈم بانو اچانک ہی تہ خانے سے اوپر آ گئی تھیں۔

مشعل کی جان نکل گئی۔

"وہ......وہ......" اُس نے خشک حلق تر کرتے ہوئے جسم و جان میں سنسنی پھیلا دینے والے ہراس پر قابو پانے کی کوشش کی۔ "آئی ایم ساری میڈم۔ میں سمجھی آپ نے مجھے رکنے کا اشارہ کیا ہے۔" وہ دل ہی دل میں خوف زدہ تھی اگر میڈم کو فون ٹیپ کرنے کا شبہ ہو گیا تو وہ زندہ نہ بچ سکے گی۔

میڈم بانو کی کھوجی نظریں بغور اُس کا جائزہ لے رہی تھیں۔

"او کے۔ تم جا سکتی ہو۔" اُن کا لہجہ سپاٹ اور بے تاثر تھا۔ وہ لرزتے قدموں سے کمرے سے باہر نکلی اور تیز تیز سیڑھیاں چڑھ کر اوپر رومانہ کے کمرے میں آ گئی۔ ٹیپ ریکارڈر میں سے اسپول نکال کر اُس نے گتے کے ایک ڈبے میں منتقل کی اور رومانہ کے مشورے سے اسے بیڈ میٹریس اُٹھا کر پائنتی کی جانب رکھنے کے بعد دوبارہ میٹریس بچھا دیا۔

"اسپول یہاں زیادہ محفوظ نہیں ہے۔ کسی بھی وقت میڈم بانو یا اُس کی کوئی ملازمہ کمرے کی تلاشی لے سکتی ہے۔" رومانہ نے خدشے کا اظہار کیا۔

"میں بھی یہی سوچ رہی ہوں۔" مشعل نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے سرگوشی میں جواب دیا۔ "ایک اچھی خبر سنو! مجھے تہ خانے کی چابی مل گئی ہے۔"

"کیا مطلب!" رومانہ بھونچکا رہ گئی۔

"میڈم نے عجلت میں میرے سامنے ایک خفیہ خانے سے چابی برآمد کی تھی، واپسی میں اُسی جگہ رکھ دی۔ وہ خانہ نمبر ملا کر کھلتا ہے ایٹ ون سکس۔ میں نے میڈم کے ہاتھوں کی جنبش غور سے دیکھی تھی۔ اب صرف یہ مرحلہ باقی رہ گیا ہے کہ کسی طرح میڈم کی عدم موجودگی میں تہ خانے میں اُتر کر خفیہ فائلوں کی وڈیو فلم بنالی جائے۔ کیونکہ فائلوں کی کاپی تیار کرنا یا اُنہیں کاغذات کی شکل میں اپنے ساتھ لے جانا ناممکن ہے، اس میں پکڑے جانے کے سو فی صد امکانات ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ وڈیو فلم ایک محفوظ طریقہ ہے۔ میڈم کل صبح لاہور جا رہی ہیں۔ شام کی فلائٹ سے واپس آئیں گی۔" رومانہ نے اطلاع دی۔

"یہی موقع مناسب رہے گا۔ سنو، تم خواب آور دوا خرید لائی ہو؟"

"ہاں، میں نے باتھ روم میں لپ اسٹک کے خالی شیل میں چھپا کے رکھ دی ہے۔" رومانہ نے جواب دیا۔ مشعل یہ پلان رومانہ سے ڈسکس کر چکی تھی۔ ڈینی تین ٹائم کا کھانا کوٹھی میں کھاتا تھا۔ ایک ملازمہ خصوصی طور پر اُس کے لیے وقف کی گئی تھی جو کھانے کی ٹرے گیٹ کے باہر بنے

ڈینی کے کیبن تک لے جاتی تھی۔ اُنہوں نے فیصلہ کیا کہ کل دوپہر ملازمہ کی نظر بچا کر سالن میں خواب آور دوا ملا دی جائے گی تاکہ ڈینی کا کوٹھی کے اندر چکر لگانے کا خطرہ جاتا رہے۔ اس کی بے ہوشی کا فائدہ اُٹھا کر دونوں بہ آسانی یہاں سے فرار ہو سکتی تھیں۔ رومانہ کوٹھی کے اندرونی مین ڈور کا پیچیدہ لاک سسٹم کھولنا جانتی تھی۔ میڈم نے اُس کی سنیارٹی اور کارکردگی پر اعتماد کرتے ہوئے اسے سسٹم سمجھا دیا تھا۔ اس لیے کوٹھی سے باہر نکلنا مشکل نہیں تھا۔

اگلے دن خوش قسمتی سے کوٹھی میں زیادہ افراد نہیں تھے۔ ثمن "ہولی ڈے ان" میں گزشتہ دو روز سے کسی گاہک کے کمرے میں مقیم تھی۔ رعنا کو میڈم نے پرسوں کراچی کے اڈّے پر کاروبار کا جائزہ لینے کے لیے روانہ کر دیا تھا۔ اتفاق سے گیسٹ ہاؤس کے کمرے بھی خالی تھے۔ ایک نئی لڑکی روبی ایک ماہ پہلے یہاں لائی گئی تھی۔ اُس کے علاوہ ایک ملازمہ تھی اور باہر گیٹ پر موجود ڈینی۔

رومانہ نے خواب آور دوا ڈینی کی پلیٹ کی بجائے سالن کی دیگچی میں ملا دی تاکہ ڈینی کے ساتھ ساتھ روبی اور ملازمہ کا بھی بندوبست ہو جائے۔ ہر طرف سے اطمینان کر لینے کے بعد مشعل نے تہ خانے کی چابی برآمد کی اور تالا کھول کر نیچے چلی گئی۔ رومانہ اوپر پہرہ دینے اور خبردار کرنے کے لیے چوکس کھڑی تھی۔ مشعل نے سب سے پہلے تہ خانے میں رکھے فون سیٹ سے اُس کا نمبر نوٹ کیا۔ اس نمبر پر ایک ہی مخصوص کال آتی تھی۔ اور خفیہ والے آبزرویشن لگا کر بگ باس کا نمبر ٹریس کر سکتے تھے۔ یہ بھی معلوم کیا جا سکتا تھا کہ وہ کس ملک سے کال کرتا ہے۔ تہ خانے میں بے شمار فائلیں تھیں۔ وڈیو فلم اور کیسٹیں کا بھی انبار تھا۔ مشعل کو ان فائلوں کی تلاش تھی جن سے میڈم بانو کی اصل شخصیت، اُس کے کاروبار اور خفیہ مشن کا ثبوت مل سکتا۔ وہ مہارت سے مختلف فائلوں کی وڈیو بناتی جا رہی تھی پھر اسے وہ کاغذات بھی مل گئے جس کی تلاش تھی۔ وہ انہماک سے پڑھنے لگی۔

میڈم بانو کی اصلیت جان کر وہ تھرا اُٹھی۔ اٹھارہ سال پہلے اسے ایک غیر ملکی سیکرٹ سروس نے پاکستان میں اسمگل کیا تھا پھر جعلی شناختی کارڈ اور ڈومیسائل بنوا کر پاکستانی اور مسلم عورت کی حیثیت سے رہنے کے انتظامات مکمل کر دیے تھے۔ ان انتظامات میں قانونی اعتبار سے چھوٹے سے چھوٹا نکتہ بھی نظر میں رکھا گیا تھا۔ ذہین سے ذہین پولیس آفیسر یا سراغ رساں بھی یہ ثابت نہیں کر سکتا تھا کہ میڈم بانو غیر ملکی ہیں، غیر مسلم ہیں، ملک دشمن تنظیم کی تربیت یافتہ ایجنٹ ہیں اور اُن کے لیے مخبری کر رہی ہیں۔ کاغذات کی رُو سے وہ لاہور کے محلہ باغبانپورہ کے باسی حیات احمد کی بیٹی تھیں۔ اُن کی شادی پندرہ برس قبل داؤد علی سے ہوئی تھی مگر چھ ماہ بعد اُس کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد میڈم بانو اسلام آباد آ گئیں اور ایک سماجی تنظیم میں شامل ہو گئیں۔ رفتہ رفتہ وہ ایک سوشل

ویلفیئر آرگنائزیشن کی صدر منتخب ہو گئیں۔

کون ایسی سوشل، ویل آف اور سوبر شخصیت پر غیر ملکی ایجنٹ ہونے کا شبہ کر سکتا تھا۔ کون اس بات کی تصدیق کر سکتا تھا کہ وہ مسلم نہیں، یہودی تھیں۔

مشعل نے جلدی جلدی وڈیو کیمرے میں اہم کاغذات باری باری فوکس کیے۔ کتنے ہی ملکی راز ان فائلوں میں بند تھے۔ بہت سے عیاش سیاست دانوں، بے ایمان سرکاری افسروں اور ہوس پرست حکومتی پٹھوؤں کی مکروہ سرگرمیاں ان کاغذات میں رقم تھیں۔ یہ وہ لوگ تھے جو شراب و شباب میں دُھت ہو کر ملک کی جڑیں کھوکھلی کر رہے تھے۔ مٹھی بھر افراد نے پوری قوم کی اخلاقیات اور ساکھ کا جنازہ نکال دیا تھا۔

"مشعل، جلدی کرو۔" رومانہ چڑھے سانسوں سمیت تہ خانے کی سیڑھیاں طے کر کے نیچے آئی تھی۔ "تین گھنٹے ہو گئے ہیں۔ گیسٹ ہاؤس میں بکنگ کرانے والے چھ بجے سے آنا شروع ہو جائیں گے اور میڈم بانو بھی آنے والی ہیں۔ انہوں نے کہا تھا۔ واپسی بربائی روڈ آئیں گی، سات بجے تک۔ وہ اس سے پہلے بھی آ سکتی ہیں اور اس وقت چھ بجنے میں بیس منٹ رہ گئے ہیں۔ علاوہ ازیں ملازمہ، روبی یا ڈینی ہوش میں آ گئے تو سارا پلان دھرا کا دھرا رہ جائے گا۔"

"فکر نہیں کرو۔ خواب آور دوا کا اثر آٹھ گھنٹے تک باقی رہتا ہے۔" وہ احتیاط سے وڈیو کیمرے سے فلم نکالنے لگی۔ جواب مکمل ہو چکی تھی۔ کیسٹ نکال کر اُس نے اپنے ہینڈ بیگ میں ڈالی اور پھر فائلیں درست جگہ رکھ کر دونوں اوپر آ گئیں۔

پلان کے مطابق یہاں سے اُنہیں سیدھا ہارون کے فلیٹ میں جانا تھا۔ وڈیو فلم، ٹیپ ریکارڈر کا اسپول اور ٹیلی فون کا نمبر براہ راست ہارون تک پہنچانا تھا۔ ایک مرتبہ یہ چیزیں خفیہ والوں تک پہنچ جاتیں تو پھر میڈم بانو کو بلاشبہ کیفر کردار تک پہنچانے کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔

لیکن ابھی وہ تہ خانے کا دروازہ لاک کر رہی تھیں، جب میڈم بانو کی پجارو کا مخصوص ہارن بج اُٹھا۔

"میڈم واپس آ گئی ہیں؟" دونوں کے چہرے سفید پڑ گئے۔ ایک لمحے کو یوں لگا جیسے سانسیں بند ہو گئی ہوں۔ وہ دہل کر ایک دوسرے کی صورت دیکھنے لگیں۔

"آ...... اب کیا ہو گا مشعل؟" رومانہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ وہ تیورا کر گرنے کو ہو گئی تھی مگر مشعل بالآخر اپنے حواس بحال رکھنے میں کامیاب ہو گئی۔

"ابھی اُن کی گاڑی اسٹریٹ میں ہے۔ گیٹ سے اندر داخل نہیں ہوتی۔ تم ایسا کرو، یہ میرا ہینڈ بیگ پکڑو اور یہاں سے نکل جاؤ۔ اس میں تینوں چیزیں موجود ہیں۔ جاؤ، دیر نہ کرو، یہ موقع گنوا دیا تو ساری عمر میڈم بانو کی غلامی میں گزرے گی۔"

"تم پاگل ہو گئی ہو مشعل۔" وہ چکرا کر رہ گئی۔ "میں فرار ہو جاؤں اور تم یہاں رہ جاؤ، میڈم کا ...بننے کے لیے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

"ہم دونوں اکٹھی فرار ہوں گی تو میڈم کو صورتِ حال سمجھنے میں پانچ منٹ بھی نہیں لگیں گے۔ وہ ہمارے پیچھے بندہ دوڑا کر راستے میں آ لیں گی۔ ساری محنت اکارت جائے گی۔ میرا یہاں رکنا ضروری ہے تاکہ اُن کی توجہ تمہاری طرف مبذول نہ ہو۔ جب تک میں اُنہیں بحث میں الجھائے رکھوں گی، اس دوران تم ہارون تک پہنچ جاؤ گی۔ جاؤ۔ پلیز بحث نہ کرو۔" اس نے منت سے اسے دروازے کی طرف دھکیلا۔

"تم میڈم بانو کی فطرت کو نہیں جانتیں مشعل۔ تشدد کے ایسے ایسے طریقے آزماتی ہیں کہ گونگے بھی بول اُٹھیں۔" رومانہ دہشت بھری نظروں سے اُس کی شکل دیکھ رہی تھی۔

اس دوران مشعل اُس کا ہاتھ تھام کر بیرونی دروازے تک لے آئی تھی۔

"خدا کو منظور ہوا تو ہم دوبارہ آن ملیں گے اور اگر ایسا نہ ہوا تو بھی یہ جان تو آنی جانی ہے، اس جان کی کوئی بات نہیں۔"

رومانہ لاک کھول چکی تھی۔ دونوں باہر آ گئیں۔ اتفاق سے میڈم بانو کی گاڑی عقبی گیٹ سے اندر داخل ہو رہی تھی۔ رومانہ کو مرکزی گیٹ سے باہر جانا تھا جہاں ڈینی اپنے کیبن میں بے سُدھ پڑا تھا اور بظاہر کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔

"مشعل۔ پلیز آ جاؤ، میرے ساتھ۔" رومانہ قدم بڑھانے سے پہلے بے بسی سے اُس کا ہاتھ تھام کر سرگوشی میں بولی مگر مشعل جانتی تھی، دونوں کا ایک ساتھ فرار خودکشی کے مترادف ہو گا۔ رومانہ کو عجلت میں باہر لپکتے دیکھ کر تو شاید میڈم مشکوک نہ ہوتیں۔ یہی سمجھتیں کسی "اپائنٹ منٹ" پر گئی ہے مگر دونوں کو سر پر پیر رکھ کر بھاگتے دیکھ کر ایک سیکنڈ میں حرکت میں آ جاتیں۔ اپنے ڈرائیور سے کہہ کر بی ایم ڈبلیو اُن کے پیچھے دوڑا دیتیں تو پھر گلی کے اگلے سرے پر دونوں اُن کے قابو میں ہوتیں۔ اس لیے اس نے زبردستی اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ ناچار رومانہ ہینڈ بیگ سنبھال کر تیز تیز قدموں سے گیٹ پار کر کے باہر نکل گئی۔

"رومانہ کہاں گئی ہے؟" اس دوران میں میڈم بانو گاڑی سے نیچے اُتر چکی تھیں۔ مشعل پہلے

ہی بہانہ سوچ چکی تھی۔

"سیٹھ اکرام کی طرف گئی ہے میڈم۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اُس کا فون آیا تھا۔" اس بات بنائی۔ میڈم سر ہلا کر اندر چلی گئیں۔ مشعل کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ وہ اُن کے پیچھے ہوئی اندر آ گئی۔ میڈم کا رخ سیدھا اپنے خصوصی کمرے کی طرف تھا۔ مشعل اوپر چلی گئی اس اندر سوچوں کا بھونچال برپا تھا" وہ کس طرح میڈم کو جُل دے کر کوٹھی سے فرار ہو سکتی ہے؟" اُ ذہن اسی نکتے کے گرد گھوم رہا تھا۔

اس کے خیالوں کا سلسلہ انٹرکام پر اُبھرنے والی میڈم بانو کی آواز سے ٹوٹا۔ "میر کمرے میں آؤ۔"

وہ گھبرائے ہوئے انداز میں اُن کے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

"کُتیا کی اولاد دھوکے باز۔ آخری وہی ہوا ناں جس کا مجھے شبہ تھا۔ کل ہی میرا ماتھا ٹھنک تھا۔ محض ٹیسٹ کرنے کے لیے میں عمارت میں خفیہ وڈیو کیمرے لگا گئی تھی۔ اِدھر آؤ اور دیکھو کارکردگی۔" وہ چیل کی طرح جھپٹیں اور دوسرے ہی لمحے اُس کی گردن میڈم بانو کے آہنی میں جکڑی جا چکی تھی۔ ٹی وی اسکرین پر اس کی اور رومانہ کی کارکردگی کی ایک ایک جھلک نمایاں البتہ آوازیں ریکارڈ نہیں ہو سکی تھیں۔ میڈم بانو نے ایک جھٹکے سے اُسے بستر پر پھینکنے کے بعد اُ کے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے وہ تربیت یافتہ ایجنٹ تھیں' جوڈو کراٹے میں بلیک بیلٹ تھیں۔ اُن مقابلے میں مشعل ایک کمزور اور نہتی لڑکی تھی۔ وہ فون پر اپنے بندوں کو رومانہ کا پیچھا کرنے ہدایت دے رہی تھیں۔ ڈینی کو ایک طاقت ور انجکشن کے ذریعے ہوش میں لایا جا چکا تھا۔

"بتاؤ' رومانہ کو کہاں بھیجا ہے۔ کس کے پاس گئی ہے وہ......؟" میڈم بانو غصے میں بھڑک شعلہ ہو چکی تھیں۔ اُن کے ہاتھ میں لوہے کا کانٹے دار ہنٹر تھا' اُس کی ایک ہی ضرب نے مشع کے نازک جسم کو اُدھیڑ کر رکھ دیا تھا۔ کمرا ساؤنڈ پروف تھا اس لیے اس کی فلک شگاف چیخوں کسی کو ادھر متوجہ نہیں کیا۔ اس کا ایک ہی جواب تھا۔ "میں نہیں بتاؤں گی۔"

"تمہاری تو بوٹی بوٹی بتائے گی۔ میڈم بانو کے ساتھ غداری کرنے والے زمین کے او نہیں ملا کرتے۔" وہ وحشیانہ انداز میں اس پر ہنٹر برسانے لگیں۔ "بتاؤ۔ بتاؤ۔ کہاں بھیجا ہے اُ ؟"

"صرف ایک بات بتا سکتی ہوں......وہ یہ کہ یہ قوم سوئی ہوئی ضرور ہے مگر ختم نہیں ہوئی جس دن جاگ اُٹھی' یہود و نصاریٰ کی ہر ناپاک سازش کا پردہ چاک کر دے گی اور انہیں صفحۂ ہ

ثادے گی۔ تم لوگ اس حقیقت سے واقف ہو اسی لیے انہیں عیش و عشرت اور شراب و شباب کا ں دے کر سلائے رکھنا چاہتے ہو مگر...... کب تک۔ آخر کب تک۔ وہ ایک دن ضرور بیدار اور......اور وہ دن زیادہ دور نہیں ہے......"

وہ آہستہ آہستہ ہوش و حواس کی دنیا سے دور ہوتی جا رہی تھی۔ میڈم بانو جھنجلا کر اپنے بال ے لگیں۔ ساتھ ساتھ انہیں پریشانی بھی تھی کہ وہ ثبوت کسی ذمے دار افسر کے ہاتھ لگ گئے تو ں کوٹھی کا گھیراؤ کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔

سوچ بچار کے بعد اُنہوں نے فرار ہونے کا ارادہ کر لیا۔ اُنہوں نے مشعل کے ساکت اور بان جسم پر آخری وار کیا اور پھر ڈینی سے کہہ کر گاڑی نکلوانے لگیں۔

☆☆☆

"ہاں بھئی ہارون' تمہارے لیے ایک اچھی خبر ہے۔ جیسا کہ تم جانتے ہو' اسمبلیاں ٹوٹ گئی ۔ نگراں حکومت چارج سنبھال چکی ہے اور ایک ہفتے بعد الیکشن منعقد کیے جا رہے ہیں۔ اب پر کوئی دباؤ نہیں رہا' تم آزادانہ میڈم بانو کے کیس پر کام جاری رکھ سکتے ہو۔ میں نے کہا تھا ناں' ت بدلنے والی ہے۔ صبح طلوع ہونے والی ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ آنے والی حکومت ملکی استحکام ضامن ثابت ہو۔" ڈائریکٹر صاحب کی طرف سے کیس پر کام جاری رکھنے کی خبر نے ہارون دل میں سرشاری کی لہر دوڑا دی۔

"جی سر' یہ واقعی ایک اچھی خبر ہے۔ میں بہت جلد کیس مکمل کر لوں گا۔" فون رکھنے کے بعد ں نے دوسرا نمبر ڈائل کیا۔

"ایا اماں' مشعل فیصل آباد سے واپس نہیں آئی؟ آخر آپ سچ کیوں نہیں بتا دیتیں۔ گزشتہ یک ماہ سے مجھے ٹال رہی ہیں۔ پہلے کہتی رہیں' وہ گھر پر ہی ہے مگر مجھ سے ملنا یا فون پر بات نہیں کرنا ہتی۔ میں اُس کی فیکٹری اور ادارے کے بھی چکر لگا چکا ہوں۔ فیکٹری ورکرز کے بیان کے مطابق وہ یک ماہ سے فیکٹری نہیں آئی۔ اب آپ سنا رہی ہیں' وہ پچھلے ہفتے فیصل آباد گئی ہے۔ سچ سچ بتائیں' وہ کہاں گئی ہے۔ دیکھیے آپ کے چھپانے سے اُس کی جان کو خطرہ بھی لاحق ہو سکتا ہے۔"

"بیٹے میں مجبور ہوں۔ اُس نے اپنی جان کی قسم دی تھی۔" آیا اماں کی بھرائی ہوئی شکستہ آواز ہارون کے ہوش اُڑا گئی۔

"کیا مطلب۔ گویا آپ جانتی ہیں' وہ ایک ماہ سے کہاں غائب ہے؟ اور جان بوجھ کر مجھ سے چھپاتی رہیں۔ اوہ مائی گاڈ۔ پلیز جلدی بتائیے۔"

اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتا' دروازے پر بہت تیز دستک ہوئی تھی' یوں جیسے کوئی دیوانہ وار دروازہ پیٹ رہا ہو۔

"ایک منٹ۔ میں ابھی آپ سے بات کرتا ہوں۔" وہ فون رکھ کر بعجلت دروازے کی طرف لپکا۔

دروازہ کھولنے سے پہلے جیب میں ریوالور نکالنا نہیں بھولا تھا۔

رومانہ اپنے ہی زور پر ٹھوکر کھا کر فرش پر آ گری تھی۔ اُس کی سانسیں برابر نہیں ہو رہی تھیں۔

"پپ۔ پہلے دروازہ بند کر دیجئے۔ وہ میرے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔"

"وہ کون۔ کیا نیا ڈراما اسٹیج کیا ہے محترمہ۔" ہارون نے ناگواری سے بھویں اُچکائیں مگر رومانہ اس کے طنز کو پی گئی' بمشکل خود اُٹھی اور دروازے کا بولٹ چڑھا دیا پھر ہینڈ بیگ کھول کر تینوں چیزیں میز پر ڈال دیں۔

"میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ یہ رہی آپ کی امانت۔ مشعل نے بھجوائی ہے اور ایک بات آپ کو بتا دوں' زیادہ تفتیش میں پڑے تو مشعل کو ہمیشہ کے لیے گنوا دیں گے۔ وہ میڈم بانو کے چنگل میں ہے۔ آپ اپنی فورس کے ہمراہ فوراً میڈم کی لال کوٹھی پر حملہ کر دیں' ورنہ وہ نکل بھاگے گی اور...... اور مجھے کہیں چھپا دیں۔" اس کے بعد اُس کی سانس اس بُری طرح پھولی کہ بے سُدھ ہو کر فرش پر آ رہی۔

☆☆☆

صورتِ حال اتنی سنگین تھی کہ ڈائریکٹر صاحب ہارون کے ہمراہ فورس بھیجنے کے بعد خود بھی ان کے پیچھے روانہ ہو گئے تھے۔

میڈم بانو اور ڈپٹی فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے مگر اُن کے کارندے اور کوٹھی میں موجود بے شمار کام کی چیزیں خفیہ کے ہاتھ آ گئی تھیں۔ غالباً عجلت میں میڈم بانو کو تہ خانے کی فائلیں جلانے یا چھپانے کی مہلت نہیں ملی تھی۔ اُنہوں نے یقیناً اپنی پشت پر موجود طاقت ور ہستی کو فون کر کے صورتِ حال بتا دی تھی اور بگ باس نے اپنے خفیہ آدمیوں کے ذریعے انہیں حفاظت سے کہیں چھپا دیا تھا۔ ایئر پورٹ پر خفیہ کے بندے بٹھا دیے گئے تھے۔ شہر کی ناکہ بندی کر دی گئی تھی۔ چھاپہ مار فورس نے شہر کا ایک ایک کونا چھان مارا مگر دونوں کا سراغ نہ مل سکا۔ خدا جانے اُنہیں زمین کھا گئی تھی یا آسمان نگل گیا تھا۔

مشعل بیڈ پر رسی سے بندھی ہوئی بے ہوش پڑی ملی تھی۔ اُس کا سارا جسم خون میں ڈوبا ہوا

تھا۔ جو بدترین تشدد کی کہانی سنا رہا تھا۔ نبض کی بے حد سُست رفتار سے بہر حال یہ تسلی ہو گئی کہ وہ زندہ تھی۔ ہارون نے دیوانگی کے عالم میں اس کا پھولوں سے زیادہ نازک و گداز وجود اپنے بازوؤں میں اُٹھا لیا تھا۔ اُسے فوری طور پر پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز میں لے جایا گیا جہاں ابتدائی طبی امداد کے بعد اسے انتہائی نگہداشت کے شعبے میں منتقل کر دیا گیا۔ اس کے زخموں پر مرہم پٹی کر دی گئی تھی مگر وہ ہوش کی دنیا میں نہیں لوٹی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر ہارون کا دل جیسے جیٹھ کے مہینے کی گرمی میں جھلس گیا تھا۔

وہ کومے میں چلی گئی تھی۔ اسی کیفیت میں ۲۰ دن گزر چکے تھے۔ وہ مشینوں کے سہارے زندہ تھی۔ اس دوران سیاست کے افق پر بہت سی تبدیلیاں رُونما ہو چکی تھیں۔ نئی حکومت منتخب ہو کر ملک کی باگ ڈور سنبھال چکی تھی۔ نئے سرے سے پُرانی فائلیں کھل رہی تھیں۔ احتسابی کمیشن قائم کر دیا گیا تھا۔ میڈم بانو کی کوٹھی سے برآمد ہونے والے کاغذات اور آڈیو ویڈیو کیسٹس نے بہت سے افسران کا کچا چٹھا کھول دیا تھا۔ وزیر' مشیر اپنی اپنی گردن بچانے کی فکر میں دوڑ بھاگ کر رہے تھے۔ حکومت نے میڈم بانو کے کیس میں خصوصی دلچسپی لی تھی۔ ڈائریکٹر صاحب کے اختیارات میں اضافہ کر دیا گیا۔ مجرموں کا سراغ لگانے کے لیے ہر طرح کی کمک کی فراہمی یقینی بنا دی گئی تھی۔ چھاپہ مار ٹیمیں میڈم بانو کے قائم کردہ اڈوں پر چھاپے مار رہی تھیں۔ تقریباً ہر بڑے شہر میں اس کام کے لیے سیکرٹ ایجنسی' آرمی کی انٹیلی جنس اور پولیس کے ذہین ترین افسران پر مشتمل ایک ٹاسک فورس تربیت دی گئی تھی' جس کا کام میڈم بانو کے ٹھکانوں کی بیخ کنی کرنا تھا۔ ہارون کو اس ٹاسک فورس کا ہیڈ بنایا گیا تھا۔ وہ اپنا ہوش بھلائے کام میں مشغول تھا۔ اب چین تب ہی آنا تھا' جب میڈم بانو کی گرفتاری عمل میں آ جاتی۔

میڈم بانو اندرونِ سندھ کے کسی علاقے میں روپوش ہو گئی تھیں۔ ان کی کوشش تھی' کسی طرح سی پورٹ کے ذریعے ملک سے فرار ہو جائیں مگر اس سے پہلے ہی ہارون نے اُنہیں جا لیا مگر اسے افسوس تھا کہ وہ اُسے زندہ گرفتار نہ کر سکا۔ میڈم بانو کے ہمراہ اُن کی تنظیم کے دس آدمی اور بھی تھے۔ وہ ہتھیار ڈالنے پر آمادہ نہیں تھے چنانچہ مقابلہ ہوا' میڈم بانو نے شکست کے آثار دیکھ کر بھاگنا چاہا مگر ہارون کے ریوالور کی دو گولیاں اُنہیں ہمیشہ کے لیے ٹھنڈا کر گئیں۔ ڈپٹی کو زخمی حالت میں گرفتار کر لیا گیا۔

ایف ایٹ اور ایف سکس میں واقع شراب کی شاپس پر ہارون کی ہدایت پر طاہر پہلے ہی چھاپہ مار کے مالکان کو گرفتار کر چکا تھا۔

بالآخر یہ کیس مکمل ہوا۔

میڈم بانو کی لال کوٹھی سیل کر دی گئی۔ رعنا اور ثمن کو ضابطے کی کارروائی کے تحت گرفتار کر لیا گیا۔ دیگر بے گناہ لڑکیوں کو دارالامان بھجوا دیا گیا۔ لاہور' کراچی' فیصل آباد' حیدر آباد' راولپنڈی اور دیگر شہروں میں موجود میڈم بانو کے گُرگے گرفتار کر لیے گئے۔ حیات خواجہ اور عذرا بھی پکڑے گئے۔ وہ افسران اور سابقہ اعلیٰ عہدے دار جن کی وطن دشمنی کے ثبوت مل چکے تھے' انہیں حراست میں لے کر پوچھ گچھ شروع کر دی گئی۔

اخبارات میں خفیہ کے ذہین اور باصلاحیت نوجوان آفیسر ہارون احمد کے کارنامے کے چرچے تھے جس نے ملک کے خلاف کام کرنے والے سازشی عناصر کی نقاب کشائی کی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ ادارۂ اطفال کی سرپرست مشعل کی بہادری کو بھی خراج تحسین پیش کیا گیا تھا جس نے جان پر کھیل کر میڈم بانو کے خلاف ثبوت حاصل کیے۔

☆☆☆

مشعل' میری زندگی۔ میری جان۔ میں آ گیا ہوں۔ آج میں تمہارا سامنا کر سکتا ہوں کیونکہ میں اُن سب سے حساب کتاب کر آیا ہوں جن کو انجام تک پہنچانے کے لیے تم نے اپنے پیارے سے نرم و نازک جسم پر زخم کھائے۔ اتنی جان ماری اور اس بہادری کی توقع تو میں بھی تم سے نہیں کر سکتا تھا۔ میں جو دنیا میں تمہیں سب سے زیادہ جانتا ہوں' چاہتا ہوں' پوجتا ہوں۔

''بس اب میں تمہاری بالکل نہیں سنوں گا۔ اُٹھا کر سیدھا بابا صاحب کے پاس لے جاؤں گا کہ ہمارا نکاح پڑھا دیجئے۔ اب وہ میرے رہنما ہی نہیں میرے ماموں بھی ہیں۔ تمہیں یہی ہچکچاہٹ روکتی ہے ناں کہ میرے بزرگوں کی موجودگی اور رضامندی کے بغیر تم میری نہیں بن سکتیں مگر اب ایسی صورت حال نہیں ہے۔ وہ میرے ماموں ہیں اور تم ان کی سابقہ ''محبوبہ'' کی بیٹی ہو۔ اُن کی انتہائی پسندیدہ شخصیت ہو۔ وہ تم سے کتنا پیار کرتے ہیں۔ تمہاری اک ماہ کی پُر اسرار گمشدگی نے اُنہیں کتنا پریشان کیا تھا حالانکہ وہ ادارے سے باہر نہیں جاتے مگر تم سے ملنے تمہاری کوٹھی پر گئے تھے اور اب جبکہ تم ایک ماہ سے اسپتال میں ہو' وہ ہر دوسرے دن یہاں آتے ہیں۔ آیا اماں اور دلشاد نے تو جیسے اسپتال میں مستقل ڈیرہ جما رکھا ہے اور وہ رومانہ جو بظاہر تمہاری کچھ بھی نہیں لگتی تھی' وہ ایک طرف سیکرٹ ایجنسی کے قائم کردہ خصوصی سیل میں حاضریاں بھگتا رہی ہے' اپنے بیانات قلم بند کروا رہی ہے اور دوسری طرف ہر تیسرے چوتھے دن یہاں کا چکر لگا کر تمہاری خیریت دریافت کرتی ہے۔

سردار امداد علی بے ہوشی کی حالت میں تمہاری صورت دیکھ گئے ہیں۔ اُن کی دوسری ٹانگ ی متعدی مرض کا شکار ہو گئی ہے اس لیے وہ دوبارہ لاہور کے اسپتال میں ایڈمٹ ہو گئے ہیں مگر ہاری طرف سے غافل نہیں ہیں اور افراح جس کی جان اور عزت بچانے کے لیے تم مینا گل سے ٹکرا گئی تھیں' وہ اپنی محسنہ کو ایسی حالت میں قریب سے دیکھنے اور دعا کرنے کے لیے دو تین مرتبہ مجھے اسلام آباد فون کر چکی ہے اور میں نے اُس کی اور امی کی کل کی سیٹ بک کروا لی ہے۔ وہ لوگ کل آ جائیں گے۔ امی اپنی سہیلی کی بیٹی کو دیکھنا چاہتی ہیں۔

کتنے سارے لوگ ہیں جو تمہیں چاہتے ہیں اور سب سے بڑھ کر میں۔ تمہارا دیوانہ' تمہارا سودائی۔

ہارون سوچوں میں گم اسپتال کا لمبا کوریڈور طے کر رہا تھا' اس اُمید کے ساتھ کہ جب وہ اُس کے کمرے میں داخل ہو گا تو اُس کی جان جاناں' اس کی روح کی ساتھی' اس کی جانِ تمنا موت سے لڑ کر فتح یاب ہو کر زندگی کی طرف لوٹ آئی ہو گی۔ اُس کے لیے' اُس کی خاطر۔

مگر جب اُس نے اُس کے روم میں قدم رکھا تو وہ سنہری جھیلیں خاموش ہو چکی تھیں۔ اس کی سانسوں کا سفر تمام ہو گیا تھا۔ اس کی روح جسم کے پنجرے سے آزاد ہو کر آسمانوں کو روانہ ہو چکی تھی۔ ایک ماہ تک موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد اسی طرح کومے کی حالت میں اُس نے جان' جان آفریں کے سپرد کر دی تھی۔

آیا اماں' دلشاد اور رومانہ اس کے بستر کے قریب بیٹھی رو رہی تھیں۔ ایک ڈاکٹر مجسمے کی طرح مایوس و دل شکستہ کھڑا مشعل کا چہرہ سفید چادر میں چھپا رہا تھا۔

شاید اُس کی سانسیں میڈم بانو کو انجام تک پہنچانے کے لیے ہی جسم میں اٹکی ہوئی تھیں۔ جونہی اُس کی روح نے وہ سکون بخش اطلاع پائی' اُس کا بدن روح سے خالی ہو گیا۔

''اس کا چہرہ مت چھپاؤ۔'' ہارون نے تڑپ کر آگے بڑھتے ہوئے ڈاکٹر کا ہاتھ جھٹک دیا 'یہ چہرہ چھپانے کے لیے تو نہیں ہے۔ یہ تو مشعل ہے۔ روشنی ہے۔ ہمت و بہادری اور انسانیت کا ہکتا دمکتا رخشندہ ستارہ ہے۔ اس کی طرح جینے کی تو آرزو کی جاتی ہے۔ لاکھوں دنیا میں آتے ہی ور لاکھوں جاتے ہیں مگر اس جیسا کون آیا ہے یہاں اور کون جائے گا ایسے۔'' اُسے خبر ہی نہیں ہوئی۔ اُس کی آنکھیں کب اور کیسے گرم گرم آنسوؤں سے بھر گئی تھیں وہ تو بس اظہار عقیدت کے لیے جھک کر اس کی روشن پیشانی پر بوسہ دے رہا تھا۔ اُس کی آنکھ سے گرتے موتی مشعل کے پُر تمکنت چہرے کو غسل دے رہے تھے۔

وہ اس کے چاندی کی طرح دمکتے ہاتھوں کو بڑے تقدس سے تھام کر اپنی آنکھوں سے لگا رہا تھا۔

کب یاد میں تیرا ساتھ نہیں کب ہاتھ میں تیرا ہاتھ نہیں
صد شکر کہ اپنی راتوں میں اب ہجر کی کوئی رات نہیں
جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی ہے' اس جان کی کوئی بات نہیں ہے

دلشاد کی سسکیاں ہچکیوں میں بدلنے لگی تھیں۔ آیا اماں بے ہوش ہو چکی تھیں۔ ڈاکٹر نے فو
انہیں دوسرے بستر پر لٹا دیا تھا۔ رومانہ دلشاد کو حوصلہ دے رہی تھی اور ہارون دنیا و مافیہا سے بے خ
مشعل کے مردہ ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے بیڈ کی پٹی سے سر ٹکائے خود میں گم بیٹھا تھا۔

☆☆☆

بہت دنوں سے نہیں اپنے درمیاں وہ شخص
اُداس کر کے ہمیں چل دیا کہاں وہ شخص
وہ جس کے نقش قدم سے چراغ جلتے تھے
جلے چراغ تو خود بن گیا دھواں وہ شخص
اس ایک شخص میں تھیں دلربائیاں کیا کیا
ہزار لوگ ملیں گے مگر کہاں وہ شخص
چھپا لیا جسے پت جھڑ کے زرد پتوں نے
ابھی تلک ہے بہاروں پر حکمراں وہ شخص
قتیل کیسے بھلائیں گے اہل درد اُسے
دلوں میں چھوڑ گیا اپنی داستاں وہ شخص

ہارون نے یہ غزل سنگ مرمر کے کتبے پر خوش خط لکھوا کر مشعل کی قبر پر لگوائی تھی۔ قبرستان کے رکھوالے کو خصوصی طور پر ہدایت کر رکھی تھی کہ قبر پر روزانہ پانی کا چھڑکاؤ کرے اور پھول چڑھائے۔ اس کام کے لیے وہ اُسے ماہانہ رقم دیتا تھا۔

مشعل کی وفات کو چار ماہ گزر چکے تھے۔ اُس کے گھر کے باہر ''جائے عافیت'' کی تختی چسپاں ہو گئی تھی۔ رومانہ اس کی انتظامی انچارج تھی۔ میڈم بانو کی تحویل سے برآمد ہونے والی لڑکیاں جو بے گناہ ثابت ہوئی تھیں اور اب رہنے کے لیے کسی ٹھکانے کی تلاش میں تھیں۔ انہیں ہارون نے ''جائے عافیت'' بھجوا دیا تھا۔ ڈپٹی راولپنڈی جیل میں عمر قید کاٹ رہا تھا۔ حیات خواجہ کو سزائے موت سنائی گئی تھی' جبکہ دیگر ساتھیوں کو اُن کے جرائم کے حساب سے سزا ہوئی تھی۔ بابا

صاحب ادارۂ اطفال کا انتظام چلا رہے تھے۔ دلشاد فیکٹری کی جنرل منیجر نسرین کے ساتھ فیکٹری کے کام کی سمجھ بوجھ حاصل کر رہی تھی۔ اس دوران اسما اور حارث کی شادی ہو چکی تھی۔ صفیہ جب بابا صاحب سے ملنے اسلام آباد آئیں اُن کی ایک ہی رٹ ہوتی تھی۔

''مراد بھائی۔ اسے سمجھائیں۔ کیوں اپنی جوانی برباد کر رہا ہے۔ آٹھواں برس شروع ہو چکا ہے۔ اسی ایک نام کی تسبیح کرتے ہوئے۔ اب تو وہ بے چاری زندہ بھی نہیں رہی۔ اب کس آس میں عمر تباہ کر رہا ہے۔'' وہ روہانسی ہو گئیں۔

''تم نہیں سمجھو گی صفیہ۔'' بابا صاحب کا نرم جھرنے کی طرح رواں اور دھیما لہجہ گہرا رمز لیے ہوئے تھا' ''اسے مت اُلجھاؤ۔ وہ کسی اور ہی منزل کا مسافر ہے۔ پہلے مشعل اُس کے جسم اور روح دونوں کی طلب تھی پھر یوں ہوا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جسمانی طلب پیچھے رہ گئی ہے اور روحانی تڑپ بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ وہ اس کی روح کی غذا بن چکی ہے۔ ابھی یہ سفر جاری رہے گا اور پھر وہ مقام آئے گا جہاں روح تمام فطری و جبلی آلائشوں سے پاک ہو کر لامحدود پروازوں کے لیے تیار ہو جائے گی۔ یہیں سے عشق مجازی سے عشق حقیقی کا سفر شروع ہو گا۔ اسے مت چھیڑو۔ وہ جس اسٹیج پر ہے وہاں جسمانی و جذباتی تسکین کے سہاروں کی ضرورت نہیں رہتی۔'' صفیہ نے ہارون کو سختی سے تاکید کی تھی کہ مشعل' مینا گل اور سردار امداد علی کے مابین رشتوں کے مثلث کی خبر خاندان کے کسی فرد کو نہیں ہونی چاہیے۔ گڑے مُردے اُکھاڑنے سے کچھ حاصل نہیں تھا۔ سردار امداد علی نے بھی اپنی زبان بند رکھی تھی۔

صفیہ افراح کے لیے بہت سنجیدہ تھیں۔ دبے لفظوں میں اُس کے سامنے بھی اس خواہش کا اظہار کر چکی تھیں۔ افراح کے دل میں کوئی ہلچل نہیں ہوئی۔ وہ جان چکی تھی' ہارون اس کے لیے نہیں بنا تھا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا' جب ہارون نے مشعل سے فون پر بات کی تھی۔ کتنی سرمستی اور جذب کے عالم میں کہا تھا۔

''میری تو صبح بھی تمہارے نام سے ہوتی ہے اور شام بھی۔ میری ہر ہر ساعت میں تم میرے ساتھ ہوتی ہو۔ میں کام کرنے لگتا ہوں تو اپنی نگاہوں سے حوصلے کے جام پلاتی ہو' تھکنے لگتا ہوں تو تمہاری مرمریں انگلیاں میری پیشانی پر اپنی مسیحائی کا لمس جگاتی ہیں' سونے لگتا ہوں تو چھم سے تصور میں آ جاتی ہو' تم بھلا مجھ سے کس طرح دور ہو سکتی ہو۔ تمہاری یاد' تمہارا تصور' میرے لہو میں' میری دھڑکنوں میں' میری سوچ میں حتیٰ کہ میری سانسوں میں تحلیل ہو چکا ہے۔''

اور ہارون کے لبوں سے پھوٹنے والی چاہت کے اس دھنک رنگ نے اُسے بتلا دیا تھا کہ

ہم محبت میں بھی توحید کے قائل ہیں فراز
ایک ہی شخص کو محبوب بنائے رکھنا

اس نے کہا تھا۔
"مشعل، برسات کے فتنہ گر موسم میں میرا جی چاہتا ہے کہ تم میرے روبرو ہو، عین آنکھوں کے سامنے اور میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر تمہیں تکتا رہوں، تمہارا ایک ایک نقش دل میں اُتارتا رہوں تاکہ جب تم مجھ سے دور ہو تو تمہارے ساحر سراپے کی ایک ایک ادا میرے تصورات کی دنیا کو سجا دے، میرے دل کی تنہائی مٹا دے۔"

سو اب اس کی یادیں، اس کا تصور، اس کا خیال اس کی تنہائیاں مہکا رہا تھا۔ اس نے پوچھا تھا۔
"ایسا کیا۔ ہے تم میں مشعل کہ میں برسوں سے تمہارا اسیر بنا بیٹھا ہوں۔ مجھ میں اس طرح کیوں سما گئی ہو کہ تمہیں دل سے نکالنے کا سوچوں تو رگیں کھنچنے لگتی ہیں، سانسیں ٹوٹنے لگتی ہیں۔ ایسا کیوں ہے مشعل!"

وہ محبت کی راہوں کا ثابت قدم مسافر تھا۔ افراح جیسے لوگوں کی پہنچ سے بہت اونچا اور ناقابل رسائی۔ وہ جان چکی تھی کہ وہ جس محبت کا اسیر ہے، وہ کسی موسم میں کم نہیں ہو گی۔
ستارے، چاند اور سورج ڈوبتے اُبھرتے رہیں گے۔ پرندے، جانور اور انسان طبعی موت مرتے رہیں گے۔ دریا اور ندی نالے اپنا رخ بدلتے رہیں گے۔
درختوں اور شاخوں پہ کھلے پھول پتے سوکھتے پھوٹتے رہیں گے۔ خوشی و غم اور دکھ سکھ کے جذبے مٹتے بڑھتے رہیں گے۔ عمریں اور اوقات بدلتے رہیں گے۔
مگر چاہت کی یہ ضیاء کم نہ ہو گی، محبت کا کھلا ہوا یہ کنول خزاں کی زد میں نہیں آئے گا۔ اس مشعل کو زوال نہیں ہو گا۔ درد کا یہ شجر دل کے میدان سے نہیں اُکھڑے گا۔ یونہی سلامت رہے گا۔
ہارون سے ناامید ہو کر بالآخر صفیہ نے افراح کی ماں سے اُسے اپنے دوسرے بیٹے راشد کے لیے مانگ لیا تھا۔

☆☆☆

"ہیلو جانم، کیا کرتی رہیں، آج سارا دن؟" ہارون رات کو تھکا ہارا ڈیوٹی سے واپس فلیٹ میں آیا تو آتے ہی بیڈروم میں لگی مشعل کی قدِ آدم پورٹریٹ کے آگے کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کے لبوں پر جان دار مسکراہٹ تھی۔ وہ دھیرے دھیرے تصویر پر ہاتھ پھیر رہا تھا گویا اسے مجسم محسوس کر رہا ہو۔
"موڈ کچھ آف سا ہے؟ کیوں بھئی۔ ناراضگی کیسی۔ سمجھ گیا۔ دیر سے آنے پر خفا ہو۔ جان،

سمجھا کرو ناں۔ بس کام ہی ایسا ہے، دیر سویر تو ہو ہی جاتی ہے مگر تمہیں یقین ہونا چاہیے، میں جلد لوٹوں یا بدیر آؤں، آؤں گا تو تمہارے پاس ہی اور کہاں جاؤں گا میں۔" وہ بہت محبت سے اس کی آنکھوں کی سنہری جھیلوں میں جھانک رہا تھا پھر اُس نے لباس تبدیل کیا، جوتے اُتارے۔ اپنے لیے کافی بنائی اور دوبارہ مشعل کے پورٹریٹ کے سامنے آ بیٹھا۔
ہاں جناب، اب کیجئے ہم سے باتیں۔ کتنی ساری باتیں ہیں جو ہر بار اُدھوری رہ جاتی ہیں۔ بھلا کون سی؟ ہوں۔ آسمان کی، ستاروں کی، جگنوؤں کی، موسموں اور خوشبوؤں کی۔ گھنے جنگلوں اور بہتے آبشاروں کی باتیں شرارت سے، تفاخر سے ہنستے مسکراتے بچوں کی۔ پیڑ کے نیچے ستاتے ہوئے بوڑھے کسانوں کی، پہاڑوں پر پگھلتی برف کی ٹھنڈک کی اور...... اور ہوا میں اُڑتے پرندوں کی ڈار کی باتیں۔ اُفوہ کتنی ساری باتیں ہیں جو میں اپنی جانو سے کرنا چاہتا ہوں مگر بار ایسا کیوں ہوتا ہے۔ جب بھی ہم ملتے ہیں۔ باتیں کرنا شروع کرتے ہیں۔ کوئی نہ کوئی ایسا واقعہ پیش آ جاتا ہے، جس کے سبب دل کی بات دل میں رہ جاتی ہے۔ لو دیکھو پھر اُدھوری رہ گئی، باہر دروازے پر تیز دستک ہو رہی ہے۔ خدا جانے اتنی بارش اور آندھی میں کون آ گیا ہے، مصیبت کا مارا۔ اب اُٹھنا ہی پڑے گا۔"
وہ تساہل سے اُٹھ کر ڈھیلے ڈھالے قدموں سے دروازے کی طرف بڑھا تھا۔
اُس نے اُٹھتے ہوئے عادتاً ٹیپ ریکارڈر آن کر دیا جہاں مہدی حسن اس کی پسندیدہ غزل گنگنا رہا تھا۔

دل میں اک لہر سی اٹھی ہے ابھی
کوئی تازہ ہوا چلی ہے ابھی

اس نے اپنی جھونک میں دروازہ کھولا مگر دوسرے ہی لمحے آنے والے کے زوردار ہاتھ نے اُسے اُلٹ کر قالین پر گرنے پہ مجبور کر دیا۔ آنے والے نے اندر داخل ہوتے ہی دروازہ بند کر دیا تھا۔ وہ چھ فٹ کا لمبا تڑنگا، سیاہ رنگت والا شخص تھا جس کے سر اور داڑھی کے بال بے ہنگم طریقے سے بڑھے ہوئے تھے۔ اس کے جسم پر جیل کے قیدیوں والا لباس تھا اور ہاتھ میں اعشاریہ بتیس بور کا ریوالور تھا جو یقیناً پولیس کے کسی بندے سے چھینا گیا تھا۔ وہ سرتاپا بارش میں بھیگا ہوا تھا۔
"تم...... تم تو جیل میں تھے......" ہارون اُس کی صورت پہچانتے ہی حیرت کا بُت بن گیا تھا۔ وہ ڈیبی تھا اور اُس کے ہاتھ میں پکڑے ریوالور کا رخ ہارون کی طرف تھا۔
"خبردار حرکت نہ کرنا۔ میں تمہارے لیے ہی جیل سے فرار ہو کر آیا ہوں۔ ایک قرض چکانا تھا۔" وہ دانت پیستے ہوئے آگے بڑھا اور ہارون کے دل کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ ہارون نے

بروقت غوطہ لگایا تھا۔ گولی اُس کے دائیں بازو سے پار ہو گئی۔ ''میں تمہیں سسکا سسکا کر ماروں گا۔ تم نے میڈم بانو کا خون کیا تھا ناں اور میں اُسی دن سے تڑپ رہا تھا' تم سے بدلہ لینے کے لیے۔''

وہ اپنی جان نثاری اور وفاداری کا ثبوت دینے کے لیے خدا جانے کس طرح جیل سے بھاگ کر یہاں پہنچا تھا۔ شاید اس کی تنظیم کا بھی ہاتھ ہو اس میں۔

ہارون نے صورتِ حال کا جائزہ لیتے ہوئے بہت محتاط انداز میں ہاتھ بڑھا کر اپنی پچھلی پاکٹ سے ریوالور نکالا تھا۔ اس سے پہلے کہ ڈینی دوبارہ وار کرتا' ہارون نے ٹیبل کی آڑ لیتے ہوئے اس پر فائر جھونک دیا۔ گولی ڈینی کی ٹانگ پر لگی تھی۔ وہ لنگڑا کر زمین پر گرا مگر گرتے گرتے بھی فائر کرنا نہیں بھولا تھا۔

''دیکھو' اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر دو۔ جانتے ہو' جیل سے فرار ہونے والے قیدی کو کیا سزا ملتی ہے؟'' وہ اُسے باتوں میں لگا کر اُس پر قابو پانا چاہتا تھا۔ جواب میں ڈینی نے زوردار قہقہہ لگایا۔

''جان کی پروا کسے ہے اب۔ جان تو مجھے تمہاری لینی ہے۔ تمہاری ذات سے میڈم بانو اور تنظیم کو سب سے زیادہ نقصان پہنچا ہے۔ تمہارا وجود ہمارے لیے تباہی کا پیغام ثابت ہوا ہے۔ اب حساب برابر ہونا چاہیے۔''

اُسی لمحے اُس کے ریوالور نے دو شعلے اگلے' چونکہ ہارون براہِ راست نشانے پر تھا اور بے خبری میں دشمن کے سامنے آیا تھا اس لیے بچاؤ کے لیے مناسب حکمتِ عملی نہیں اپنا سکا۔ دونوں گولیاں اُس کے سینے سے کچھ اوپر پیوست ہو گئی تھیں۔ وہ منہ کے بل گرا اُسے گرتے دیکھ کر ڈینی مطمئن ہو کر اٹھ کھڑا ہوا اور قہقہے لگاتا ہوا اس کے ساکت وجود کے قریب آنے لگا۔ اسی لمحے ہارون کے نیم جاں جسم میں حرکت پیدا ہوئی' اس نے بڑی کوشش کے بعد ریوالور والا ہاتھ اوپر اُٹھایا اور اگلے لمحے ڈینی ڈکراتا ہوا فرش پر لڑھک گیا تھا۔ اس کے سینے سے خون کا فوارہ اُبل پڑا تھا۔ کچھ تو بادلوں کی گھن گرج تھی' کچھ بارش اور آندھی کے جھکڑ اتنے تیز تھے کہ اردگرد رہنے والوں کو آواز سنائی نہیں دی تھی۔ یوں بھی رات کا وقت تھا' سب آرام کر رہے تھے۔

ہارون اپنا لہو میں تر بتر جسم گھسیٹتا ہوا کسی طرح ڈینی کے قریب آیا' اس کی نبض چیک کی۔ وہ مر چکا تھا۔ میڈم بانو کا آخری ساتھی بھی اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا۔ ہارون کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اُس نے بمشکل گردن پھیر کر بیڈروم کے کھلے دروازے سے جھلک مارتی مشعل کی تصویر کی طرف دیکھا اور پھر اطمینان سے کلمہ پڑھتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔

فرشتۂ اجل اس کی مشکل آسان کرنے آن پہنچا تھا۔

کمرے میں دو بے جان لاشے پڑے تھے۔ ہوا خاموش ہو چکی تھی' فضا پر سکوت طاری تھا' ٹیپ ریکارڈر سے مہدی حسن کی آواز در و دیوار میں جذب ہو رہی تھی۔

یاد کے بے نشاں جزیروں سے
تیری آواز آ رہی ہے ابھی
شہر کی بے چراغ گلیوں میں
زندگی تجھ کو ڈھونڈتی ہے ابھی
تو شریکِ سخن نہیں ہے تو کیا
ہم سخن تیری خامشی ہے ابھی
تم تو یارو ابھی سے اُٹھ بیٹھے
شہر میں رات جاگتی ہے ابھی

مگر وہ تو روٹھ گیا تھا' دنیا سے' اُسے اب شہر والوں کی جاگتی راتوں سے کیا لینا تھا۔ وہ لمبے سفر پر روانہ ہو چکا تھا۔

☆☆☆

بابا صاحب کی تاکید کے سبب ہارون کو مشعل کی قبر کے دائیں طرف اُس کے قریب ہی دفنایا گیا تھا۔ افراح اس وقت اُن کے ہمراہ فاتحہ خوانی کے لیے قبرستان آئی تھی۔ وہ دونوں قبروں کے عین بیچ میں کھڑی کبھی ایک کی طرف دیکھ رہی تھی تو کبھی دوسری طرف۔

چلو آؤ تم کو دکھائیں ہم جو بچا ہے مقتلِ شہر میں
یہ مزار اہلِ صفا کے ہیں' یہ ہیں اہلِ صدق کی تربتیں

داستان ابھی ختم نہیں ہوئی۔ ایک میڈم بانو مر گئی تو کیا ہوا۔ دشمن اس کی جگہ دو بھیج دیں گے۔ یہ کاروبار' سازشیں' یہ ذہنی و جذباتی تخریب کے دھندے چلتے رہیں گے۔ عیاشی و فحاشی کے اڈے اسی طرح قوم کی بیٹیوں کی عزتوں کے خریدار پیدا کرتے رہیں گے۔ یہ سلسلہ ختم نہیں ہو گا۔ لیکن۔

امید افزا بات یہ ہے کہ ہر دور میں اس قوم میں سے کوئی نہ کوئی ہارون' کوئی نہ کوئی مشعل ان سازشیوں کا پانسہ پلٹنے کے لیے میدان میں اُترتے رہیں گے اور ایک دن آئے گا' جب دشمن کے ناپاک عزائم اور تخریبی سازشوں کا منہ توڑ جواب دینے کے لیے ہر نوجوان ہارون بن جائے گا اور ہر بیٹی مشعل بن کر بلکتی ہوئی انسانیت کو سہارا دے گی۔ یہ قوم خوابیدہ ضرور ہے مگر ابھی ختم نہیں ہوئی۔

بیداری کا سورج بتدریج طلوع ہو رہا ہے' آگہی کی کرنیں پھیل رہی ہیں۔ وطن کے ماتھے پر ایک نئی صبح کی بندیا جھلملا رہی ہے اور اس بندیا سے پھوٹنے والی روشنی نوجوان نسل سے مخاطب ہو کر ا. کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہہ رہی ہے کہ:۔

جب اپنا قافلہ عزم و یقیں سے نکلے گا
پھر آسمان کا سورج زمیں سے نکلے گا
مری زمین مجھے ایڑیاں رگڑنے دے
مجھے یقین ہے کہ چشمہ یہیں سے نکلے گا

♥♥♥